

ماہنامہ
خا

اکتوبر 2020

PAKISTAN POINT

WWW.PAKISTANPOINT.COM

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سلسلہ وار ناول

- 12 امید صبح جمال ام مریم
188 سیر عشق سدرۃ المنتہی

اسلامیات

- حمزہ
نعت
7 منیر نیازی
7 ناصر کاظمی
8 ادارہ
پیادہ نبی کی پیاری باتیں

انسان

- 93 صبا جاوید
211 لیکن تم بولو
211 من موجی
217 عشاء بھٹی

انشاء نامہ

- 11 اک پنچابی نظم ابن انشاء

عاشق

- 108 غدا حسین
148 سہاس گل
قریب جگر میں محبت
مجھے عشق ہے

مکمل ناول

- 223 ام اقصیٰ
32 مستجاب دعا
68 فوریہ مرور
اے دل تو ہی بتا
مجھے اعتبار وفا ہے

انتباہ: ماہنامہ حنا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، اور نہ کسی فی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار قطع کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔



- | | | | |
|----------------|---------------------|-----------------|---------------|
| 229 عین غین | حنّا کی محفل | 227 تحریر محمود | حاصل مطالعہ |
| 237 افراح طارق | حنّا کا دسترخوان | 231 تنہیم طاہر | پیاض |
| 249 فوزیہ شفیق | کس قیامت کے یہ نامے | 233 بلقیس بھٹی | رنگ حنا |
| | | 235 صائمہ محمود | میری ڈائری سے |

سرور طاہر محمود نے نواز پر ہنگ پرپس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکل روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: **ماہنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکل روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37310797, 042-37321690 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com



قارئین کرام! اکتوبر کا شمارہ 2020ء پیش خدمت ہے۔

وقت کی رفتار تیز ہوئی تو تبدیلی کا عمل بھی تیز ہو گیا ہے۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ سوچ، فکر، عمل، رشتے، اقدار ہر چیز تیزی سے بدل رہی ہے، تغیر ہی راز حیات ہے۔ صنعتی زندگی خوف، انتشار اور پریشانی نے سوچ و فکر پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ تیز رفتاری کی اس عمل میں انسان پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی پہچان کم ہو گئی ہے۔ اس کی فطرت میں جو عنصر شامل کیے گئے ہیں ان سے انحراف نے اسے سکون قلب سے محروم کر دیا ہے۔

انسان نے ازل سے ہی اس کائنات کو سنوارنے کے آنے والے زمانوں کو بہتر بنانے کے تیرگی کو روشنی میں بدلنے کے اس محدود زندگی کو لامحدود بنانے کے خواب دیکھے ہیں اور ان کی تعبیر پانے کی کوششوں نے ہی زندگی کو ترقی کی بلندیوں سے ہم کنار کیا ہے۔

عہد حاضر کی برق رفتار زندگی اور ہر لمحہ تیزی سے بدلتی دنیا میں وہ خواب دھندلا گئے ہیں۔ اس ہماہمی میں انسان اپنی فطرت اپنے اصل سے پھڑک کر زندگی کی سچائیوں کی پہچان کھو بیٹھا ہے۔

جو کچھ ہمیں دکھایا جاتا ہے، ظاہر ہوتا ہے ہمیں نظر آتا ہے وہ پورا سچ نہیں ہے۔ حقیقت اس سے دور کہیں پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ حقیقت کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کے لئے اس نظر کی ضرورت ہے جو ہر تعصب سے پاک ہو۔ تہذیبی لسانی اختلافات، مذہب، مسلک ہر تفریق سے بالاتر ہو، غلط اور سچ کی پہچان رکھتی ہو۔ اپنے ذہن کو تمام تعصبات سے نکال کر وسعتوں سے ہم کنار کیجئے۔ ایک اچھا انسان بہت قیمتی ہوتا ہے، خواہ وہ اپنا ہو یا پرایا، وہ جہاں بھی رہے اس کے وجود کی خوشبو اور دگر دلی فضا کو معطر رکھتی ہے۔ اپنی سوچ کے دائرے کو وسیع کر کے معنویت دیں، تب ہی باہمی اعتماد کی فضا ہموار ہو گی اور ہمیں اور ہمارے بعد آنے والوں کے مستقبل کو استحکام مل سکے گا۔

اس شمارے میں:۔۔۔ فوزیہ سرور اور بشری سیال کے مکمل ناول، سہاس گل اور ندا حسین کے ناولٹ، صبا جاوید، عائشہ سکندر، سندس جبین، حنا بشری، عشاء بھٹی اور اُم القصبی کے افسانے، اُم مریم اور سدرۃ المنشی کے سلسلے دار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار طاہر محمود



دل کی دنیا میں ہے روشنی آپ سے
ہم نے پائی نئی زندگی آپ سے

کیوں نہ نازاں ہوں اپنے مقدر پہ ہم
ہم کو ایماں کی دولت ملی آپ سے

کل بھی معمور تھا آپ کے نور سے
ہے منور جہاں آج بھی آپ سے

دشمنوں پر بھی در رحمتوں کا کھلا
راہ و رسم محبت چلی آپ سے

دل کا غنچہ پکلتا ہے صلی علی
اپنے گلشن میں ہے تازگی آپ سے

ختم ہے آپ پریشان پیغمبری
یہ روایت مکمل ہوئی آپ سے

شام شہر ہوں میں شمعیں جلا دیتا ہے تو
یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

آرزو دیتا ہے دل کو موت کی وقت دعا
میری ساری خواہشوں کا یہ صلہ دیتا ہے تو

حد سے بڑھ کر سبز ہو جاتا ہے جب رنگ زمیں
خاک میں اس نقش رنگیں کو ملا دیتا ہے تو

تیز کرتا ہے سفر میں موج غم کو یورشیں
بجھتے جاتے شعلہ دل کو ہوا دیتا ہے تو

دیر تک رکھتا ہے تو ارض و سما کو منتظر
پھر انہی دیرانیوں میں گل کھلا دیتا ہے تو

اے منیر اس بات کے افلاک پر ہونا ترا
اک حقیقت کو فسانہ بنا دیتا ہے تو

ناصر کاظمی

منیر نیازی

ریاستِ نبویؐ کی اسلامی ریاست کی باقیات

ایک قوم سے لڑائی کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم لوگ قیامت کے قریب ایسے لوگوں سے لڑو گے، جن کے جوتے، بالوں کے ہوں گے، ان کے منہ گویا ڈھالیں ہیں چوڑی، ان کے چہرے سرخ ہیں اور آنکھیں چھوٹی ہیں۔“ (صحیح مسلم)

فحطان کے آدمی کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ (قبیلہ فحطان کا) ایک شخص نکلے گا جو لوگوں کو اپنی لکڑی سے ہانکے گا۔“ (صحیح مسلم)

جہاجہ کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ”دن اور رات ختم نہ ہوں گے یہاں تک کہ ایک شخص بادشاہ ہو گا جس کو جہاجا کہیں گے۔“ (صحیح مسلم)

یمن کی ہوا کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔: ”اللہ تعالیٰ ریشم سے زیادہ نرم ہوا یمن سے بھیجے گا جو کسی آدمی کو نہ چھوڑے گی جس میں ذرہ برابر ایمان ہوگا۔“ (صحیح مسلم)

قیامت شریر لوگوں پر قائم ہوگی

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”قیامت بدترین لوگوں پر قائم ہوگی۔“ (صحیح مسلم)

جھوٹے دجال

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔: ”قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ تمیں کے قریب جھوٹے دجال پیدا نہ ہوں گے۔ (دجال کے معنی مکار، فریبی ہیں) اور ہر ایک یہ کہے گا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔“ (صحیح مسلم)

یہودیوں سے جنگ

پہلے حملہ کرتے ہیں اور سب لوگوں میں مسکین، یتیم اور ضعیف کے لئے بہتر ہیں اور ایک پانچویں خصلت ہے جو سب لوگوں سے نہایت عمدہ ہے کہ وہ بادشاہوں کے ظلم کو روکتے ہیں۔“ (صحیح مسلم)

قیامت سے پہلے قتل و خون

سیدنا یسیر بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار کوفہ میں لال آندھی آئی، ایک شخص آیا جس کا تکیہ کلام یہی تھا کہ اے عبداللہ بن مسعود قیامت آئی، یہ سن کر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھ گئے اور پہلے وہ تکیہ لگائے ہوئے تھے، انہوں نے کہا۔

”قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ ترکہ نہ بنے گا اور لوٹ سے خوشی نہ ہوگی“ (کیونکہ جب کوئی وارث ہی نہ رہے گا تو ترکہ کون بانٹنے کا اور جب کوئی لڑائی سے زندہ نہ بچے گا تو لوٹ کی کیا خوشی ہوگی) پھر اپنے ہاتھ سے شام کے ملک کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ”دشمن (نصاری) مسلمانوں سے لڑنے کے لئے جمع ہوں گے اور مسلمان بھی ان سے لڑنے کے لئے جمع ہوں گے۔“

میں نے کہا کہ ”دشمن سے تمہاری مراد نصاریٰ ہیں؟“

انہوں نے کہا کہ ”ہاں اور اس وقت سخت لڑائی شروع ہوگی، مسلمان ایک لشکر کو آگے بھیجیں گے جو مرنے کے لئے آگے بڑھے گا اور بغیر غلبہ کے نہ لوٹے گا۔“

(یعنی اس قصد سے جائے گا کہ لڑ کر مر جائیں گے یا فتح کر کے آئیں گے) پھر دونوں فرقے لڑیں گے یہاں تک کہ رات ہو جائے گی اور دونوں طرف کی فوجیں لوٹ جائیں گی اور کسی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہود سے لڑیں گے پھر مسلمان ان کو قتل کریں گے، یہاں تک کہ یہودی کسی پتھر یا درخت کی آڑ میں چھپے گا تو وہ پتھر یا درخت بولے گا کہ ”اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ میرے پیچھے ایک یہودی ہے، ادھر آؤ اور اس کو قتل کر دے مگر غرقہ کا درخت نہ بولے گا، (وہ ایک کانٹے دار درخت ہے جو بیت المقدس کی طرف بہت زیادہ ہوتا ہے) وہ یہود کا درخت ہے۔“ (صحیح مسلم)

عیسائیوں کی تعداد

موسیٰ بن علی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ مستور دقرشی نے کہا کہ سیدنا عمرو بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ۔

۱ ”قیامت اس وقت قائم ہوگی جب نصاریٰ سب لوگوں سے زیادہ ہوں گے۔“ (یعنی ہندو اور مسلمانوں سے)

سیدنا عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ”دیکھ تو کیا کہتا ہے؟“

مستور نے کہا کہ ”میں تو وہی کہتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا۔“

سیدنا عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ”اگر تو کہتا ہے (تو سچ ہے) کیونکہ نصاریٰ میں چار خصلتیں ہیں، وہ مصیبت کے وقت نہایت حوصلہ والے ہیں اور مصیبت کے بعد سب سے جلدی ہوشیار ہوتے ہیں اور بھاگنے کے بعد سب سے

سوار ہوں گے یا اس دن بہتر سواروں میں سے ہوں گے۔“ (صحیح مسلم)

دجال سے پہلے مسلمانوں کی فتوحات

سیدنا نافع بن عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ لوگ مغرب کی طرف سے آئے جو اون کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک ٹیلے کے پاس ملے وہ لوگ کھڑے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھے تھے۔

میرے دل نے کہا کہ تو چلا جا اور ان لوگوں کے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان میں کھڑا رہ، ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ فریب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مار ڈالیں، پھر میرے دل نے کہا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چپکے سے کچھ باتیں ان سے کرتے ہوں (اور میرا جانا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناگوار گزرے) پھر میں گیا اور ان لوگوں کے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان میں کھڑا ہو گیا، میں نے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چار باتیں یاد کیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے ہاتھ پر گنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:- ”پہلے عرب کے جزیرہ میں (کافروں سے) جہاد کرو گے، اللہ تعالیٰ اس کو فتح کر دے گا پھر فارس سے جہاد کرو گے، اللہ تعالیٰ اس پر بھی فتح کر دے گا، پھر نصاریٰ سے لڑو گے، روم والوں سے اللہ تعالیٰ روم کو بھی فتح کر دے گا، پھر دجال سے لڑو گے اللہ تعالیٰ اس کو بھی فتح کر دے گا۔“ ☆☆☆

کو غلبہ نہ ہوگا اور جو لشکر لڑائی کے لئے بڑھا تھا وہ بالکل فنا ہو جائے گا، (یعنی اس کے سب لوگ قتل ہو جائیں گے)۔

دوسرے دن پھر مسلمان ایک لشکر آگے بڑھائیں گے جو مرنے کے لئے یا غالب ہونے کے لئے جائے گا اور لڑائی رہے گی یہاں تک کہ رات ہو جائے گی پھر دونوں طرف کی فوجیں لوٹ جائیں گی اور کسی کو غلبہ نہ ہوگا اور جو لشکر آگے بڑھا تھا وہ بالکل فنا ہو جائے گا۔

جب چوتھا دن ہوگا تو جتنے مسلمان باقی رہ گئے ہوں گے وہ سب آگے بڑھیں گے اور اس دن اللہ تعالیٰ کافروں کو شکست دے گا اور ایسی لڑائی ہوگی کہ ویسی کوئی نہ دیکھے گا ویسی لڑائی کسی نے نہیں دیکھی ہوگی یہاں تک کہ پرغہ ان کے اوپر یا ان کے بدن پر اڑے گا پھر آگے نہیں بڑھے گا کہ وہ مردہ ہو کر گر جائے گا۔

ایک جدی لوگ جو کنتی میں سوہوں گے ان میں سے ایک شخص بچے گا، (یعنی ننانوے فیصد آدمی مارے جائیں گے اور ایک باقی رہ جائے گا) ایسی حالت میں مال غنیمت کی کون سی خوشی حاصل ہوگی اور کون سا ترکہ بانٹا جائے گا؟ پھر مسلمان اسی حالت میں ہوں گے کہ ایک اور بڑی آفت کی خبر سنیں گے، ایک پکاران کو آئے گی کہ دجال ان کے پیچھے ان کے بال بچوں میں آگیا، یہ سنتے ہی جو کچھ ان کے ہاتھوں میں ہوگا اس کو چھوڑ کر روانہ ہوں گے اور دس سواروں کو جاسوسی کے طور پر روانہ کریں گے۔“ (دجال کی خبر لانے کے لئے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”میں ان سواروں کے اور ان کے باپوں کے نام جانتا ہوں اور ان کے گھوڑوں کے رنگ جانتا ہوں اور وہ اس دن ساری زمین کے بہتر



ابن انشاء

تینوں دیا تے توں ہسنا اے
اسیں تینوں کجھ نہیں دسنا اے

بس اگ اپنی وچ جھلنا اے
اور آپے پکھا جھلنا اے

اسیں یکے آں تو خام کڑے
کجھ ہویا نہیں کی ہونا سی

اک دن دا ہسنا رونا سی
اوہ سناگر چھلاں ایویں سی

اوہ ساریاں گلاں ایویں سی
پر چرچا کرنا تمام کڑے

اسیں کہندے کہندے مر جانا
توں ہسدے ہسدے مر جانا

اسیں اجڑے اجڑے رہ جانا
توں وسدے وسدے مر جانا

ہاں سوچ لیا انجام کڑے
اک گھر وچ دیوا بلدا ای

کی دیکھ سندھیے گھلدا ای
کیوں پورب پچھم جانی ای

کیوں من اپنا بھٹکانی ای
گھر آ جا پے گئی شام کڑے

اسپر سہ ماہی

ام مریم

دسویں قسط کا خلاصہ

آیت کو تاپا کے گھر یہ کھلے دل سے قبول کیا جاتا ہے کسی بھی پریشانی سے بچنے کو تاؤ آیت کے تجدید نکاح کی تجویز پر عمل کرتے ہیں مگر آیت اس اہم موقع پہ اس نکاح کو مشروط کر دیتی ہے، ایصال سے آزر کے نکاح کو، اس شرط کو مان لیا جاتا ہے۔
حمہ اپنی ماں کی تشویش ناک حالت سے پریشان ہے اسے لگتا ہے اس کی ماں بچ نہیں سکے گی، حسین سے رقم مانگنے کا اپنا فیصلہ اسے غلط دکھائی دے رہا ہے۔
اشعر جہاد کے لئے جا چکا ہے، مگر خالہ کو ہر دم بٹنے کی یاد آنسو رلاتی رہتی ہے۔

گیارہویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے





اپنی بوسیدگی فکر کی آلائش سے مفر ہم کو نہیں
اس لئے خوف میں پنہاں ہیں وجوہات ستم
صبر کی اتنی شکایات کہاں تک سنتے
درد کی لہر سے بے زہر رفیقان جہاں
اپنے مردار پہ مٹی ہی نہیں ڈال گئے
اب تو ہم اپنے نقش کی سزا کاٹیں گے
اک جگہ ٹھہرے خیالات بھی پانی کی طرح ہوتے ہیں
ساکت و جاہد و ویران و پشیمان مگر
بے یقینی کے تنفس کی ہی بے ترتیبی
ایک دن شہر کو لے ڈوبے گی
سارے بے نور مقامات اکٹھے ہو کر

اک جگہ ٹھہر گئے ہوں جیسے
ساری بے رنگ تمنا میں علیحدہ ہو کر
جا بجا پھیل گئیں خواب کے ویرانے میں
زندگی مگر اور نظر

بیت گئے مر گئے انجانے میں
سوچ کا ذکر بہت ہے ملتا افسانے میں مگر
ذکر کے ہاتھ بندھے رہتے ہیں

خواب کے ماؤں نہیں ہیں کہ نظر آئے گا چلتا پھرتا
حبِ یقینی میں گھری عقل سے بو آتی ہے

صبر ہر چیز کا حل ہوتا تو کیا اچھا تھا
وہ بہت غصے میں گھر کے اندر داخل ہوئی تھی، راہ میں آئی ہر شے کو طیش کے عالم میں
ٹھوکروں سے اڑاتی ہوئی۔

”بی بی جی آپ..... آپ کہاں چلی گئی تھیں۔“ ملازمہ اسے دیکھ کر بھاگی آئی، آیت نے
غصیل نظروں سے اسے دیکھا۔

”مام کہاں ہیں ملاؤ انہیں۔“

”آپ اندر تشریف لائیں۔“ ملازمہ مودب تھی، آیت کو مزید قہر چڑھا۔

”تمہیں سنا نہیں کیا کہا میں نے تم سے۔“ وہ دھاڑ اٹھی، سیدی تھانے سے ہی ادھر آئی تھی،
حاکر ایس ایچ او کو خود اپنا بیان دیا تھا کہ اسے اغواء نہیں کیا گیا، بلکہ وہ اپنی مرضی سے اپنے شوہر کے
گھر گئی ہے، مگر وہاں ازلی ہیٹ دھری اور لاقانونیت کا راج تھا، فرمایا گیا۔

”ایف آئی آر درج ہوئی ہے بی بی اور کروانے والے بہت با حیثیت لوگ ہیں، اگر آپ
معاملہ رفع دفع کرنا چاہتی ہیں تو ان کو منائیں کہ وہ ایف آئی آر واپس لیں، ملزم اسی صورت میں

باہر آ سکتا ہے۔“

تاؤ جی محسن اور آزر بے بسی سے اس کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔
”میں معیز سے مل کر آتی ہوں۔“

اس نے آزر سے کہا تھا اور لاک اپ کی طرف آگئی، معیز سلاخوں کے پیچھے موجود تھا اور جیسے چند گھنٹوں کے اندر مرجھا گیا تھا، تاؤ نے بتایا تھا اس نے وہ ناشتہ بھی نہیں کیا جو وہ اس کے لئے لے کر آئے تھے۔

”تم..... کیوں آئی ہو یہاں.....؟“ معیز اسے دیکھ کر تلخ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

”میں سمجھ رہی تھی اگر میں خود یہاں آ کر اپنا اسٹیٹ منٹ دوں گی تو آپ لاک اپ سے باہر آ سکتے ہیں مگر.....“ وہ انفر دگی نظر آئی، معیز نے گہرا سانس بھرا۔

”چلو اب سمجھ آگئی کہ ایسا نہیں ہوگا، واپس جاؤ۔“ اس کے انداز سے ظاہر نہیں ہو سکا وہ اس سے کس حد تک ناراض ہے۔

”معیز..... آپ فکر نہیں کریں، میں آپ کو یہاں سے ضرور نکلواؤں گی۔“ سلاخوں کو تھامے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتی وہ کسی اپنائیت سے بولی تھی، معیز بے طرح چونک اٹھا۔
”تم..... یہاں دوبارہ ہرگز نہیں آؤ گی چاہے میں ساری عمر یہاں سے نہ نکلوں پھر بھی نہیں سنا تم نے۔“ وہ ایک دم محکم سے کہہ رہا تھا، آیت اسے مضطرب سی دیکھنے لگی۔
”معیز!“

”شٹ اپ آیت..... تمہیں سمجھ نہیں آتی میں کیا کہہ رہا ہوں، یہ جگہ اس قابل نہیں کہ تم..... بات کو سمجھو آیت پلیر۔“

غصے میں کہتا وہ ایک دم عاجز ہو کر رہ گیا، آیت کی آنکھیں نم ہوتی چلی گئی تھیں۔
”او کے او کے..... آپ نینس نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا، پلیر کچھ کھالیں۔“ اس کے لہجے میں بھیگا بھیگا اصرار تھا، ناجت تھی، معیز اسے دیکھتا رہا پھر اپنے تنے ہوئے احصاب کر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”کیوں کر رہی ہو یہ سب؟“ اور آیت اس سوال پہ بہت ہرٹ نظر آنے لگی، زخمی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”کیا ابھی بھی کسی وضاحت کی ضرورت ہے، کیا لازم ہے بہت کہ اپنا انسانی وقار داؤ پہ لگا کر میں.....“ اس کا گلا اتنا بھرا تھا کہ یکدم چپ ہو گئی، معیز کے لبوں پہ مسکراہٹ اتر آئی۔

”یہاں..... لازم ہے بہت..... کہ تم محبت کا اظہار کرو مجھ سے..... مجھے بتاؤ کہ تم میرے بنا ادھوری تھیں جبھی اتنا بڑا قدم اٹھایا مگر آیت..... یہ جگہ یہ مقام مناسب نہیں، تم واپس جاؤ، اور دعا کرو اگلی ہماری ملاقات بہت اچھی جگہ اور ماحول میں ہو۔“ مسکراہٹ سمینتا ہوا لہجے میں اتر آنے والی تھکاوٹ کو نہیں سمیٹ سکا، آیت غم آنکھیں پوچھتی آہستگی سے سر ہلا گئی۔

”ٹیک کیئر۔“ معیز نے محض سر ہلا دیا تھا، آزر اور محسن کے ساتھ تاؤ ابھی تھانے میں ہی تھے مگر وہ ماما کے پاس چلی آئی تھی، اس کے دل و دماغ میں طوفان اٹھ رہے تھے۔

”بالکل ٹھیک سنا تھا کہ اگر چوہے کو پکڑنا ہو تو پھندہ لگا دو، مگر یہ نہیں اندازہ تھا کہ چوہے کے شکار کے ساتھ صبح گوہر نایاب بھی واپس مل جاتے گا، میری اچھی بیبی مجھے بتائے گی آخر اس عام سے پروفیسر میں اسے کیا نظر آیا کہ ماں کی محبت کو یوں دغا دے کر اس کے ساتھ ہباگ گئی؟“ مام نے آتے ہی تاک کر اس پہ نشانہ لگایا تھا، وہ سسکتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتی چند قدم آگے بڑھ آئی۔

”سنا تو میں نے بھی تھا کہ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کے وار کرتی ہے مگر مام آپ نے تو لفظ ماں کی حرمت کا بھی لحاظ نہ رکھا، اپنی اولاد کو ہی ڈسنے لگیں، جتنے میں آپ نے ترمذی سے ڈیل کی ہے اماؤنٹ بتا دیں، میں ادائیگی کر دوں گی آپ کو مگر اس کے بعد ہمارا پیچھا چھوڑ دیں، بہر حال میں اپنی زندگی آپ کے لالچ کی نذر نہیں کر سکتی۔“ اس کا قہر بھی پہلی بار ان کے سامنے عیاں ہوا تھا، مام ایک بل لوتو شا کڈ رہے تھے۔

”یہ پیسے کی نہیں، اتنا کی جنگ ہے آیت، سن لو تم بھی میں کبھی پار تسلیم نہیں کروں گی۔“ انہوں نے اعلان جنگ کیا تو آیت متاسفانہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

”آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا مام، ضد پہ نہ اتریں، میں نہیں چاہتی کسی عدالت میں جائے اور آپ کی جگہ ہنسائی ہو، مجھے کسی نے نہیں ورغلیا، میں اپنی مرضی سے معیز کے پاس آئی ہوں تو اس کی وجہ آپ کا جبری فیصلہ تھا۔“

”تم کچھ بھی کہو، میں اس ایجنڈے کو ناکوں پننے تو ضرور چرواؤں گی، تم یہ کیس جیت نہیں سکتیں، بچپن کے نکاح کی اہمیت باقی نہیں رہے گی، میرا لائبر اسے چیلنج کرے گا اور.....“

”ہمارا نکاح کل رات ہوا ہے اور دسٹر ڈے ہے، صرف میرا نہیں آزر کا بھی ایشال سے نکاح کرا دیا گیا ہے، مام آزر ایشال سے محبت کرتا ہے، بہتر ہوگا آپ بخوشی اس سچویشن کو قبول کر لیں، ورنہ آپ بیٹی کے ساتھ بیٹھ کو بھی کھو بیٹھیں گی۔“ وہ مصالحانہ انداز میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی، مام تو جیسے اس اعلان پہ بے ہوش ہونے کے قریب جا پہنچیں، پھر جو انہوں نے آیت اور آزر سمیت تاؤ کی فیملی کو کوسا اور مغفلات کے لیے تو آیت کو اپنے کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہونے لگا۔

”میں ایک ایک کر دیکھ لوں گی، اس بڈھے کھوسٹ تمہارے تائے نے مجھ سے میری اولاد کو چھینا ہے، چھوڑوں گی نہیں۔“ وہ ہاتھ میں آئی ہر شے اٹھا اٹھا کر اسے مار رہی تھیں، آیت متاسفانہ انداز میں انہیں دیکھتی، واپسی کو پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

تو نے کس خواب کے تابوت میں ڈالا ہے مجھے
تو نے کس عالم بے حال میں لاپھینکا ہے
ایسے جس میں تو بینائی چلی جاتی ہے
خوف کے زرد اندھیروں کی طرح
دور تک پھیلی ہوئی خاموشی

میری کمزور ارادوں کے بدن چھیلتی ہے
ہم کسی محل مکافات کے ٹھکرائی ہوئی جاں کی طرح

پانپتے کا پتے پڑ مرده پڑے ہیں گویا
اتنی افسردہ فضا میں کوئی کیا بات کرے
لفظ حلقوم میں کانٹوں کی طرح جھپٹے ہیں
اور اگر بولیں تو اتنی زور سے آلتی ہے

آواز پلٹ کر دل پہ
جس طرح تیز ہواؤں کے تھپڑے کسی دریاؤں میں
گردش خون ٹھہرتی نظر آتی ہے پریشانیوں کو
ہم تو خبروں کی تسلی سے بھی نادانف ہیں

ورنہ کچھ دیر بہل ہی جاتے
شانیں شائیں کس احساس سے مترشح ہے
آکھ زخمی ہو تو چھتا ہے اجالا بھی بہت
روح پر بوجھ ہے سانسوں کا تلاطم بھی کہیں
آسمانوں سے اتارا ہے ہمیں

اور یہ کس عیب کے پاتال میں لاپھینکا ہے
نیند کے جال میں لاپھینکا ہے

ساری تیاری مکمل تھی، بس اسے شیر خان کے کمرے کی لائٹ بند ہونے کا انتظار تھا، اپنے
کمرے کی بقی اس نے معمول سے بھی جلدی بجا دی تھی تو وجہ یہی تھی کہ وہ کسی کو شک میں مبتلا نہیں
کرنا چاہتی تھی، خاص کر شیر خان کو، جیسے ہی اس کے کمرے کی لائٹ آف ہوتی اس سے دس منٹ
بعد وہ گھر سے نکلتی، سارے مکمل کامیابی سے پورے ہو گئے تھے، بہت مشکل و طائف پڑھے تھے
میں نے اب یہ آخری اور سب سے کڑا مرحلہ تھا، اگر وہ پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق یہ آخری
عمل قبرستان کے باہر کر لیتی تو پھر حسین شاہ کو اس کا دیوانہ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا، اس کا
دل آنے والے وقت کے تصور کے ساتھ دھڑکے جاتا تھا، تب جب حسین اس کے ہو جاتا، اس کی
محبت نہیں بلکہ عشق میں گرفتار سب کچھ بھلا بیٹھتا، وہ وقت کیا حسین ہو سکتا تھا سوچ کر اس کے جسم
میں شرارے سے پھوٹنے لگتے، حسین شاہ کو حاصل کرنے کی خاطر وہ ننگے پیر کانٹوں پہ چل سکتی تھی،
یہ تو پھر محض ایک رات باہر گزارنے والی بات تھی، پیر صاحب نے تسلی دی تھی کہ وہ اس عمل کے
دوران اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گے، اس کی حفاظت کی خاطر خود اس کے ہمراہ رہیں گے، ہوس کا
سب سے پہلا شکار عقل ہوتی ہے، عقل رخصت ہو جائے تو درست و غلط کی تمیز بھی ختم، شیطان کا
پہلا حملہ ہی حیا پہ ہوتا ہے، حدیث کا مفہوم ہے۔

”جب تم حیوانہ کرو تو جو چاہے کرو۔“ وہ بھی اندھی خواہش کے ہاتھوں شیطان کی غلام بنی جو
چاہے کرنے کو تیار بیٹھی تھی، بالآخر سوا گیا رہ بجے شیر خان کے کمرے کی لائٹ، بند ہو گئی کہ معمول

کے مطابق اس نے پورے گھر کا چکر لگایا تھا، کھڑکیاں دروازے چیک کیے آیا کنڈیاں صبح لگی ہیں پورج کی لائٹ بند کی اور چابیاں بھلاتا کمر میں چلا گیا، چند سیکنڈز بعد اس کے کمرے کی لائٹ بھی بند ہو گئی، وہ مسکرائی چابیوں کے اتنے پڑے کچے سے ایک چابی کم ہو گئی تھی مگر شیر خان کو خبر تک نہ ہو سکی، یہ چابی صندوقین نے دانستہ نکالی تھی، منصوبے کے مطابق اس نے واپس آ کر تالا لگا تو دینا تھا مگر چابی وہیں گیٹ کے پاس پھینک دی تھی، تاکہ شیر خان کو شک نہ پڑ سکے، وہ یہی سمجھے کس طرح چابی رنگ سے نکل کر یہاں گر پڑی ہے، دس منٹ گزر گئے، ہر سو ہو کا عالم تھا، اس نے اپنے اوپر اوڑھی سیاہ گرم چادر کو اچھی طرح لپیٹا اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھالیا، جس میں وظیفے کا طریقہ اور وہ اشیاء تھیں جو اس عمل کے لئے درکار تھیں، محتاط قدم دھرتی وہ بے آواز باہر آئی، اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور یونہی آگے بڑھتی گئی، گیٹ سے کچھ فاصلے پہ اسے تھمنا پڑا، اس کے منصوبے میں پورج کی لائٹ آف کرنا تھا جو شیر خان جاتے ہوئے پھر جلا گیا تھا، اسے شیر خان پہ بہت غصہ آیا، نام تیزی سے بیت رہا تھا، ایک بجے اسے ہر صورت عمل شروع کرنا تھا، اس نے مزید احتیاط کو جھٹک دیا، اور جلتی لائٹ میں ہی گیٹ کی سمت بڑھ گئی مگر اس وقت اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جب اچانک کسی نے پیچھے سے اس کی کمر کو دونوں بازوؤں سے جکڑ کر اسے ایسے کسا کہ وہ ہلنے کے قابل بھی نہ رہی، خوف اس کے دم کو ہونٹوں پہ لا کر روک گیا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ پلٹنا چاہتی تھی مگر پکڑنے والے نے اس کا منہ بھی بند کر دیا تھا اپنی مضبوط ہتھیلی سے۔

”ہلنا نہیں..... ورنہ ام یہیں تمہارا گردن مروڑ دے گا۔“ یہ غراہٹ شیر خان کی تھی، صندوقین کی بری طرح پھڑ پھڑائی، کچھ ذہن بھی ریلیکس ہوا کہ معاملہ زیادہ خراب نہیں ہوا۔

”ماڑا ام کو اتنا غافل سمجھا ہوا ہے کہ ماری موجودگی میں تم گھر میں داخل ہو گا اور ہمیں خبر بھی نہ ہو گا۔“ اسے بے دردی سے گھسیٹا ہوا وہ اپنے ہمراہ واپس اندرونی حصے میں لے جا رہا تھا، غالباً داوی کے کمرے کی طرف، تاکہ اپنے کارنامے کی داد ان سے حاصل کر سکے، یہ خیال ہی روح فرسا تھا، وہ بری طرح سے پھڑ پھڑائی اور پوری قوت صرف کر کے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے ہٹا دیا۔

”شیر خان..... چھوڑو..... ایڈیٹ..... چھوڑو مجھے..... ہاتھ ہٹاؤ۔“ دبی ہوئی آواز میں وہ دانت بھینچ بھینچ کر غرائی، بس نہ چل رہا تھا اس منٹوں پٹھان کا گلہ دباوے جس نے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرنے کو اس کا کام بگاڑ ڈالا تھا، شیر خان کو اس کی آواز سنتے ہی گویا ہزار دوش کا بہت بڑا جھکا لگا، ایسے ہی اسے چھوڑ کر وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”چھوٹائی بی آپ؟“ وہ بدحواس ہو گیا تھا، پھٹی پھٹی آنکھیں لئے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے، راتوں کو بھی کیوں سوتے مرتے نہیں آخر۔“ وہ بری طرح جھٹلائی،

اس پہ چڑھ دوڑی۔

”مگر..... آ..... آپ کہاں جا رہا تھا، وہ بھی اس وقت۔“ شیر خان ہنوز بھونچکا تھا، کسی طرح بھی اپنی حیرت پہ قابو نہیں پاسکا۔

صندوقین نے جواباً اسے قہر بار نظروں سے گھورا۔

”جہاں بھی جاؤں، تم سے مطلب، تم بک بک بند کرو اور جا کے اپنے کمرے میں دفع ہو۔“

وہ مٹھیاں بھینچ رہی تھی، یہ مداخلت اتنا طیش دلارہی تھی کہ شاید واقعی شیرخان کا قتل کر ڈالتی۔
 ”ام کو کیوں مطلب نہیں، ام اس گھر کا محافظ ہوتا، بڑا بیگم صاب کو ہر بات کا جواب دے، ہر نقصان کا ذمہ دار۔“ شیرخان اچھا خاصا برامان کر کہہ رہا تھا۔

”اچھا..... میری جان چھوڑو..... تم جاؤ یہاں سے۔“ وہ سخت چڑ کر کہتی اس کے سامنے باقاعدہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی، شیرخان ہنوز اسے ابھمن آ میر نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔
 ”معاف کرنا چھوٹا بی بی مگر، آج ام کو اک بات بتا دو، کیا تم کسی لڑکے سے پیار کرنا اور رات کو اس سے ملنا چاہتا؟“ وہ بہت جرأت سے پوچھ رہا تھا، سندیلین نے اکتا کر اسے دیکھا پھر گہرا سانس بھرا۔

”کاش..... جس سے میں پیار کرتی ہوں وہ ایسے چھپ کر مجھ سے ملنے کو تیار ہوتا ملتا تو سہی۔“ وہ ایسے بولی گویا رودی ہو، معاً اس نے ایک دم تیور بدل لئے۔

”شیرخان اب تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ، مجھے ہر صورت جانا ہے، یاد رکھتا اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں تمہیں قتل بھی کر ڈالوں گی۔“ اس کی آنکھوں میں واقعی خون اترنے لگا تھا، شیرخان ایک دم ٹھنک گیا۔

”اوہ..... ام سمجھا آپ کہاں جانا چاہتا چھوٹا بی بی، چلو ام خود لے کر جاتا، آؤ۔“ وہ جیسے ایک دم کچھ ٹھان چکا تھا، سندیلین نے بہت چونک کر اسے دیکھا۔

”لیکن جب میں نے تمہیں کہا تھا میرے ساتھ چلو تو تم مانے نہیں تھے۔“ وہ جتلا کر بولی، شیرخان کے چہرے پہ یاس پھیل گئی۔

”ام آپ کو کنویں میں گرنے سے بچانا چاہتا تھا چھوٹا بی بی، مگر خبر نہیں تھی آپ باز نہ آؤ گی اور خود کو ایسے بھی نقصان پہنچا سکتی ہو، آج ام خود چلے گا، یہ بتاؤ اس سے پہلے بھی آپ رات کو بھی ایسے گیا؟“ وہ کسی خیال کے تحت کچھ سہم کر بولا تھا۔

”نہیں..... یہ پہلا عمل ہے جو آخری بھی ہو گا۔“ سندیلین کے انداز میں ہر شاری اتر آئی، شیرخان بھی جیسے مطمئن نظر آیا۔

”ٹھیک ہے آئیں، مگر آپ کسی پہ وہاں یہ ظاہر نہیں کریں گی کہ میں آپ کے ساتھ آیا ہوں، مچھلی جب تک پتھر نہ چاٹ لے واپس نہیں پلٹتی۔“ وہ زیر لب بولا تھا، سندیلین نے آخری بات پہ دھیان نہیں دیا۔

”یہ بات راز رہے گی، تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔“ اس کے ہمراہ آگے بڑھتی وہ یقین دہانی چاہتی تھی۔

”بے فکر ہو جاؤ آپ۔“ شیرخان کا لہجہ پتھر جیسا تھا، وہ کیا ٹھان چکا ہے سندیلین کو کیا خبر تھی۔

☆☆☆

رات جس خواب کے سائے میں سوئے تھے تمہارا تو نہ تھا
 غم کی مہمیز ہمیں خواب کے پندار میں لے جاتی ہوئی کہتی ہے
 تھوڑا سستا ہی لیا جائے تو بہتر ہے مسافر کے لئے

خواب بھی دینے لگے ہم کو فریب
دل میں مضبوط نہ ہوا اپنی شکایات میں تو اوروں کا گلہ کیا کرنا
دور بیٹھا ہوا چاہے کوئی بے چین کرے
آرزو اپنا سفر مانگتی ہے

بے برداری بھی نہیں اچھی کہ سب لوگ ہیں
چھوڑو بے نام و نسب درد کو چھوڑو چھوڑو
ہم تمہیں خواب میں مل آئے تو خوش ہی رہنے
اور یہ نیندیں بھی یوں اپنا اڑاتیں نہ مذاق
سو طرح کے کسی اندوہ سے بچ ہی جاتے
اپنی برباد محبت کو گریبان پہناتے ہی رہیں گے کب تک
اس قدر چاک گریبان اسیری والے
روز دل روزن زنداں میں کر لاتا ہے

روز ہم صورت احوال سے ڈر جاتے ہیں
روز گھبرا کے پلٹ آتے ہیں بستی سے خیال
روز ویرانہ تعاقب میں نکل پڑتا ہے
جاگتے جاگتے آجاتی ہے آنکھوں میں خراش
خون رستا نہیں جم جاتا ہے
اور سلگ اٹھتا ہے مینائی میں بے نور چراغ
دل کی بے زاری کا بے نور چراغ
اور شکستہ کیے رکھتا ہے ملال

رات جس خواب کے سائے تلے سوئے تھے تمہارا تو نہ تھا
رات جس خواب میں ہم پھوٹ کے روئے تھے تمہارا تو نہ تھا
وہ خالی آنکھیں خالی ذہن لئے کب کی ساکت لیٹی ہوئی تھی، دادی دوبار آگئی تھیں اسے
جگانے مگر وہ کبیل سے سر نہیں نکالتی تھی۔

”طبیعت بھی ٹھیک ہے، پھر ایسے لپٹنے کی وجہ؟“ دادی کو اب اس پہ غصہ آنے لگا، جواب اب
بھی نادر تھا، انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا لمبل کھینچ دیا۔

”دونوں مل کر مجھے اچھی طرح پریشان کر لو، ادھر وہ شیر خان منہ ہاتھ سو جائے بیٹھا ہے، اللہ
جانے کس سے مارا ماری کی، کہتا ہے رات کچھ چوروں نے گھر میں گھسنے کی کوشش کی، اچھی خاص
مار کھا بیٹھا بچارا، ادھر تم ہو۔“ وہ کچھ نہیں بولی، بس اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”حسین سے بات کرتی ہوں، ایک پستول خرید کر لا دے، بیگانہ بچہ، خدا خواستہ کچھ ہو جاتا
تو، سر یہ تو خاص چوٹ لگی ہے، دودھ میں ہلدی ملا کر دے آئی ہوں، کہہ رہا تھا ڈاکٹر کو نہ بلوائیں مگر
میں نے کہاں مانی، فون کر دیا ہے، تم تو کچھ بولو۔“ انہیں پھر اپنی کہتے اس پہ تپ چڑھی۔

”آپ شیرخان کو نوکری سے نکال دیں۔“ وہ بولی بھی تو کیا، دادی کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔

”تمہاری اس سے دشمنی ختم نہیں ہوئی ابھی، بچہ ہماری حفاظت میں جان کے درپے ہو گیا۔“ انہوں نے ملامت سے اسے دیکھا تھا، صندلین نے گہرا سانس بھر لیا۔

”میری اس سے کوئی دشمن نہیں ہے دادی، وہ حماقت کی حد تک بے وقوف ہے، کیا ضرورت تھی چوروں سے الجھنے کی، اگر وہ اسے زیادہ نقصان پہنچا دیتے تو آپ سمجھ سکتی ہیں ہم کس مشکل میں پڑ سکتے تھے۔“ اس کا انداز جھلایا ہوا تھا۔

”چلو دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے، ابھی تو تم اٹھ کے ناشتہ بنا لو، تمہارے انتظار میں، میں نے بھی کچھ نہیں کھایا، اور وہ شیرخان بیچارہ بھی سوکھے پیٹ تکلیف سہہ رہا ہے۔“ دادی اسے ٹوکتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں، صندلین نے اضطراب بھرے انداز میں اپنا چہرہ اچھے تھمایا۔

(اگر شیرخان رات میرے ساتھ نہ جاتا، اگر وہ وہاں سے مجھے پیر سے چھڑا کر نہ بھگا تا تو کیا اب میں زندہ ہوتی؟)

اس کے دل میں خوف جاگزیں ہونے لگا، آنکھیں نم ہو گئیں۔
(پتا نہیں میری آنکھیں کیوں نہ کھلیں، پتا نہیں میں اتنی اندھی کیوں ہو گئی تھی)۔ اس کا ملال ختم نہیں ہو رہا تھا۔

(اور یہ سب حسین شاہ تمہاری وجہ سے ہو، تمہیں کھونے کا احساس مجھے پاگل بنا رہا ہے، تم میرے مجرم ہو اور میں بھی تمہیں حاصل کرنے تمہیں اپنے آگے جھکانے کی خواہش سے دستبردار نہیں ہوں گی چاہے مجھے مزید جو کچھ مرضی کیوں نہ بھگتنا اور سہنا پڑے) اس کے اندر پھر سے کوئی زخمی شیرنی غرائے لگی۔

”پہلے شیرخان کا ناشتہ بنا کر اسے دو، ڈاکٹر کے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے، خالی پیٹ انکشن کیسے لگوائے گا بچہ۔“

دادی کی ہدایت اس دیکھتے ہی پھر شروع ہو گئیں، وہ کچھ نہیں بولی، شیرخان کے لئے ناشتہ بنا کر ٹرے میں لگا دیا، ابلے ہوئے انڈے، دودھ پتی کا بڑا لگ پراٹھا اور رات کا سالن۔
”یہ تمہارا ناشتہ۔“ دروازہ اس نے کاندھے سے دھکیل کر کھولا تھا، ہلکی سی چڑچاہٹ کی آواز ابھری مگر شیرخان اس طرح لحاف میں دبکا رہا تو اسے مخاطب کرنا پڑا تھا، ٹرے میز پر رکھ کر اس نے پھر پکارا کہ وہ تو ابھی بھی نہیں ہلاتھا۔

”شیرخان!“ پکارنے کے ساتھ اس نے لحاف بھی کھینچا، سب سے پہلے اس کا چہرہ ہی نگا سامنے تھا، ماتھے پر گوڑا آنکھ بھی سوجھی ہوئی تھی، صندلین اس سے بے ساختہ نظر چرا گئی۔
”ڈاکٹر کے آنے سے پہلے کچھ ضرور کھا لو یہ دادی کا حکم ہے۔“ وہ ناراضگی سے بولی، شیرخان کراہتا ہوا اٹھا تو اسے اور غصہ آ گیا۔

”وہ بڑھا کھوسٹ جعلی پیر تم سے زیادہ طاقت ور نکلا، اتنے زخم دے ڈالے تمہیں۔“ انداز ملامتی تھا، شیرخان نے نظر اٹھا کر پہلی بار اسے دیکھا۔

”اگر ایسا ہوتا تو آپ یہاں نہ کھڑا ہوتی بی بی صاب۔“ اس کا انداز نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ جتلا گیا، سندیلین تلملا کر رہ گئی۔

”میں اس ڈھونگی پیر کو پولیس کے حوالے کروں گی، اتنا مال کھا گیا میرا۔“

”آپ کا اصل مال آپ کا عزت بنے بی بی صاب جو محفوظ رہا، شکر منائیں۔“

”میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔“ وہ بھڑک کر بولی تو شیر خان نے چونک کر اسے دیکھا تھا، پھر

تنبیہ کے انداز میں بولا۔

”آپ ان چکروں سے نکل آؤ بی بی صاب، ام چاہتا تو رات بھی آپ کو نہ جانے دیتا وہاں

بڑا بیگم صاب کو انوالو کر کے، مگر ام نے آپ کا آنکھیں کھولنے کے لئے یہ کیا، آپ اب باز نہ آیا

تو ام مجبوراً بڑا بیگم صاب کو بتائے گا۔“ بہت سکون سے ناشتہ کرتا ہوا وہ کہے اسے ڈرا رہا تھا،

سندیلین کو آگ ہی لگ گئی۔

”تم دھمکا رہے ہو مجھے؟“ آنکھیں نکال کر وہ کیسی تلفی سے پوچھ رہی تھی، شیر خان نے بغیر کسی

خاص تاثر کے سرنفی میں ہلایا۔

”نہیں ام تو آپ کو نصیحت کر رہا ہے۔“

”اوہ، بڑا آیا نصیحت کرنے والا، اپنے پاس رکھو سب نصیحتیں، مجھے ضرورت نہیں، اپنی بیوی

کو کرتا یہ سب۔“ وہ بک بک کرتی باہر نکل گئی، شیر خان کی آنکھوں میں تشویش لہرانے لگی تھی، اس کا

خیال تھا وہ باز آ جائے گی، مگر اس پر تو لگتا تھا کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا، وہ بہت سنجیدگی سے دادی کو

اس سلسلے میں آگاہ کرنے کے متعلق سوچنے لگا۔

☆☆☆

عشق کے ساتھ جدائی بھی لگی رہتی ہے

چاند کے ساتھ سمندر بھی سفر کرتا ہے

ہم تجھے چاہنے لگے تو محبت کے سمندر بھی بہت دور تلک

ساتھ چلے

کائناتوں کا تعلق ہے بہت آپس میں

خواہشیں خاک پر کرتی ہیں اثر

اور دعا میں بھی بہت دستکیں دیتی ہیں

ہواؤں کی طرح

ہم ہواؤں میں تجھے چھوتے ہیں

ہم فضاؤں میں تجھے چومتے ہیں

ہم خلاؤں میں تجھے دیکھتے ہیں

ہم تو خود اپنے بھی اندر تجھے کرتے ہیں بہت ہی محسوس

جب سے ہم دکھ کی ریاضت کے خطا دار ہوتے

یہ ریاضت بھی تو دیتی ہے جواب

ایک خلقت کہ ہمیں ڈھونڈتی ہے
اک اداسی کہ ہمیں پوجتی ہے
اور کوئی سکھ ہمیں چھوتے ہوئے ڈر جاتا ہے
رات کے ساتھ بیابان بھی چل پڑتے ہیں
دشت میں ہجر کے آسیب نکل پڑتے ہیں
وصل سے وصل کی مانند یہاں

ہجر سے ہجر جزا رہتا ہے
منسلک ہے یہاں ہر شے سے ہر اک دوسری شے
ہم تجھے چاہنے نکلے تو محبت کے سمندر بھی
بہت دور تلک ساتھ چلے

بہت سے مرحلے تھے بہت سی الجھنیں تھیں، اپنا ہر روز محسن اور آزر کے ہمراہ شہر چلے جاتے،
واپسی پہ تینوں کے چہروں پہ تھکن اور مایوسی پٹی ہوئی تھی، تھانے کچہریوں کے پھیرے شریفوں اور
غریبوں کو کہاں پر اس آئے ہیں، سیدھا سادا کیس تھا جسے مال داروں کی کرم نوازی خواہ مخواہ
الجھائے جا رہی تھی، پیسے سے سب بکلتا تھا، ہر شے خریدی جاسکتی تھی، دو تین بار آیت کو بھی کورٹ
جانا پڑا، وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹتی، اس نے وہی بیان دیا جو روز اول تھا جسے میں جا کر دیا تھا،
مام ہر بار بلی کھائیں اسے دیکھ کر اور اسے دھمکی دینا نہ بھولتیں۔
”میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں آیت، تم میری مجرم ہو۔“

”مجرم تو آپ بھی ہیں مام، میرے باپ کی، آپ نے ہم سے ہمارا باپ چھینا ہے، یہ
مکافات عمل ہے کہ آج آپ سے آپ کی اولاد چھین گئی۔“
ایاں گھر میں آیت کریمہ کا ورد کردار ہی تھیں کہ فیصلہ ان کے حق میں آئے اس روز بھی
سماعت تھی اور آیت کی طبیعت صبح سے ہی بہت خراب تھی، بخار کھانسی زکام، وہ چاہنے کے باوجود
تاؤ کے ساتھ کورٹ نہ جاسکی اور بالکل غیر متوقع طور پہ ان لوگوں کی واپسی پہ معیزان کے ساتھ تھا،
کورٹ نے بالآخر اسے باعزت بری کر دیا تھا۔

ہر سو خوشی کی مسرت کی لہر دوڑ گئی، اماں تو اسی وقت سجدے میں گر گئیں، محسن مٹھائی لینے بھاگا،
ایشال خوشی سے چمکتا چہرہ لئے اس کے پاس آگئی تھی۔

”مبارک ہو آپ کو، بھائی رہا ہو کر آگئے ہیں۔“ آیت کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔
”تمہیں بھی مبارک ہو۔“ وہ سرخ تپتے ہوئے چہرے اور چمکتی آنکھیں لئے بولی۔

”آپ نے دو انہیں لی نا، اب دیکھیں بھائی گھر پہنچ کر کتنا خفا ہوں گے ہم پہ کہ ہم نے ان کی
نئی ٹوبلی دلہن کو خیال نہ رکھ کے بیمار کر ڈالا۔“ ایشال کی شوخی بھی لوٹ آئی تھی، آیت بری طرح سے
جھینپ گئی۔

”تھوڑی سی ہمت کریں اور اپنے بال سلجھالیں، منہ ہاتھ دھو کہ ذرا خود کو تھوڑا سا تیار کریں،
میں آپ کا کوئی اچھا سا سوٹ استری کر دیتی ہوں۔“ وہ چمکی بچا کر بولی تو آیت کو ایک دم بہت

سے حجاب نے گھیر لیا، اپنی حیثیت سے آگاہی اسے خود میں سمیٹنے پہ اکسا گئی تھی۔
 ”پلیز ایصال، میں ٹھیک ہوں ایسے ہی۔“ اس کا انداز لجا یا ہوا تھا، ایصال اس کی کیفیت محسوس کرتی ہنسنے لگی۔
 ”یہ تو آپ کی طبیعت صحیح نہیں، ورنہ آج ہم آپ کو دلہن بناتے، ریلی اور پھر آپ یہ گانا گائیں۔“

شکر ونڈا رے مورا پیا مو سے ملن آیا
 شکر ونڈاں رے مورا پیا مو سے ملن آیا
 کھڑ کھڑ ہاسی دور اداسی
 چانن کیتے روح پیاسی
 بیناں پنڈاں اے ہاں
 بنیاں پنڈاں رے مورا پیا مو سے ملن آیا
 ایصال پہ شرارت سوار ہو رہی تھی، آیت بالکل سرخ پڑ گئی۔

”ارے، گانا پسند نہیں آیا تو بدل لیتے ہیں، یہ کیسا رہے گا۔“ وہ پھر لہکنے لگی۔
 ماسی آوے گا میں پھلاں نال دھرتی سجاواں گی
 اوبوں دل والے رنگے پٹک تے بٹھاواں گی
 جھلاں گی پکھاں
 بڑا کچھ کہن گیاں اکھیاں

”آیت مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر سر جھٹک دیا تھا۔
 ”آؤ..... کچھ اچھا سا پکاتے ہیں، کتنے دن ہو گئے، معیز نے اچھا کھانا نہیں کھایا۔“ پاؤں بستر سے لٹکاتے ہوئے وہ کیسے محبت بھرے انداز میں بولی تھی کہ ایصال نے بے اختیار اسے بانہوں میں بھر لیا نہال ہو کر۔

”میری پیاری سی بھابھی..... اماں اسی کام میں مصروف ہیں، فکر ناٹ، آپ اپنی تیاری پہ توجہ دیں، میرے بھائی کی اصل فریشنس کا باعث آپ کا کھلتا ہوا چہرہ ہی ہو گا۔“ وہ اسے گدگدا کر بولی تھی، آیت کے چہرے پہ شرم کی سرخیاں پھیلتی چلی گئی تھیں، ایصال اسے محبت آمیز نظروں سے دیکھتی رہی پھر جیسے ایک دم سوال کر دیا۔

”یہ معجزہ کیسے ہوا آیت بھابھی، آپ کا خمرہ اور پراؤڈ دیکھ کر تو کبھی نہیں لگتا تھا آپ کبھی ایسی محبت بھی کریں گی بھائی سے۔“ اس سوال نے آیت کو سنجیدہ کر دیا تھا۔

”یہ سوال تو میرے اندر بھی اٹھتا ہے ایصال، مجھے سمجھ نہیں آتی، بس ایک دم سے کوئی تغیر اندر اٹھ آیا اور ایسا پیکا کی ڈیٹھ کے بعد ہوا، یا شاید ان کی خواہش نے مجھے سرتا پیدل دیا، اپنی موت سے اک روز قبل پیامیرے پاس آئے تھے اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں معیز کو بھی نہ چھوڑوں۔“
 وہ جیسے کھوئی کھوئی بولی، باپ کی یاد نے اسے پھر سے ممکن کر دیا تھا۔

”مجھ لگتا ہے بھائی آگئے ہیں۔“

باہر سے اٹھتی آوازوں سے چونکتی ایصال تیزی سے دروازے کی سمت لپکی، آیت دانستہ باہر نہیں نکلی، وہ واقعی آگیا تھا اور کتنی دیر تک ملنے والوں کو بھگتا تا رہا، رشتہ دار محلے دار اور کئی دوست وغیرہ، رات کے کھانے پہ وہ سب کے درمیان دوبارہ آیا تب ہی آیت کو کھوجتی اس کی نظریں ناکام لوٹیں تو ایصال جو اس کی کیفیت نوٹ کر رہی تھیں، ہنسنے لگی۔

”کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟“ اس کے انداز میں شرارت تھی، معیز خفیف سا ہو گیا۔

”آیت..... کھانا نہیں کھائے گی؟“

”بھابھی کی دراصل طبیعت ٹھیک نہیں، کمرے میں ہیں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولی، معیز

چوک کر رہ گیا۔

”کیا ہوا ہے؟“

”آپ کے ہجر میں بیمار پڑ گئیں، اور تو کچھ نہیں۔“ اس نے اپنی شرارت کو طول دیا، معیز

جواب میں اسے گھور کر رہ گیا۔

”جاؤ بیٹے، بہن کو بلا کر لاؤ، آج کھانا کھٹھے کھائیں گے سب۔“ ابا کے حکم پہ ایصال جلدی سے اٹھی، واپس لوٹی تو آیت ہمراہ تھی، پنک سوٹ میرون بہت خوب صورت سی شال میں اس کا چہرہ بھی گلابی گلابی سرخ سا ہو رہا تھا، معیز اس سے نگاہ نہ ہٹا سکا، وہ کچھ کنفیوژ لگ رہی تھی۔

”کیسی ہے دھی رانی اب۔“ ابا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

”اچھی ہوں اب تاؤ جی؟“ وہ جتنی سنجیدگی سے بولی حسن کو اسی قدر شرارت سو جھ گئی۔

”اب تو خیر سے اچھی ہوں گی ہی، ساں جو آگئے گھر۔“ آواز اتنی ضرور تھی کہ سب نے سنی، گھبرا کر اس کی نظریں اٹھیں تو معیز سے ٹکرائیں، جو اسے ہی مہتمم نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ اور گڑ بڑا گئی۔

”معیز پتر، میں سوچ رہا ہوں تم کل یا پرسوں ہماری بیٹی کو کہیں سیر کرالاؤ، کیا خیال ہے تمہارا؟“ ابا کھنکارے تھے اور اپنی بات شروع کی، وہ حیران سا رہ گیا۔

”جی..... مگر کہاں.....؟“

”یہ ساتھ والے گاؤں کے جتنے بھی کھیت ہیں ان کی۔“ محسن نے پھر ٹکڑا لگایا۔

”جہاں تمہارا دل کرے، مری کاغان یا پھر جہاں ہماری بیٹی پسند کرے، اس سے پوچھ لینا، بالکل مرجھا گئی ہے میری دھی۔“ ابا نے آیت کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا، محسن کا تو منہ کھلا رہ گیا۔

”اتنی فراغ دلی ابا، ابھی صرف نکاح ہوا ہے شادی تو نہیں۔“ وہ جان کر چھیڑنے کو اختلاف کر رہا تھا، ابا نے اسے گھور کر دیکھا۔

”نکاح ایصال اور آزر کا ہوا ہے، معیز کی شادی ہوئی ہے، اس لئے سیر پہ بھی بس یہ دونوں جائیں گے۔“ انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا تو معیز جو ابا کی اس فیاضی پہ متحیر سا تھا ایک دم آیت کو دیکھنے لگا جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”لیکن ابا بھابھی تو کہہ رہی تھیں جب تک ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی رخصتی نہیں ہوگی۔“

ایشال نے ٹکڑا لگایا۔

”رخصتی تو اسی دن ہو گئی تھی جس دن ہماری بیٹی اس گھر میں اپنی مرضی سے آئی تھی، کیوں بیٹے تمہیں واقعی اعتراض ہے؟ معیز تیس سال کا ہو چکا ہے، ہم تو اس کے بچے کھلانے کے ارمان کب کے دبائے بیٹھے ہیں اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟“ ان کا انداز پیار بھرا تھا، آیت ایک دم اٹھ کر چلی گئی۔

”شرما گئی ہے۔“ ابا ہنسنے لگے۔

”آپ نے اسے کھانا بھی نہیں کھانے دیا۔“ اماں نے ٹوکا۔

”چلیں بھائی کھلا دیں گے، خوشی میں کھایا تو ان سے بھی نہیں گیا ہے، دیکھ رہا ہوں میں، کیوں بھائی؟“ اس کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی، معیز نے بغیر کسی رد و کد کے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”پاکل ایسا ہی ہے، اب بڑے کمرے میں تم یہ پہنچانا۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا تو محسن کو پانی پیتے اچھو لگ گیا۔

”اے، میری بیٹی مجھی کو میاؤں۔“ معیز اس کے سر پہ چپٹ لگا اٹھ کھڑا ہوا۔

”آج اس کا مطلب ہم بھابھی کو باقاعدہ دلہن بنا کر ان کے کمرے میں بھیجیں۔“ ایشال چمک کر بولی تھی، معیز سن کر بھی ان سنی کرتا کمرے سے نکل گیا، اس کا رخ ایشال کے کمرے کی جانب ہی تھا، جانتا تھا وہ وہیں ملے گی، جیسی ہنجر دستک کے اندر داخل ہوا تھا، وہ نہ صرف موجود تھی بلکہ اسے رو برو پا کے اتنا گھبرائی کہ یلغخت اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اتنی جان جو کھم میں ڈال کر آپ ہمارے پاس آئیں مگر استقبال اتنا روکھا پھیکا۔“ اس سے خاصے فاصلے پہ رکتا دواہہ مصنوعی خشکی سے بولا، آیت مزید گڑ بڑا گئی۔

”جی.....؟ میں سمجھی نہیں؟“ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں معصومیت بھی تھی اور الجھن بھی، معیز نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”پیار کیوں پڑیں سچ بتانا۔“ اس کا لہجہ گھبرتر ہو گیا، آیت کی پلکیں حیا بار انداز میں لرز کر جھکیں۔

”آپ جائیں یہاں سے، کوئی دیکھ لے گا۔“ وہ شپٹا رہی تھی، معیز کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔

”کتنی دیر بھاگو گی، آج رات میرے کمرے میں میرے پاس ہی آنا ہے نہیں۔“ اسے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا، آیت ایک دم چونک گئی۔

”کیا تم ایسا نہیں چاہیں؟“ اس کے چہرے پہ اترتی گھبراہٹ کو محسوس کرتا معیز سنجیدہ ہو گیا، آیت نے سر جھکا لیا۔

”نہیں..... ایسا تو کچھ نہیں، بس میں چاہتی تھی، مام ہم سے ناراضگی ختم کر لیں۔“ اس کا لہجہ بوجھل ہونے لگا۔

”کچھ کاموں کو وقت پہ چھوڑ دیتے ہیں آیت، وقت بہترین فیصلہ از خود کر دیا کرتا ہے۔“

نری سے کہتے اس نے اس کا سر تھپکا، وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی اور جب رات کو وہ اسی نکاح کے لباس میں معیز کے روبرو تھی تو معیز اسے خواب ناک نظروں سے کتنی دیر تک یونہی دیکھتا رہا تھا۔

”تم میرا ایسا خواب تمہیں آیت جسے آنکھوں میں سجاتے مجھے ہمیشہ خوف محسوس ہوا، مجھے کبھی یقین نہیں ہو سکا تھا کہ تم مجھے مل بھی سکو گی، محبت یہ جیہی میں نے انا کا بہت بھاری خول چڑھا دیا، شاید اس لئے کہ میں خود کو تمہارے لئے ہارتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔“ وہ کچھ نہیں بولی، البتہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ معیز نے اس کی چوڑیوں کو چھیڑتے ہوئے کہا تھا، وہ مسکرا دی۔

”ضرور۔“

”جواب صرف سچ پہنی ہونا چاہئے۔“ معیز نے شرط عائد کی تو وہ ہنس دی تھی۔

”میں جانتی ہوں آپ کیا پوچھیں گے۔“

”کیا؟“ معیز چونکا۔

”یہی کہ ایسا کیا ہوا کہ میں نے آپ کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا، ہے نا؟“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی، معیز نے بھنوں کو جنبش دی اثبات میں۔

”حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی حسن پرست فطرت سے مجبور ہو کر آپ سے بھاگ نہ سکی، پہلی بار دیکھ کر ہی میں آپ سے متاثر ہو گئی تھی معیز، مگر آپ کی بد اخلاقی اور اپنی ٹیوڈ نے مجھے حیران بھی کر دیا تھا، شاید ایسا نہ ہوتا، مگر مام نے مجھے مجبور کر دیا، ان کا جو میرے لئے انتخاب تھا اس نے فیصلے میں آسانی کر دی، میں مر تو سکتی تھی مگر حنفی جیسے بندے کو کبھی قبول نہیں کرتی۔“ اس جواب پر معیز نے سرد آہ بھری تھی۔

”تو میں خواہ مخواہ خوش فہم ہو رہا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو چکی ہے۔“ اس کا انداز مصنوعی خفگی لئے تھا، آیت نے بن کر اسے دیکھا۔

”جلدی کیا ہے، وہ بھی ہو جائے گی۔“

”تو پھر اس کے لئے ابھی سے کوشش کرنی چاہیے۔“ معیز نے شریر انداز میں کہتے اس کا ہاتھ پکڑا کر لبوں سے چھوا تو آیت ایک دم جھینپ گئی تھی، پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولی۔

”معیز..... میں چاہے آپ سے ساری زندگی تھوڑی سی محبت ہی کیوں نہ کروں مگر آپ سے مجھے بہت ساری توجہ پوری محبت ہمیشہ چاہئے، اس معاملے میں میں اتنی پوزیو ہوں کہ اگر معمولی سی بھی کوتاہی ہوئی تو معافی نہیں ملے گی۔“ انگلی تنبیہ کے انداز میں اٹھا کر وہ ایسے بولی کہ معیز کو ہلکی آگئی۔

”اب شرطیں پوری ہو گئی ہوں تو کچھ پیار بھی کر لیا جائے؟“ وہ اتنی سنجیدگی سے بولا تھا کہ آیت اسے ڈھنگ سے گھور بھی نہ سکی، معیز نے یونہی ہنستے ہوئے اسے تھام کر خود سے لگا لیا تھا۔

☆☆☆

بے قراری کوئی شیوہ تو نہیں ہے کہ بس اب عمر بھر کے لئے اپنا ہی لیا جائے اسے

دل گرفتہ کسی لمحے میں جہنم لینا اگرچہ کوئی معیوب نہیں
پھر بھی بہت مشکل ہے

دل گرفتہ کسی لمحے سے رہائی کبھی ملتی ہی نہیں
ہم نے بارش سے بیاہی ہیں اگرچہ آنکھیں

پھر بھی صحراؤں کی تاثیر جلاتی ہے انہیں
ہم اگرچہ کسی چاک میں الجھے ہوئے لگتے تو نہیں
ہم کسی خاک میں لتھڑے تو نہیں

ہم اگرچہ کسی زرتاری پوشاک میں جکڑے تو نہیں ہیں لیکن
پھر بھی دنیا کے دکھاوے کے لئے اچھا ہے

ایسی درویشی بھی اچھی نہیں ہوتی کہ یہ دنیا ہمیں کم تر سمجھے
خود سے یا اور کسی سے بھی ہمیں کم سمجھے

بے قراری کوئی شیوہ نہیں

جان لیوا ہے

بے قراری کوئی عادت نہیں

مجبوری ہے

تے قراری کوئی بے وجہ نہیں

دل گرفتہ کسی لمحے میں جہنم لینے کی بیماری ہے

سب کچھ لٹ جائے تو دامن خالی رہ جاتا ہے، اس کا بھی خالی رہ گیا، اس نے جس کی خاطر
یہ داؤ کھیلنا تھا اس نے وفا نہیں کی، اس کی ماں چلی گئی، بیماری سے لڑ نہیں سکی ٹھیک سے اور ختم ہو گئی،
حمہ کو کتنی دیر یقین نہیں آ سکا، یقین آیا تو سر پہ آسمان تھا نہ پاؤں کے نیچے زمین۔

وہ تہی دست تہی دامن رہ گئی، ہاں خالی ہاتھوں میں پچھتاوے تھے، اضطراب تھا، سر پہ اس
معاہدے کی لکھی ہوئی تلوار۔

وہ ایک ظہیر رم کیونکر بھر پاتی بھلا، اس کی ایسی مضبوط حیثیت کہاں تھی، ہوتی تو یہ جو اکھیلنے کی
ضرورت کیا تھی، ماں کو گئے تیسرا دن تھا جب اس کے کچھ حواس بحال ہوئے، سب سے پہلا خیال
حسین کا آیا، اپنی اسیری کا آیا اور جیسے حلق میں کانٹے پڑ گئے، خوف نے اس کے وجود میں پینچ
گاڑ دیئے تھے، اسے بھاگ جانا چاہیے، بس اسے بھاگ جانا چاہیے۔

اس کے علاوہ ہر سوچ عبث ہو گئی، ہر خیال کو وہم نے چاٹ لیا، ہر راہ پہ پتھر پڑ گئے، رخت
سفر کیا باندھتی، اس کے پاس بچا ہی گیا تھا، جو رم حسین نے دی تھی شاید اکاؤنٹ میں باقی ہو، اس
نے خود کو سنبھالا اور کھڑی ہو گئی۔

یہ کیا مگر سنبھالنا تھا کہ قدم لڑکھڑاتے تھے، وہ انہی لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آئی، گلی میں
نیم تاریکی تھی، سناٹا پھیل رہا تھا، مغرب ہوئے کچھ دیر گزری تھی، اس ٹائم مائیں یوں بھی بچوں کو
باہر کھیلنے سے منع کرتی ہیں، اسے لگا فرار کو راستہ صاف ہے، سر پہ موجود چادر کو اس نے مزید چہرے

کھینچا، دوسرے کو نے کومنہ اور ہاتھوں پہ اچھی طرح پھیلا یا، دروازہ کھلا تھا، اس نے یونہی بھیڑ دیا، پچھلے تین دنوں سے محلے کی رحم دل خاتون اس کا خیال رکھ رہی تھی، کھانا بھی لاتی مگر حمدہ کھا نہیں پاتی تھی، کمزوری و نقاہت کتنی بڑھ چکی تھی یہ اب اسے محسوس ہوا، آنکھوں آگے بار بار اندھیرا اچھا جاتا تھا، ماں کی بیماری کا یہ ڈیڑھ مہینہ اس نے کیسی خواری اور بے قراری میں بتایا تھا، کھانے پینے کی طرف دھیان نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

اس نے خوف سے پھیلتی آنکھوں سے اطراف میں دیکھا، کوئی اسے یوں فرار ہوتے دیکھ تو نہیں رہا، خاص کر حسین شاہ، جانے کیوں اسے سب سے زیادہ اس کے ہی دیکھے جانے کا خوف مارے ڈال رہا تھا۔

اس کے والٹ میں سات سو تیس روپے بچے تھے، اس وقت کل متاع جسے اس نے مٹھی میں بھیج کر مہینے سے لگا رکھا تھا، وہ کہاں جانا جاتی تھی خبر نہیں تھی، بس حسین کی پہنچ سے دور ہو جانے کی دھن اسے یوں بھاگنے پہ اکسا گئی تھی، کئی کا اختتام ہوا سڑک شروع ہو گئی، اب ٹریفک کا اژدھا م تھا، چمکتے اور بے حد روشن سائن بورڈ اسٹریٹ لائٹس اب اس کی نم آنکھوں کو چندھیا رہی تھیں۔

”جانا ہے بی بی؟“ آٹورکشن والا ایک دم اس کے پاس رکشہ روک کے بولا، وہ اتنی بدحواس تھی کہ اچھل کر یوں پیچھے ہوئی گویا با مشکل گرنے سے بچی ہو، رکشہ والے نے اس گھبراہٹ کے مظاہرے پہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھا تھا، گویا وہ گھر سے بھاگی لڑکی ہو یا پھر کوئی تخریب کار..... شیش.....“ وہ خشک لبوں پہ زبان چھیر کر فقط یہی کہہ سکی مگر الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔

”بیٹھو“ رکشہ ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کی جانب اشارہ کیا، وہ والٹ کو سینے سے چپتی اس سے قبل کہ رکشے کی نشست سنبھالتی اس پہ پل تیز رفتاری سے وہاں آ کر رکنے والی مہنگی قیمتی گاڑی کا دروازہ کھول کر ایک دراز قامت خوش شکل نوجوان غلت میں باہر آیا اور اس کا ہاتھ دیوچ کر بے حد مشتعل انداز میں اسے بے دردی سے گاڑی میں پھینکنے کے انداز میں پٹخ ڈالا، وہ اتنی سراسیمہ ہوئی کہ چیخ بھی نہ سکی، رکشہ ڈرائیور اس کھلم کھلا غنڈہ گردی کے مظاہرے پہ حواس باختہ سا نوجوان کو دیکھتا رہ گیا۔

”کیوں کھڑے ہو، دفع ہو جاؤ۔“ نوجوان چیخا تھا، رکشہ ڈرائیور کا سکتہ ٹوٹا، وہ ہڑبڑا کر رکشہ اشارت کرتا دم دبا کر بھاگا، نوجوان نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد اشارت گاڑی کو کنیر میں ڈالتے سفر بھری نگاہ سیٹ پہ اوندھے منہ مگر مہم جوئی سے ڈالی تھی۔

”اس بدعہدی کی جو سزا تمہیں میں اب دوں گا، اسے تم عمر بھر بھلانے کو ترسو گی۔“ دانت بھیج کر غراتے اس نے گاڑی کی اسپید بڑھا دی، حمدہ کے وجود میں حرکت نہیں ہو سکی، صاف ظاہر تھا اس کے حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے، ہوش میں آنے کے بعد ہی اس پہ کھلتا اس پہ کیا قیامت ٹوٹی ہے۔



موت کی کوکھ سے نکلے ہوئے سنائے میں

درد کی فاختہ کر لاتی ہے
 درد بھی زندہ ہوا کرتا ہے
 اس طرف خوب دھڑکتا ہوا مینہ ہو مگر
 اس طرف خاک ہو بس
 ہاں تو ہمارے انسان کو دیرانہ بنا دیتی ہے
 راہ گزر راکھ سے اٹ جاتی ہے
 درد مر جائے تو انسان بھی مر جاتا ہے
 موت کی کوکھ میں بکھری ہوئی خاموشی بھی جب
 درد میں بولتی ہے
 ایک افسانہ جنم لیتا ہے
 زندگی اور ریاضت کا کوئی افسانہ
 درد کی موت سے دل مرتا ہے
 رکھ کے ہر سانس پہل مرتا ہے
 تانوں بانوں میں الجھنے میں بھی اک جیون ہے
 موت کی کوکھ سے نکلا ہوا سناٹا بھی
 تانوں بانوں کی طرح ہوتا ہے
 موت سے دوری
 کسی درد پہ گرتی ہے تو ڈھادی جاتی ہے
 راکھ کا راکھ پہاڑ
 اور جلاد جاتی ہے سناٹوں کو
 موت برحق ہے مگر موت کا ڈر موت زدہ
 زندگی ایک سفر ہے لیکن
 زندگی یہ سفر موت زدہ
 ریت سے گھر جو بنا لیں تو بھلا کیا ہوگا
 ریت اور ریت کا گھر موت زدہ
 خوف اور خوف کی پرچھائیں کا درموت زدہ
 اور تو اور سبھی قوت پرواز کا پر موت زدہ
 موت اور موت کا ڈر موت زدہ

وہ کوئی محل تھا، محل بھی شیش محل، گھرا تنے بڑے اور اتنے خوب صورت بھی ہو سکتے ہیں اس
 کے تصور میں بھی یہ آنہیں تھا، اسے اس شیش محل میں قید کر دیا گیا تھا جہاں اس جیسی اور جانے کتنی
 لڑکیاں قید تھیں یا شاید آزاد تھیں، نظا ہر تو آزاد لگتی تھیں، چلتی پھرتی تھیں ہنسی بولتی بھی تھیں، شاید ہر
 رنگ و نسل ہر عقیدے سے تعلق رکھنے والی یہ مخلوق، اسے معلوم ہو سکا حسین شاہ کی ملکیت ہے اور

ساری زندگی کے لئے غلام بن چکی ہے تو اس پر پھر سے غشی طاری ہو گئی تھی، وہاں اتنا حسن تھا ایسے ایسے سحر آفریں چہرے تھے کہ نگاہ نہیں ٹھہر پاتی، پھر وہ کیا حیثیت کیا مقام رکھتی تھی کہ اسے بھی نہیں چھوڑا گیا۔

”اسے یہاں رہنے کی سب طور طریقے اور آداب سکھلا دو اور فراموش کروادینا کہ کبھی باہر بھی نکلتا ہے۔“

حسین شاہ نے ایک خوب نازک اندام لڑکی کو مخاطب کیا تھا جو اسے رو برو پا کے تعظیماً یوں جھکی تھی گویا رکوع کی حالت میں چلی گئی ہو۔

”آئیے گورجیں۔“ لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو رو کر آنکھیں سجالینے والی حمد بدک کر دور ہٹ گئی۔

”نہیں، مجھے یہ غلامی ہرگز قبول نہیں ہے۔“ وہ چلائی تھی، حسین شاہ نے جواباً سر د نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”یہاں انکار کا مطلب موت ہے، بہت بھیانک موت۔“ اس کی آواز بھی اس کی نظروں جیسی سرد تھی، حمد بے حس رہی بے خوف رہی۔

”تم مجھے ایک بار ہی موت کے گھاٹ اتار دو، یہ بار بار مرنا مجھے قبول نہیں۔“ مٹھیاں بھینچ کر وہ جس طرح چلائی، اس کے حلق کی رگیں پھول گئیں، پائیں موجود لڑکی جس طرح اس کی طرف بڑھی حسین شاہ کے ہاتھ اٹھائے ٹھہرنے کا اشارہ پا کر ہی تھم سکی تھی ورنہ شاید اس کے نازک ہاتھ کا پھنسر حمد کا گال ادھیڑ ڈالتا۔

”اسے میں خود ڈریٹ کروں گا، اسے تیار کر دو، سارا میل کیچل اٹا کر خوشبوؤں میں بسا کر میری خواب گاہ میں پہنچا دینا، اتھری گھوڑیوں کو لگام ڈالنے اور ان پہ سواری کرنے کا اپنا الگ لطف ہے۔“ وہ مسکرایا تھا اور آؤر کر تاپلٹ کر کمرے سے نکل گیا، حمد کو لگا تھا اس کے وجود سے جان بھی وہ جاتے ہوئے نکال کر لے گیا ہے، اس کی زبان سوکھ کر حلق سے چپک گئی آنکھیں ساکن رہ گئیں، اسے لگا وہ پھر بے ہوش ہو رہی ہے اور واقعی وہ اپنے حواس سلامت نہیں رکھ سکی تھی۔

(جاری ہے)

☆☆☆

الاولى بنتى

فوزية سرور



وجود کا خون چوس رہی تھی، فرح بھی خوش تھی نشا کو اس کی ظالم چچی سے ہمیشہ کے لئے نجات ملن والی تھی۔

دونوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا اور سمیرا بیگم اپنی دو عدد بیٹیوں نمرہ اور شرہ کے ہمراہ دونوں پر زہر میں بھی نظروں کے تیر پھینک رہی تھیں، نشا ہواؤں کے سنگ خور رخصت تھی، کچھ ہی بل حائل تھے حسن اس کو لے جانے والا تھا، اس کی مہندی کی رات ہی اس کی رخصتی ہونی تھی، یہ بھی سمیرا بیگم نے اپنے تئیں نشا اور حسن پر احسان کیا تھا، اس احسان کی قیمت حسن کو سمیرا بیگم کو بھاری چیک دے کر چکانی تھی، کیونکہ سمیرا بیگم نشا کی شادی دھوم دھام سے کرنے کی بجائے اس کو حسن کے گھر بھجوا دینا چاہتی تھیں، تاکہ جو بھی ہنگامے کرنے ہیں حسن اپنے گھر میں کرنے میرے گھر میں نشا کی بارات نہیں آئے گی، لیکن حسن نشا کو

معطر پھولوں کی لڑیوں سے مزین جھولے پر بیٹھی نشا محبت بھری نگاہوں سے اپنے نرم و ملائم گورے ہاتھوں کی ہتھیلی پر مہندی سے لکھے نام کو تنک رہی تھی، مہندی کا رنگ بھی خوب رچا تھا اس کی سرخ و سفید ہتھیلیوں پر، حسن، محبت، بھری زیر لب سرگوشی فضا برد ہوئی، تو نشا خود ہی شرما کر زیریں لب سفید موتیوں تلے چھپا گئی، نشا کے ساتھ جھولے پر اس کی ہم عمر فرح جو اس کی ملازمہ کی بیٹی اور اس کی دوست تھی بیٹھی اس کی سماعتوں میں حسن کا نام لے کر اس کے دل کی دھڑکنوں کو بہاروں بھری تال پر رقص کروا گئی، دونوں اس وقت سمیرا بیگم کی کینہ تو زنگاہوں کی زد میں تھیں، لیکن پرواہ کسے تھی، نشا کی زندگی کا سیاہ باب روشن باب میں ڈھلنے والا تھا، سمیرا بیگم جو نشا کی چچی تھیں لیکن نشا کو وہ ظالم جادو گرئی اور چڑیل لگتی تھی، جو اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کے

مکمل ناول



خود چپک کرتا ہوں۔“ تیمور دل ہی دل میں حسن کے ابھی تک گھر نہ پہنچنے اور موبائل آف ہونے پر پریشان تھا لیکن اپنی پریشانی خالہ کے سامنے ظاہر نہ کی، گھر اس وقت مہمانوں سے بھرا تھا، عشاء کے بعد کا وقت تھا فنکشن کا، چھ تو بج گئے تھے، آدھا گھنٹہ باقی تھا، آدھے گھنٹے میں وہ پہنچ سکتے تھے کیونکہ ان کے گھر سے نشا کے گھر تک کا فاصلہ صرف بیس منٹ کا تھا، سو ساٹھیر الگ الگ تھیں مگر ساتھ ساتھ تو بھی تھیں، اب حسن آتا تو وہ روانہ ہوتے، شمینہ بیگم (حسن کی ماما) اور زرینہ بیگم (تیمور کی ماما) انکھڑے سر جوڑے کھڑی تھیں، کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آدھا گھنٹہ قبل اس گھر پر کوئی قیامت ٹوٹ پڑی ہے، ابھی تیمور لاؤنج میں کھانا کھا رہا تھا کہ شمینہ بیگم کے موبائل کی مٹرنگ گھنٹی بج اٹھی، شمینہ بیگم کے کال پر ایک کرنے پر دوسری طرف سے جو کہا گیا، شمینہ بیگم کا بہرے کی انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ دل پر جا پڑا، ان کی سماعتوں میں دھماکے ہونے لگے۔

وہ وہیں لاؤنج کے چمکتے ماربل فرش پر ڈھسے سی گئیں، تیمور جس کی نگاہ خالہ پر تھی، شمینہ بیگم کو نیچے گرتا دیکھ کر تیر کی طرح ان کی جانب بڑھا زریں بیگم نے بھی سرعت سے آگے بڑھ کر بہن کو تھا تھا، تیمور نے خالہ کا موبائل اپنے کان سے لگا لیا، دوسری طرف سے اب ہاسپٹل کا ایڈریس سمجھایا جا رہا تھا، دل تو تیمور کا بھی بند ہونے کو تھا لیکن اس نے ہمت مجتمع رکھی اگر وہ بھی ہمت ہار جاتا تو، اسے ہمت لازم پکڑنی تھی، فون حسن کو ہاسپٹل پہنچانے والے شخص نے کیا تھا، اسے حسن کا موبائل اس کے قریب سے ہی مل گیا تھا جو سڑک پر گرنے کے باعث آف ہو گیا تھا، حسن کی گاڑی کا بری طرح ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

مہربان شخص نے موبائل اٹھا لیا اور فوری

عزت اسے پہنا کر لے جانا چاہتا تھا، اس نے سمیرا بیگم کو بھاری رقم کا لالچ دیا تو سمیرا بیگم کو ماننا پڑا حسن کا مطالبہ اور آج اس شاندار محل نما گھر کے وسیع و عریض لان میں مہندی کا فنکشن عروج پر تھا، رخصتی بھی آج ہی ہو جانی تھی، نشا خوش تھی بہت خوش، پورا لان روشنیوں میں نہایا ہوا تھا، ڈسبر کی بج بستر رات لیکن مختلف فاصلوں پر نصب مشعل دانوں میں بھڑکتے الاؤ کے سبب ماحول ماں کی گود سا نرم گرم تھا، لان میں ادھر ادھر چلتے پھرتے اکا دکا نفوس کو سردی کا احساس تک نہ تھا، سمیرا بیگم سے جن بیگمات کی ہیلو ہائے تھی صرف وہی مدعو تھیں جو عجیب و غریب ملبوسات میں ملبوس خوش گپیوں میں تو کم لیکن غیر موجود خواتین کی ذات کے نیچے ادھیڑنے میں زیادہ مگن تھیں، نشا کا تعلق اپر کلاس سے تھا لیکن زندگی اس نے لوئر مڈل کلاس سے بھی بدتر گزاری تھی، سمیرا بیگم چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے ملازمین کو ہدایات دینے میں مشغول تھیں، شاندار میزبانی ساڑھی میں ملبوس سمیرا بیگم کے دل میں کیا تھا، چہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔

”اف تیمور پتا کرو، حسن کہاں رہ گیا، آدھے گھنٹے کا کہہ کر گیا تھا، گھنٹے سے اوپر ہونے کو ہے ابھی تک نہیں آیا، کیا ضرورت تھی عین وقت پر جیولر کے پاس جانے کی، پہلے فنکشن آتا، سمیرا کو شرم نہ آئی روایتی سے دو گھنٹے قبل فنکشن کی فرمائش کر ڈالی، سمیرا تو طوفان کھڑا کر دے گی دیر سے پہنچنے پر پہلے ہی اتنی مشکل سے مانی ہے۔“ شمینہ بیگم پر نظر اور جھنجھلاہٹ سے پر لہجے میں اپنے انگوٹے بھانجنے سے مخاطب ہوئیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں خالہ جانی، میں پتا کرتا ہوں، موبائل بھی اس کا آف جا رہا ہے، بہت بار ثرائی کر چکا ہوں، میں جیولر شاپ پر جا کر

چوٹ پہنچی تھی، حسن بے ہوش تھا، باقی جسم پر بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔

حسن کو ہاسپٹل لانے والا آدمی حسن کی مالی حالت کا اندازہ لگاتے برائیوٹ ہاسپٹل میں ہی لایا تھا، حسن کی بے ہوشی اتنی طویل ہوئی تھی کوئی نہ جانتا تھا اور نشا کی زندگی کا باب سیاہ ترین تاریکی میں ڈھلنے والا تھا، وہ اس بات سے انجان خوشی کے پنگھوڑے میں بیٹھی تھی۔

☆☆☆

”کیا مصیبت ہے، سات سے اوپر ٹائم ہو گیا ہے، ابھی تک حسن اور شمینہ کا نام و نشان تک نہیں۔“ سمیرا بیگم جھنجھلا کر بڑبڑائیں، کوفت کا شکار سمیرا بیگم اپنی مدعو کی ہوئی بیگمات کے قریب آکھڑی ہوئی۔

”سمیرا نشا تو بہت لگی ہے، حسن جیسا شاندار خوبصورت لڑکا اس کا نصیب بن گیا، اتنا کامیاب بزنس مین، لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی تم نے نشا کا حسن سے ہونے کیسے دیا، نمروہ اور شرہہ کا کیوں نہ سوچا، تم نے ہیرا گنوا دیا۔“ مسز رخشندہ نے نشا کے نو خیز عمر حسن کو نظر بھر کر دیکھتے ہوئے ریڈی بالوں کو نزاکت سے جھٹکتے ہوئے کہا، سمیرا بیگم نے سلیکٹی نگاہ نشا پر ڈالی جس کا چہرہ اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا۔

”میری بیٹیاں بہت سیدھی سادھی اور معصوم ہیں، ان کو لڑکے چھانسنے کے گلس نہیں آتے، حسن نے جس دن پہلا قدم ہمارے گھر رکھا، اس کے مہینہ بعد شمینہ بیگم کو رشتہ لینے بھیج دیا، اب مجھے کیا پتہ اس لڑکی نے حسن پر کیا جادو چلایا کہ اس نے نکاح کروا کر ہی دم لیا، سجاد کو تو بیٹی کی بہتری کے سوا کچھ سوچتا ہی نہ تھا، اپنی اولاد جائے بھاڑ میں، نکاح کر دیا، اس کے بعد ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں گویا اس فرض کو ادا

حسن کہ ہاسپٹل پہنچایا، ہاسپٹل میں ایمر جنسی میں حسن کو بھیج کر حسن کا موبائل آن کر کے شمینہ بیگم کو اطلاع دی تھی، تیور نے پھر چند پل ہی لگائے تھے اور اپنی ماما اور خالہ کو گاڑی میں لئے ہاسپٹل جانے والے راستے پر گامزن ہو گیا، پیچھے مہمان دل میں دھبی ہوتے اپنے گھروں کو چل دیے، شادی والا گھر چند لمحوں میں ویران ہوا تھا، اب گھر میں قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی، اس خاموش گھر میں ملازمین کے علاوہ صرف ایک ہی وجود لاؤنج میں بیٹھا تھا، جو تینوں کے ہاسپٹل جانے کے بعد دعا گو تھا، وہ وجود دواذیتوں میں مبتلا تھا، وہ حسن کے لئے دعا گو بھی تھا اور دل میں ڈھیروں شکوے بھی تھے، دوسری طرف شمینہ بیگم جن کے بیٹے کی شادی پر سچ دھج ہی زالی تھی، خوبصورت قیمتی ترین ساڑھی میں ملبوس وہ اس وقت ہاسپٹل کے کوریڈور میں تقریباً دوڑ رہی تھیں، انہیں حسن کو دیکھنے کی بے تابی تھی، ان کا حسن، کتنا خوش تھا، اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر کھائی گئی، کیا سمیرا بیگم سمجھتی تھیں، نشا ہی محسوس تھی، نشا کا حسن سے نکاح ہوا تو نشا کے بچا دنیا سے منہ موڑ گئے، اب رخصتی تھی تو حسن خود نہیں میرے حسن کو کچھ نہیں ہوگا، چلتے چلتے انہوں نے شدت سے سرٹنی میں ہلایا تھا، اس وقت نشا کا نہیں صرف اپنے حسن کا خیال تھا جو اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا، تیور، شمینہ بیگم اور زرینہ بیگم کو حسن کو دیکھ کر دھچکا لگا، سفید لباس سرخ دھبے کی ہوئی آگ لگا انہیں جوان کے وجود کو دکھ کی بھٹی میں جھلسا گیا، حسن نے اپنی محبت کی شادی کے دن کون سا جوڑا پہن لیا تھا، شمینہ بیگم اس حالت پر تڑپ اٹھیں، بلکیں اور سسکنے لگیں، تیور نے ان کے کندھے کے گرد بازو جمائل کر کے ان کو دلاسا دیا، حسن کے سر پر شدید

بارت کی آمد نہ ہوئی تو حد درجہ بے زاری لئے وہ سکروں میں چلی گئیں، خواتین بیگمات بھی اکتاہٹ کا شکار ہو کر جا چکی تھیں، سمیرا بیگم کے تیور خطرناک حد تک بگڑ گئے، فرح بھی صورتحال دیکھ کر پریشان ہو اٹھی لیکن نشا اپنی ہی خوش کن سوچوں میں مدہوش تھی، کتنی مشکل زندگی کے بعد اسے حسن کی صورت خوشیوں کا پیام ملا تھا، وہ تو ابھی تک بے یقین تھی کہ غلاموں والی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہے، اپنی باقی زندگی وہ حسین اور محبت کرنے والے ہم سفر کے سنگ گزارے گی، اس پر وہ حسن سے ہونے والی ایک ملاقات میں کھو سی گئی، حالات کیا رخ بدل چکے ہیں اسے مطلق خبر نہ تھی، وہ خوش ملاقات کے گن گنوں کی رتھ پر سوار تھی اس پر۔

”تمہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے نشا کوئی پری کوہ قاف سے بھٹک کر دنیا میں آ گئی ہو۔“ حسن کی مدد پر خوبصورت آواز نے اس کے وجود کا گھیراؤ کیا تو نشا نے سہم کر آس پاس دیکھا، وہ لان میں چائے کے برتن اٹھانے آئی تھی جب حسن کی گاڑی کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی، تب وہ حسن کے نکاح میں نہیں تھی، صرف بات چیتی ہوئی تھی۔

نشا کو لان میں دیکھ کر حسن کی تو مانو دلی مراد بھرا آئی، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا نشا کے سر پر آ پہنچا جو منظر سے غائب ہونے کے لئے پر توں رہی تھی، سمیرا چچی کا خوف ہر جذبے پر حاوی تھا، حسن نے نشا کے فرار کی ساری راہیں مسدود کر دیں، نشا اس کی مسکور کن نگاہوں کی گرفت میں وہیں جم سی گئی، سمیرا حسن نے قدرے جھک کر نشا کی سامعتوں میں فسوں پھونکا تھا، نشا نے سہم کر آس پاس دیکھ لیں سمیرا چچی نمودار نہ ہو جائیں اور اس کی درگت بن جائے۔

کرنے کے لئے زندہ ہے، سجاد کی وفات کے دو مہینے بعد شمینہ اور حسن نے رخصتی کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا، میں نے کوشش تو بہت کی حسن کی توجہ نشا سے ہٹ جائے، نشا سے ایک ملاقات تک نہ کرنے دی نکاح کے بعد، سمیرا موبائل تک رسائی نہ دی نشا کو، لیکن حسن کے دل و دماغ پر تو نشا کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، اب دیکھ لو شادی کا دن آ پہنچا اور میں کچھ بھی نہ کر سکی۔“ سمیرا بیگم نے جاہل عورتوں کی طرح جلد دل کے پھپھو لے پھوڑے، سمیرا بیگم جیسی ذہنیت رکھنے والی اس کی دوست بیگمات نے کافی دکھ کا اظہار کیا، سمیرا بیگم کی ناکامی پر اتنا تو وہ جانتی تھیں، نمرہ اور شمرہ معصومیت کے نام پر دھبہ تھیں، نشا معصومیت اور حسن کا خوبصورت امتزاج تھی، جو دیکھتا گرویدہ ہو جاتا، لیکن سمیرا بیگم کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں، سچ بات کہنے اور سننے کا حوصلہ کسی میں ہوتا ہے جو ان خواتین میں ناپید تھا۔

شمینہ بیگم کا دل غم سے پھٹ رہا تھا، وہ سنبھالے نہ سنبھل رہی تھیں، خبر ہی ایسی دی تھی ڈاکٹر ز نے، وہ بے آب مچھلی کی مانند ترپ رہی تھیں، زرینہ بیگم اور تیور کا بھی یہی حال تھا، حسن اپنے دماغ پر لگنے والی چوٹ کے باعث کوڑے میں جا چکا تھا، اب دعائیں ہی اسے ہوش میں لا سکتی تھیں، شمینہ بیگم کو پہلی بار نشا کا وجود مخموس لگا تھا۔

نوبے تو سمیرا بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، نمرہ شمرہ جو نشا کے جھولے کے قریب بگڑے تیور لئے کھڑی تھیں، سیلو لیس میکسیاں پہنے وہ کھولتی ہوئی نگاہوں سے نشا کا سجا سنورا روپ دیکھتیں جو ان کے دل پر سانپ لوٹ جاتے، ان کا بس نہ چل رہا تھا وہ نشا کے سچے سنورے روپ کو بھڑکتے الاؤ میں جھونک دیں، نوبے بھی جب

حلیے میں رہتی تھی، اس کے سر پر دوپٹہ ہی دیکھا تھا حسن نے، حسن اس کی سادگی، معصومیت اور حسن سے ہی تو متاثر ہوا تھا اور اسے اپنے نام بھی کروا چکا تھا، نمرہ ثمرہ کے سلام کا جواب اس نے ہولے سے سر جھکا کر دیا۔

”اندر لاؤنج میں آؤ نا یہاں کیوں کھڑے ہو۔“ سمیرا بیگم ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے بولیں۔

”مجھے انکل سے کچھ کام تھا انہیں سے ملنے آیا تھا، ان کی طبیعت اب کیسی ہے کیا میں مل سکتا ہوں، ان کا فون بھی آف جا رہا تھا۔“ حسن نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

”تمہارے انکل سو رہے ہیں، ان کی ڈسٹربنس کے خیال سے میں نے ان کا موبائل آف کر دیا تھا، اگر تم کو ضروری کام ہے تو میں جگا دیتی ہوں۔“ سمیرا بیگم کا لہجہ اور انداز منہاس بھرے تھے۔

”نہیں آئی، ان کو آرام کرنے دیں میں پھر آ جاؤں گا۔“ کہتے ہوئے ذومعنی نگاہ نشا پر ڈالی جو یگانہ لان کی سرسبز گھاس پر گاڑھے کھڑے تھی، حسن کو تو دوبارہ ملنے کا موقع چاہیے تھا، وہ تو شادی کا جلد از جلد خواہش مند تھا لیکن سمیرا آئی ٹال منول سے کام لے رہی تھیں۔

”اچھا آئی میں چلتا ہوں۔“ حسن نے اجازت طلب کرتے بھرپور نگاہ نشا پر ڈالی جس نے حسن کے اجازت طلب کرنے پر پل بھر کے لئے نگاہ اٹھائی تھی، حسن کی محبت بھری نگاہ نے نشا کے دل کو جکڑا تھا، دل میں کہیں سکون سا اترتا تھا، اس کا احساس کرنے والا اللہ نے بھیج دیا تھا اس زندان میں۔

”اوکے بیٹا، لیکن اگر زحمت نہ ہو تو نمرہ ثمرہ کو ان کی فرینڈ کے گھر ڈراپ کر دینا، ڈرائیور آج

”اتنی خوفزدہ کیوں رہتی ہو۔“ حسن نشا کے حسین کھڑے پر پھیلے ہر اس کو دیکھ کر چونک گیا، وہ لاعلم تھا اس بات سے کہ نشا کے ساتھ اس گھر میں کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا ہے، سمیرا بیگم سب اچھا دکھاتی تھیں ملنے والوں کو۔

”بس یونہی خوف کا شکار ہو جاتی ہوں، کوئی دیکھ نہ لے۔“ نشا نے سریلی مترنم آواز کا جادو جگایا، حسن مسحور سا ہو گیا، چند پل وہ نشا کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا اور نشا کے دل میں خوش کن بہاروں جیسے احساس کے ساتھ خوف بھی بڑھتا گیا۔

”اگر کوئی دیکھ بھی لے گا تو کیا ہوگا۔“ حسن چند لمحوں بعد کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوا۔

ایک بات کا اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا نشا اس کے قریب آنے پر خوفزدہ ہو جاتی تھی، نہ جانے کیسا ڈرتا تھا جو اس کی معصوم بڑی بڑی ہرئی سی آنکھوں میں تیرتا رہتا تھا، نشا نے جواباً کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ سمیرا بیگم کو لان میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے، نظر چچی کے پیچھے گئی تو نمرہ اور ثمرہ جدید لباس پہنے قریب آتی دکھائی دیں، حسن کی ان کی جانب پشت تھی۔

”ارے حسن تم کب آئے۔“ سمیرا بیگم کی شیریں، شائستہ آواز پر حسن آہ بھر کر رہ گیا، ابھی تو اسے نشا سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔

”ابھی ابھی آیا ہوں آئی۔“ حسن پلٹ کر مودب لہجے میں بولا، نگاہ نمرہ ثمرہ کی جانب اٹھ گئی، دونوں نے ادا سے سلام جھاڑا تھا، نمرہ اور ثمرہ پھولوں کے ڈیزائن سے بھرے کرتا اور ٹراؤزر میں ملبوس تھیں، سلکی بال شانوں پر لہرا رہے تھے، دونوں دوپٹہ گلے میں ڈالنے کی بھی زحمت نہ کرتی تھیں، اس کے برعکس نشا ہمیشہ سادہ

چھٹی پر ہے، میں خود چھوڑنے جا رہی تھی، اب تم ان کو چھوڑ آؤ۔“ سمیرا بیگم کے لہجے کی مٹھاس مزید بڑھی، حسن انکار نہ کر سکا اور اثبات میں سر ہلا دیا، نشا کے قریب سے گزرتے ہوئے زیر لب اللہ حافظ کہا جو نشا کی سماعتوں نے بخوبی سنا، اس کے لب مسکرا اٹھے، نمبر شمار کھولتی نگاہ اس کے مسکراتے چہرے پر ڈالتی حسن کے کچھ چل دیں، سمیرا بیگم نے متغیر سے نشا کے لبوں پر کھلی مسکراہٹ کو دیکھا تھا، جو نبی حسن کی گاڑی گیٹ سے باہر نکلی سمیرا بیگم نے اندر کا زہر زبان کے ذریعے اٹھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو حسن سے تمہارا بیاہ ہونے دوں گی، کچی گولیاں نہیں پھیلے میں نے حسن کو تم سے دور نہ کیا تو میرا نام بدل دینا، لیکن تم میرا نام کیا بدلو گی، تمہاری ایسی اوقات کہاں۔“ سمیرا بیگم نشا کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے دبوچ کر غرائیں، نشا کا دل خوف سے سکڑ سا گیا۔

”دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے، اگر سجاد نہ میری راہ میں حائل ہوتے تو مجھے کب کا گھر سے دھکے دے کر نکال چکی ہوتی، بی بی پاکباز میرا بیٹا تیری وجہ سے گھر سے نکال دیا، سجاد نے، مجھے خوشیاں نصیب ہوں گی یہ تو نے سوچا بھی کیسے۔“ سمیرا بیگم نے کہتے ہوئے نشا کو پیچھے دھکیلا، نشا بری طرح لڑکھڑا کر گری تھی گھاس پر۔

”نشا..... نشا..... کہاں کھوئی ہوئی ہو۔“

فرح کی پریشان آواز نشا کی سماعتوں سے ٹکرانی تو وہ ہڑبوا گئی، حسن سے ملاقات کا خیال سوچتے ہوئے سمیرا چچی کی نفرت بھی یاد آگئی تھی، اس نے آس پاس دیکھا، تو گھبرا کر اپنے قریب کھڑی فرح کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”نشا سمیرا بیگم بہت غصے میں ہیں۔“ فرح

پریشانی سے بولی۔

”کیوں؟“ نشا نے کہتے ہوئے نگاہ دور کھڑی سمیرا بیگم پر ڈالی، جو موبائل فون کان سے لگائے کھڑی تھیں، نشا کے دل کو انہونی کے پریشان کن احساس نے جکڑا تھا، دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا جا رہا تھا، سمیرا بیگم کے چہرے پر بے زاری اور کڑھکی کی دیہڑتہ مزید رنگ جمانے لگی، نشا کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے، نشا کو طوفان کی آمد کی آہٹیں سنائی دینے لگیں، سمیرا بیگم نے موبائل پر چلنے والی کال منقطع کر کے شرار بارنگاہوں سے نشا کو دیکھا اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی نشا کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

”نشا تم تو واقعی منحوس ہو۔“ سمیرا بیگم کی آواز کی ٹھنڈک اور سرد مہری نشا کو ریڑھ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہوئی تھی۔

”تمہارا نکاح ہوا، چچا کی زندگی کا سورج غروب ہو گیا، اب رحمتی ہے تو لگتا ہے حسن کی زندگی کا سورج ڈوبنے کو ہے، نہیں۔“ نشا نے بے اختیار فانی میں سر ہلا کر دل پر مہندی سے سجانرم وناژک ہاتھ رکھا تھا۔

”مجھے لگتا ہے ایسا ہی ہوگا۔“

”تمہیں بہت رورہی تھی، حسن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، وہ آئی سی یو میں انتہائی سیریس کنڈیشن میں پڑا ہے وہ کوئے میں جا چکا ہے، اس کا کیا مطلب ہوا نشا، حسن مر گیا، کہا تھا نا میں نے، خوشیاں تمہارا مقدر کبھی نہیں بنیں گی۔“ سمیرا بیگم کا متکبر لہجہ زہر خند ہوا، اس کے دل میں آگ کے بھانپھڑ جل رہے تھے نشا کو سچا سنورا دکھ کر، اس کی بیٹیاں عمر میں نشا سے بڑی تھیں، نشا ہی کیوں، ان کی بیٹیاں کیوں نہیں، اب تو سینے میں ٹھنڈ پڑی تھی، نشا کا چہرا سمیرا بیگم کے سفاکی بھرے الفاظ

پر لٹھے کی مانند سفید ہوا تھا، دل حسن کی زندگی کے لئے دعا گو ہو گیا، نشا نے تو خوشی کو ابھی پوری طرح محسوس بھی نہ کیا تھا اور وہ چمن بھی گئی تھی، الاؤ سرد کیے جا چکے تھے، سامان سمیٹا جا چکا تھا، سب ملازمین سمیرا بیگم کے حکم پر تیزی سے سب کچھ سمیٹ کر جا چکے تھے، کھلے آسمان تلے ٹھنڈ سے نیلی پڑتی نشا سہمی ہرنی بنی بیٹھی تھی، فرح، سمیرا بیگم اور نشا کے سوالان میں کوئی نہ تھا، خنکی بڑھ گئی تھی، نشا نے پتھرائی ہوئی نگاہوں سے سمیرا اچھی کے سرد روپ کو دیکھا جو ہرگز نیا نہیں تھا، بچپن سے اب تک نشا کو سمیرا اچھی نے ایسی ہی دل دہلا دینے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

”تمہیں مزید اب اس گھر میں برداشت نہیں کروں گی، حسن کی زندگی کا بھروسہ نہیں، خود کو بیوہ ہی سمجھو۔“ سمیرا اچھی کے زہر بھرے لہجے کیلئے الفاظ خنجر کا روپ دھارے نشا کے دل کو بولہبان کر گئے، لیکن وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو بے چینی سے مسلتے دل پر خنجر کے تار بڑ توڑ جملوں سے مڈھال سب کچھ سننے پر مجبور تھی، بولنے کا اذن تھا، بولنے کا اذن تو اسے بھی حاصل نہ تھا اب کیسے حاصل ہوتا۔

”تمہارے چچا نے تمہارا ٹھیکہ لیا تھا اب وہ نہیں رہے تم پر یہ میرا احسان تھا جو تمہاری شادی حسن سے کروا رہی تھی، وگرنہ جس طرح تمہاری وجہ سے سجاد نے میرا بیٹا گھر سے نکالا تھا، سجاد کے دنیا سے منہ موڑتے ہی تمہیں بھی گھر سے نکال باہر کرتی، لیکن اب تو حسن بھی نہیں رہا۔“ سمیرا بیگم کا لہجہ دل چلستا تھا، نشا کا دل ڈوب سا گیا۔

”اب جب حسن سمجھو مر گیا تو تم بھی دفع ہو جاؤ میرے گھر سے، تمہارا اب مزید میرے گھر میں رکنے کا جواز ختم۔“ سمیرا بیگم نے لفظ چبا چبا کر نشا پر گویا لاؤا اگلا تھا، نشا نے خوف اور

اندیشوں کو اپنے دل میں اترتے دیکھا تھا، زبان پر تو صدیوں سے قفل لگے تھے، وگرنہ کہہ ڈالتی، اتنے بڑے گھر کی وہ بھی تو وارث ہے اور حسن ضرور صحت یاب ہوگا، لیکن اس کی زبان پر لگے قفل رنگ آلود ہو چکے تھے، سمیرا بیگم کی فرعونیت نے رنگ بھی اترنے ہی نہ دیا تھا، اب تو وہ فرعون کی پکی سیہلی لگی تھی نشا کو، دوسری طرف سمیرا بیگم کو اس پل بیٹے کا گھر سے نکالنا یاد آیا تو ان کے اندر نشا کے لئے نفرت کا الاؤ پوری شدت سے بھڑکا تھا سمیرا بیگم کے اندر رہی سہی انسانیت بھر بھر جلنے لگی، کیسے جیسی کی خاطر سجاد نے سالوں بعد انگلینڈ سے آئے بیٹے کو چند دن بعد ہی گھر بدر کر دیا تھا۔

”اشو نشا۔“ سمیرا بیگم کے ماتھے پر لا تعداد بل تھے تو لہجہ سرد، نشا نے سانس رکتا محسوس کیا تھا۔

”پلڑے بدل کر واپس بیٹیں آؤ اور ہاں اگر کچھ اپنی قیمتی چیزیں لینی ہوں تو رکھ لینا۔“ کھر درا حکم نشا کی سماعتوں کو چھیل گیا، قدم حکم کے ماتحت ہوئے نشا کے پیچھے چلتی، فرح کو اپنا وجود سمیرا بیگم کی سرد مہری سے برف کی سل میں ڈھلتا محسوس ہوا تھا، نشا کی واپسی چند لمحوں بعد ہوئی، اس کے تن پر گرم ادنی لباس تھا جو نمبرہ کی اترن تھی، گورے پاؤں ادنی جرابوں اور کیونوس شوز میں مقید تھے جو نمبرہ نے عنایت کیے تھے۔

سر پر اور وجود کے گرد گرم نیلی شال تھی جو سمیرا بیگم نے کچھ عرصہ استعمال کے بعد اسے دان کر دی تھی (اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا جس میں اس کی کچھ چیزیں اور میٹرک کا رزلٹ کارڈ اور سندھی)۔

سمیرا بیگم نے سر تا پاؤں نشا کا جائزہ لیا چاند لمحے پہلے ہی سنوری بیٹھی تھی۔

لیکن بیٹے کی خوشی کی خاطر چپ ہو گئی تھیں، اب اگر وہ چاہتیں تو نشا کو اپنے گھر بلوا لیتیں تیمور کو بھیج کر، لیکن ان کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نشا کا خیال نہ تھا ان کو صرف اپنے حسن کی زندگی سے غرض تھی۔

☆☆☆

سمیرا قہر برساتی نکا ہوں سے کچھ پل بیک سینے سے دو بچے نشا کو گھورتی رہی۔

”گاڑی میں بیٹھو۔“ نشا خوش گمانی کی بلند یوں پر اڑنے لگی، چچی حسن کے پاس لے جانے والی ہیں یقیناً اسی لئے اہم سامان لینے کو کہا، مستعد ڈرائیور ڈرائیوے پر گاڑی کے دروازے کھولے بالکل تیار ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا، سمیرا بیگم کا حکم نشا کے قدموں کو بجلی کا ہم سفر بنا گیا، پچھلی سیٹ پر جس برق رفتاری سے وہ بیٹھی تھی سمیرا بیگم کی نگاہوں نے حیرانگی کا مزہ چکھا تھا، اگر نشا جان لیتی سمیرا چچی کے کیا ارادے ہیں وہ تاحیات اپنی ٹانگوں کو مردہ قرار دے دیتی قدم نہ اٹھاتی، سمیرا بیگم نے قرنٹ سیٹ سنبھالی تو گاڑی کھلے گیٹ سے نکل کر کالونی کے مختلف

بلاکس میں تیز رفتاری سے اڑتی مین سڑک پر آگئی نشا حسن کو دیکھنے کے لئے بے قرار تو سمیرا بیگم کا سرد پتھر یلے تاثرات سے اٹا چہرہ، گاڑی تقریباً گھنٹہ نو سفر رہنے کے بعد بالآخر ٹھہر گئی، نشا کو باہر کی دنیا صرف تب دیکھنے کو ملی تھی، جب وہ میٹرک کے پیپرز دینے سنٹر تک گئی تھی، وہ بھی چچا کا احسان تھا جو میٹرک کر لیا ورنہ چچی کا ارادہ ہرگز اس کو اتنی تعلیم دلوانے کا بھی نہ تھا، وہ خوش تھی اب چچی اس زندان سے نکال کر ہمیشہ کے لئے حسن کے پاس چھوڑ دیں گی، کیونکہ ڈاکومنٹس کا بیک نشا نے پہلے ہی ریڈی کر لیا تھا، حسن کے ساتھ رخصتی کے وقت اسے اپنے ساتھ لے کر جانا

”تم ماسیوں والے چلیے میں ہی اچھی لگتی ہونٹا۔“ سمیرا بیگم کی طنزیہ مسکراہٹ دل جلانے والی تھی، نشا نگاہیں جھکائے کسی مجرم کی طرح کھڑی تھی، خوشیاں اس کی فنا ہوئی تھیں معتبہ بھی وہی ٹھہری تھی، سمیرا بیگم کو اب نشا کا وجود ایک پل کے لئے بھی اس گھر میں برداشت نہ تھا، نشا دو کنال پر پھیلے جنگلے کی تنہا مالک تھی، اس کی شادی کر کے نشا کو اسے پر اعتماد ہرگز نہیں بنانا تھا تاکہ کل کو وہ اپنے جنگلے اور بڑس کا مطالبہ کر سکے، حسن سے بھی اس صورت وہ رخصتی پر آمادہ ہوئی تھیں کہ حسن کا نشا کی جائیداد سے کوئی تعلق نہ ہو گا، اپنی طرف سے تو وہ مطمئن تھیں لیکن حسن اور شمیمہ بیگم کے دل میں کیا تھا، وہ نہیں جانتی تھیں، ابھی اسی وقت انہیں نشا کے وجود سے اپنا گھر پاک کرنا تھا، ان کی طرف سے وہ دنیا کے ہر رخ میں دھڑ دھڑ جلے ان کی جانے بھلا، نشا کی بے جان ہوتی ٹانگیں طاقت کے قہر کا شکار تھیں، سمیرا بیگم کے ترکش کے آخری زہریلے تیرنے اس کی رہی سہی ہمت بھی فنا کر ڈالی تھی۔

☆☆☆

شمینہ بیگم رو رو کر نڈھال ہو رہی تھیں، ہسپتال کے صاف ستھرے کاریڈروں میں بیچ پر بیٹھی وہ گریہ زاری کے ساتھ ساتھ بیٹے کے کومے سے باہر آنے کی دعائیں اللہ سے کر رہی تھیں، انہیں ایک پل کے لئے بھی نشا کا خیال نہ آیا تھا جو ان کی بہو تھی، سمیرا بیگم جس نے ہمیشہ دونوں ماں بیٹا کو اپنا اچھا روپ دکھایا تھا لیکن جو بھی شمیمہ نے رخصتی کی بات کی سمیرا بیگم نے منافقت کا چولا اتار کر اپنا اصل رنگ دکھا دیا، وہ تب جانے تھے دونوں ماں بیٹا، نشا اتنا خوفزدہ کیوں رہتی ہے، تب حسن رخصتی کی خاطر سمیرا بیگم کی ساری شرطیں مان گیا تھا گو شمیمہ بیگم کو اعتراض تھا چند شرائط پر،

”چلو ڈرائیور۔“ سمیرا بیگم نے نشا کے سہاگت وجود پر نفیرین بھری نظر ڈال کر ڈرائیور کو حکم دیا، ڈرائیور نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی، نشا کاسن وجود بھونچال کی زد میں آگیا، وہ ہوا کے گولہ بنی گاڑی کے پیچھے بھاگی، گاڑی لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی تاریکی میں غائب ہو گئی، نشا کی جان اس کے جسم سے نکلنے کو پر توڑنے لگی، تقدیر نے کیسا پلٹا کھایا تھا، کچھ وقت پہلے وہ خوشیوں کے پتھروڑے میں جھول رہی تھی اور اب انجان جگہ پر سیاہ تاریک رات میں بے یار و مددگار کھڑی اپنی حرام نصیبی پر ماتم کناں تھی، تاریکی کے دبیز پر اس پر سایہ فگن تھے سڑک کے اطراف لگے درختوں نے دکھ سے اس بکیتی لڑکی کو دیکھا تھا، ٹھنڈی بخ بستہ ہواؤں میں سرد آہوں کے راگ تھے، سڑک پر ہوا کے رحم و کرم پر پڑے زرد پتوں کے دل اس تاریک رات میں خوف سے زرد درد پڑتی لڑکی کے لئے نوحہ کناں تھے، صدمہ اور خوف اتنا شدید تھا کہ نشا اپنے سینے سے بیک چٹائے دیں سڑک کنارے ڈھے گئی، اس کا ذہن ہوش و غور سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

”پپ بارش کے قطرے تو اتر سے نشا کے بے ہوش وجود پر برسے گئے تو نشا عالم مدہوشی سے ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی، بارش کی رم جھم سڑک پر مدھر راگ بکھیر رہی تھی، نشا کافی ٹائیے خالی الذہنی کیفیت میں گھری ٹھس بیٹھی رہی، پھر اس کو سب یاد آگیا تو دل ڈوب سا گیا۔

گھبرائی نگاہ نے بے پھلا کراہول کی ہولناکی کو پوری شدت سے محسوس کیا، بے ہوش ہونا اسے نعمت لگا تھا، وہ رات کی ہولناکی کا سامنا کیسے کرتی جبکہ دن کو بیدار ہوئے کافی وقت بیت چکا تھا، دن کا یہ عالم تھا تو رات، نشا کو سوچ کر ہی جھر جھری آگئی، وہ سسکنے لگی، اس کی دنیا تو اس کا

تھا، رخصتی کے وقت فرح اسے لادیتی، لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی تھی، سمیرا چچی کا گویا نشا پر احسان تھا جو وہ نشا کو حسن کے پاس چھوڑنے آئی تھیں یہ نشا کا خیال تھا جو وہ سفر کے دوران مسلسل سوچتی آئی تھی۔

لیکن گاڑی مکمل سیاہ چادر میں لپٹی جگہ پر ٹھہری تھی۔

”باہر نکلو نشا۔“ نشا ہراساں ہوئی گاڑی سے باہر نکلی تو رات کی سیاہ چادر نے اس کے وجود کو خود میں سمولیا، سمیرا بیگم نے شیشہ نیچے کیا اور بھالہ تھا جو نشا کی ساعتوں میں اتار دیا۔

”اب تم یہیں رہو نشا، مرو یا جو میری بھلا سے، جا ہتی تو تمہیں گھر کے گیٹ سے نکال باہر کرنی لیکن تم گیٹ کے سامنے تماشا لگا لیتیں، اب یہاں سے تو تم گھر واپس جانے سے رہیں۔“ نشا کی ساعتیں لہو لہان ہو گئیں سفاکی بھرے الفاظ پر، بھٹی بھٹی نگاہوں نے سمیرا چچی کا زہر بلا ترین روپ دیکھا تھا اس بل، سمیرا چچی نے جو نبی شیشہ اوپر کیا، نشا کے وجود میں طوفان برپا ہو گیا۔

”کیسے چھوڑ کر جاسکتی ہیں آپ مجھے، وہ گھر میرا ہے جہاں آپ نے قبضہ جما رکھا ہے، آپ اتنی سنگدل کیسے ہو سکتی ہیں۔“ سمیرا بیگم کا شیشہ اوپر کرتا ہاتھ پل بھر کے لئے ساکت ہوا، پتلیاں سیڑ کر نشا کی جرات ملاحظہ کی۔

”تو مینڈکی کو بھی بالآخر زکام ہو ہی گیا، میں نے قبضہ جما رکھا ہے تمہارے گھر پر، ہاں یہی کہنا ناتم نے، تو نشا بی بی سن لو کان کھول کے، مجھے تم سے اتنی نفرت ہے کہ میرا بس حلے تو تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دوں، ابھی تو رحم کھایا ہے تم پر، تمہیں زندہ چھوڑ رہی ہوں۔“ نشا سمیرا چچی کی اتنی نفرت پر سن ہوئی۔

گھر تھا، سمیرا اچھی نے اپنی نفرت میں اسے بھری دنیا میں لاوارث بنا کر چھوڑ دیا تھا، وہ ہنسا مت کا تعین کیے برستی بارش میں ایک سمت چلنے لگی، ذہن میں اس کے سترہ سالہ ماضی کی فلم سی چلنے لگی، زندگی تو کبھی بھی اس کے لئے حسین نہ تھی، لیکن تب زندگی نے حسن کے سارے رنگ چرائے تھے، جب حسن اس کی زندگی میں آیا تھا، تب زندگی نے اپنی ساری رعنائیاں نشا کے وجود میں بھر دی تھیں، ان رعنائیوں کی عمر کتنی مختصر تھی، سڑک کنارے بارش کی رم، مہم میں بھیلی لڑکی نے دلگرنی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

سجاد اور عظیم دو ہی بھائی تھے، ان کا نہ صرف بزنس الگ الگ تھا بلکہ بچکے بھی الگ الگ تھے، عظیم کا بچکے دو کنال کی اراضی پر مشتمل تھا، پھلتا پھولتا بزنس، سنبھلی ہوئی سلیقہ شعار نرم گفتار خوبصورت بیوی عظیم خود کو خوش قسمت تصور کرتا، سجاد کا بزنس ترقی کرنے کے بجائے زیادہ تر نقصان میں رہتا، اس کا بچکے ایک کنال کا تھا، بیوی بھی واجبی شکل و صورت کی حامل، کم پڑھی لکھی، زبان دراز اور نیک چڑھی مغرور تھی، سجاد اس سے ناک تک عاجز تھے، سجاد کی شادی پسند کی تھی، ماں باپ کی منت سماجت کر کے سمیرا سے شادی کی تھی، جبکہ عظیم کی شادی خالہ تماں باپ کی پسند سے ہوئی تو سمیرا کا داغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا، جھٹانی شائستہ پر اس کا پلہ جو بھاری ہو گیا تھا۔

جس کی اچھی عادات کے سب ہی معترف تھے، سمیرا کی زبان درازی دو چند ہو گئی جب اس نے دو جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا، شائستہ کی طرف سے اتنے سال گزرنے کے باوجود کوئی خوشخبری نہ ملی تھی، ساس سر بیچوں پر جان بچھا کر کرتے

تھے، عظیم اور شائستہ بھی ندیم، نمرہ اور شمرہ پر اپنی محبتیں بچھا کر کرتے تو سمیرا کی گردن کا سر یا حزیں تن جاتا، چشم تصور میں وہ عظیم کی جائیداد کا مالک سجاد اور اپنے بچوں کو ہی تصور کرتی، جب اولاد ہی نہیں ہوگی تو پھر انہی کے حصے میں سب آئے گا، جھٹانی کے ساتھ اس کا رویہ گزارے لائق ہی تھا، سجاد اس کے برعکس اپنے بھائی اور بھابھی کا دل سے احترام کرتے تھے، جولاچ سمیرا کے ذہن و دل میں پنپ رہا تھا، سجاد کو اگر خبر ہوئی تو سمیرا عظیم کی شامت آجانی، شائستہ بھی صبر و شکر کے ساتھ بے اولادی کا غم سہہ رہی تھیں، ندیم نمرہ اور شمرہ کو ڈھیروں کھلونے آئے روز لا کر دیتیں، ساس سر بیچے بعد دیگرے بڑے بیٹے کی بے اولادی کا غم سینے سے لگائے دنیا سے رخصت ہو گئے، سمیرا عظیم کو جو لحاظ ادب تھا ساس سر کی موجودگی میں، ساس سر کے رخصت ہوتے ہی وہ بھی رخصت ہو گیا، تاک تاک کر شائستہ کو دل دکھانے والی باتیں کرتیں، شائستہ نے بھی اس بات کی شکایت عظیم اور سجاد سے نہ کی، ندیم سات سال کا، نمرہ اور شمرہ پانچ سال کی تھیں، جب شائستہ امید سے ہوئی، عظیم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، نشا ان کی زندگی میں بہار بن کر دنیا میں آئی، تو عظیم اور شائستہ کے ساتھ سجاد بھی خوشی سے بے قابو ہو گئے، سجاد کو چھوٹی سی نشا اپنی جان سے بھی پیاری تھی، سمیرا عظیم نشا کی پیدائش پر جل بھن گئی تھی اب شوہر کو اپنے بچوں پر محبت بچھا کر کرنے کی بجائے نشا پر محبتوں کے خزانے لٹاتا، وہ نشا سے نفرت کرنے لگیں، انہیں ہر وہ انسان زہر لگتا تھا جسے سجاد بیوی بچوں کو نظر انداز کر کے اہمیت دیں، سجاد کو بھی کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا سمیرا کی نشا اور شائستہ بھابھی سے نفرت اور بے زاری کا، انہوں نے پیار سے بیوی کو سمجھایا،

کونے کونے سے نشا کو انسیت ہوگی، وہ اپنے بنگلے میں ہی سکون محسوس کرے گی، سجاد کو پہلی بار سمیرا کی بات دل کو بھائی تھی، پھر آنے والے دنوں وہی ہوا جو سمیرا نے چاہا، نشا سے سجاد کی محبت میں بھی فرق نہ آیا، ایک بار سمیرا نے نشا کو ہمہ وقت سجاد کا دم چھلہ بننے پر سجاد کی غیر موجودگی میں اس کے نازک پھول سے رخساروں پر طمانچہ رسید کیے تھے۔

”آئندہ مجھے اپنے چچا کے آس پاس بھی نظر نہ آنا“ پانچ سالہ نشا سمیرا چچی سے تب اتنی خوفزدہ ہوئی یہ ڈر سترہ سال کی ہونے پر بھی پیچھا نہ چھوڑ سکا، سجاد چچا سے نامحسوس طریقے سے وہ سمیرا چچی کی موجودگی میں قریب جانے سے کترانے لگی، سجاد مکمل طور پر سمیرا کے نرغے میں آ چکے تھے، عظیم بھائی کا پھلتا پھولتا بزنس اور اپنا بزنس دونوں نے سجاد کو گھن چکر بنا کر رکھ دیا تھا، سمیرا کی زندگی کے شاہانہ ٹھاٹ باٹھ اسے غرور و تکبر کی ادنیٰ مسند پر بٹھا گئے، اسے نشا کی اتنی تعلیم دلوانی ہی نہیں تھی جو اس میں اعتماد بھر دیتی اور اسے ان کے مقابل لاکھ اکرتی اور وہ اپنے باپ کا بزنس اور دو کھانے کے بنگلے کی ملکیت کا حق جتاتی، دیو سی، ڈری سبھی نشا کو انہوں نے گھر پر ہی تعلیم دلوائی تھی، بی میل ٹیوٹر ایج کر کے، بیٹا او لیول کرتے ہی انگلینڈ اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیج دیا، نمبرہ شمرہ مہنگے ترین سکول کالج سے فارغ التحصیل نشا پر سجاد صاحب کی منت ساجت کے بعد سمیرا نے گویا احسان کیا تھا، اسے میٹرک کے پیپرز دینے دیے تھے، نشا کو تعلیم حاصل کرنے کا اتنا شوق تھا، جب اس کی سند اور رزلٹ کارڈ اسے ملا اس نے شاندار نمبر حاصل کیے تھے، وہ قیمتی متاع کی طرح انہیں سنبھال کر رکھتی تھی، پرانی ملازمہ کی بیٹی فرح اس کی ہم عمر تھی اور اسی کے ساتھ نشا کی

شائستہ بھابھی کی مثالیں دیں تو سمیرا جلتے توے پر چا بیٹھیں، اب تو سجاد کی زبان ہمہ وقت شائستہ بھابھی کی تعریف میں رطلب اللسان رہتی تھی، سمیرا جل بھن کر کونسلہ بن جاتی، نشا اتنی خوبصورت تھی جو بھی دیکھتا پیار کیے بغیر نہ رہتا اس کے اپنے بچے نشا کے آنے کے بعد پس پشت چلے گئے تھے، یہیں سے سمیرا کی شائستہ اور نشا سے شدید دشمنی کا آغاز ہو گیا، نشا تین سال کی تھی جب شائستہ دوبارہ امید سے ہوئی، عظیم اور شائستہ کو گویا دنیا جہان کا خزانہ مل گیا ہو، لیکن خوشیاں اس نیک جوڑے کو راس نہ آئیں، ایک رات عظیم شائستہ کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لئے لے گئے، نشا کو سجاد اور سمیرا کے پاس چھوڑ گئے تھے، واپسی پر دونوں بے انتہا خوش المزاج وادٹ میں بیٹے کی خوشخبری ملی تھی، عظیم شائستہ کو محبت سے چھیڑ رہے تھے، تب انہیں غلط موڑ مڑنے کا اندازہ نہ ہوا، گاڑی کی دوسری طرف سے آنے والی گاڑی سے اتنی شدید ٹکرائی گویا بم کا دھماکہ ہو گیا ہو، دونوں گاڑیوں میں بیٹھے نفوس میں سے کوئی حیات نہ رہ سکا، تین سالہ نشا کو موت اور زندگی کے معنی تو ابھی سمجھ نہ آتے تھے، بس وہ ہر وقت ماما بابا کو پکار پکار کر روتی رہتی، سجاد کا دل دکھ سے چھلکتا ہو جاتا، نشا کو اس نے جھیلی کا جھالا بنا کر رکھا، سمیرا ایٹیم کو شائستہ بھابھی اور عظیم کی موت کا وقتی صدمہ ضرور ہوا تھا، لیکن جب سجاد نے عظیم بھائی کا بنگلہ کرائے پر اٹھانا چاہا، تب اسے کمیٹی سی خوشی ہوئی، شائستہ بھابھی اور عظیم کی موت اسے فائدے سے ہمکنار کر گئی تھی اس نے سجاد کو جذباتی طور پر ٹریپ کر کے اپنا بنگلہ کرائے پر چڑھوا دیا، عظیم بھائی کے بنگلے میں ان کی اپنی قلمی شفٹ ہو گئی، سمیرا کا یوں کہنا نشا ہمارے بنگلے میں اجنبیت محسوس کرے گی، اپنے بنگلے کے

دوست تھی، وہ نشا کا بہت خیال رکھتی تھی، اسے سمیرا چچی کے عتاب سے بچانے کے لئے وہ اس کے بگاڑنے والے کام اپنے سر لے لیتی تھی، سمیرا بیگم کو نشا کا وجود خارب بن کر تب کھٹکا جب نمرہ اور ثمرہ کے لئے آنے والے اعلیٰ خاندانوں کے رشتے نشا کو پسند کر کے چلے جاتے، سمیرا کا فشار خون بلند ہو جاتا وہ نشا کو روٹی کی طرح دھنک کر رکھ دیتی، اس کی ماں کی موجودگی میں ہمیشہ مجھے نظر انداز کیا گیا اور اب اس کی موجودگی میں میری بیٹیوں کی دل آزاری ہو گی، ایسا ہرگز ہونے نہ دوں گی، تب نشا کو نمرہ اور ثمرہ کی اترن پہننے کو ملنے لگی، وہ اتنی صابر و شاکر بھی اپنا حق نہ مانگا، سمیرا چچی کا خوف اسے لب سے رکھنے پر مجبور کر دیتا، سجاد بزنس کے جھیلوں میں مصروف، انہی دنوں اس پر لان میں جانے پر بھی پابندی لگ گئی، صرف بچن کے کام دیکھے اور اپنے کمرے میں رہے، نشا حکم کی غلام، لیکن اس پابندی کا عقدہ بھی فرح نے اس پر کھول دیا، سجاد صاحب نے ایک نوجوان حسن کے ساتھ بزنس میں پارٹنرشپ کی تھی، وہ اتنا خوبصورت وجہہ اور ہندؤم نوجوان تھا، سمیرا بیگم نے نمرہ کے لئے اس کو پسند تک کر لیا تھا، اب حسن کو اپنے گھر ڈنر برائوائٹ کیا تھا، اس کی ممانگلیڈ میں تھیں، سمیرا بیگم کی پوری کوشش تھی، نمرہ کی بات بن جائے، سجاد صاحب بھی بیوی کے ہمنوا تھے وہ تھا ہی اتنا سلکھا ہوا اور تعلیم یافتہ نوجوان، بزنس بھی خاصا وسیع، نشا تو کیا سمیرا بیگم نے ثمرہ پر بھی پابندی عائد کر دی کہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے، نشا کے ذمے نت نئی ڈشز پکا کر کمرے میں چلے جانا تھا، نشا بچن میں بڑی تھی، سمیرا بیگم وقفے وقفے سے کھانے کا جائزہ لینے بچن میں آ جا رہی تھی، سمیرا چچی کی موجودگی نشا کے ہاتھ پاؤں پھلا دیتی تھی، ابھی

بھی جونہی سمیرا بیگم بچن میں آئیں، دودھ کی پتلی چولہے پر رکھتے نشا کا ہاتھ کانپا، پتلی اس کے ہاتھ سے چھوٹی، کوکنگ رینج پر دودھ پھیل گیا، سمیرا بیگم کا پارہ ہائی ہوا تو نشا کی روح فنا، ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں تمہارے، سمیرا بیگم نے نشا کی کمر پر جھولتی ناگن کی طرح بل کھائی چٹیا کو پوری شدت سے کھینچا تھا، نشا تکلیف سے بلبل اٹھی۔

”حسن کے آنے میں فقط ایک گھنٹہ رہ گیا تھا اور سارا دودھ گرا دیا تھا کم بخت نے، اب اس وقت کھیر کے لئے دودھ منگواؤں تو کھیر کب بنے گی، تم سے کوئی کام نہیں ہوتا۔“ زوردار دھکا نشا کو دیتے سمیرا بیگم کڑک کر گویا ہوئیں، نشا نے اپنا وجود بے حس و حرکت ہوتے دیکھا، غلطی معمولی ہو یا بڑی، چوٹ ہر بار ایک سی سہنی پڑی تھی اسے۔

”اب دفعان ہو جاؤ یہاں سے، ماں باپ مر گئے تم بھی مر جاتیں، میرے سینے پر مونگ دھلے کو تم دنیا میں آئیں۔“ سمیرا بیگم نشا کو بری طرح پینتے اپنے دل کا زہر اس کی ساعتوں میں اٹھیل رہی تھی بچن میں داخل ہوتی فرح نے تڑپ کر معمول کے اس منظر کو دیکھا تھا، اس کے اندر ایک آگ سی جل اٹھی تھی، نشا بی بی اتنی جائیداد کی مالک اور حال نوکروں سے بھی بدتر، نشا شستہ ہوئی بچن سے نکلی تو واجبی شکل و صورت کی مالک نمرہ سے ٹکر ہوتے ہوئے بچی، نمرہ کا وجود قیمتی لباس سے سج سا گیا تھا، روٹی ہوئی نشا کو دیکھ کر استہزائیہ مسکراہٹ نے لبوں کو چھوا، نشا کا وجود درد بن گیا، وہ اپنی اپنی تذلیل پر سمیرا چچی کی ہدایت فراموش کر گئی، اسے اپنا درد آنسوؤں کی شکل میں بہانا تھا، وہ لان میں چلی آئی، شام کے سہانے رنگ ہر سو بکھرے تھے، سجاد چچا گھر میں موجود تھے، لیکن اپنے کمرے میں صبح سے بند

تھے، پورے گھر کی کرتا دھرتا ان کی بیوی ہی تھی، سمیرا بیگم نے شوہر اور دنیا کے سامنے نشا کے ساتھ اچھے سلوک کا ڈھونگ رچا رکھا تھا، سجاد صاحب اندر ہی اندر کڑھتے تھے نشا کی حالت پر لیکن وہ بہترین رشتے کے انتظار میں تھے، تاکہ نشا کو بھی پرسکون زندگی میسر آئے، نشا لان میں بوگن ویلیا کی تیل کے نیچے لاش گرین گھاس پر چہرہ گھٹنوں پر چسما کر بیٹھ گئی، دل تھا کہ ادھر اچارہا تھا، ماں باپ کی یاد شدت اسے دل و دماغ کی دیواروں سے سر پہنچنے لگی تو وجود پھولوں کی زد میں آ گیا۔

”کیا میری زندگی یونہی ترستے بلکتے گزرے گی۔“ اسی پل حسن کی کاڑی کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور ڈرائیوے پر آٹھری، وہ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ قبل پہنچا تھا، سمیرا بیگم اور نرہ ملازمہ سے سب کھانوں کو ڈش آؤٹ کروا چکی تھیں، حسن کے آتے ہی سرو کر دیا تھا، ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ حسن آچکا ہے اور اسے لان میں روتی بلکتی نشا نے اپنی جانب قدم بڑھانے پر مجبور کر دیا ہے، نشا کا رونے اور گریہ زاری کے باعث لرزتا وجود اور اس کے عین سامنے کھڑا حسن، جس کی نگاہوں میں استعجاب پناہ لے چکا تھا۔

”یہ لڑکی آخر اتنا کیوں رو رہی ہے؟ اور ہے کون۔“ نشا کی سماعتوں نے اجنبی قدموں کی چاپ سنی تو جھٹکے سے سر اٹھایا، روئی روئی گلابی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمیرا تھا، سفید چمکتے موتیوں کی قطار میں کھلتے گلابی نازک پتھریوں سے لب، گھنیری دراز خم دار لرزتی پلکوں کی چلن کی بے تاب، چھوٹی سی ستواں شان سے اٹھی ناک، رنگت ایسی گویا میدے میں گلابی رنگ گھول دیا ہو، وہ حسن کا شاہکار تھی، حسن اس کے

حسن کے سحر میں ساکت ہوا تو نشا ہراساں ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، حسن کی نگاہوں نے اس نازک، معصوم لڑکی کی محبت کے سارے رنگ آن واحد میں خود میں سموئے تھے، یہ کیسا سحر تھا جو اس کی ہر نی سی وحشت زدہ آنکھوں نے حسن پر پھونکا تھا، وہ ایک ٹک اس پری چہرہ لڑکی کو دیکھے گیا، نشا بوکھلا گئی، سمیرا چچی کی تنبیہ ذہن کے پردے پر لہرائی تو رنگوں میں دوڑتا لہو نمجد ہوا، یہ کیا کر بیٹھی تھی وہ، حکم عدولی وہ بھی فرعون صفت سمیرا چچی کی، نشا کے قدم ہراس اور افراتفری کی جھینٹ چڑھ گئے، اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا، کہ اس کو لمحہ بہ لمحہ دور جاتے دیکھنے والا پتھر ہو چکا ہے، فرح جو نشا کو دیکھنے آئی تھی، نشا کے نقش پا کو بغور محبت سے دیکھتے دیکھ کر زیر لب مسکراتے حسن کے قریب چلی آئی، حسن فرح کو دیکھ کر یک لخت سنہلا، یقیناً یہ لڑکی اس گھر کی ملازمہ تھی، سجاد صاحب کی بیٹی نشا تھی یہ، فرح نے خود ہی نشا کا تعارف کروایا، حسن کی نگاہوں میں نشا کے لئے پسندیدگی کے رنگ دیکھ کر فرح نے دل سے چاہا تھا کاش نشا کی شادی اس خوبصورت نوجوان سے ہو جائے، اس لئے اپنی طرف سے نشا کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہا، اس پل اسے سمیرا بیگم کا بھی خوف نہ تھا صرف نشا کی بہتری مطلوب تھی۔

”اوہ..... لیکن یہ رو کیوں رہی تھیں۔“ حسن کا لہجہ مضطرب تھا۔

”بس صاحب جی، ماں باپ نہیں ہیں بی بی کے، یاد آگئی ہوگی ان کی۔“ اب وہ سمیرا بیگم کی ظلم کی داستان تو سن نہیں سکتی تھی۔

”اوہ ویری سیڈ، شادی وادی نہیں ہوئی ان کی۔“ حسن کے لہجے میں ان دیکھی آج تھی۔

”نہیں صاحب جی۔“ فرح نے زور و شور سے سرفنی میں ہلایا تھا۔

”او کے میں ذرا سمیرا آئی اور سجاد انگل سے مل لوں۔“ حسن دل ہی دل میں پرسکون ہوا تھا، فرح کی مسکراتی نگاہوں نے اندرونی حصے میں غائب ہونے تک حسن کا تعاقب کیا تھا۔

☆☆☆

”واٹ؟“ سمیرا بیگم کی زبان سے بے اختیار نکلا، انہیں ہزار کانہیں لاکھ واٹ کا جھٹکا لگا تھا یہ کیا کہہ دیا تھا، ثمنینہ بیگم نے انہیں یقیناً سننے میں غلطی ہوئی تھی، وہ بے یقین نگاہوں سے ثمنینہ بیگم کو دیکھنے لگیں، سجاد صاحب بھی عجیب سے احساسات میں گھر گئے، نمرہ بیٹی تھی تو نشا بیٹی وہ کیا فیصلہ کریں، وہ گوگو کیفیت میں محض نگاہ جھکائے بیٹھے رہ گئے، حسن نے نشا کے لئے رشتہ بھیج دیا تھا، سمیرا بیگم جو ایک ماہ سے خوش فہمی کے گھوڑے پر سوار تھیں، ثمنینہ بیگم کے نشا کا رشتہ مانگنے پر دھڑام سے خوش فہمی کے تحت سے گری تھیں، تکلیف اور جلن نجی اتنی ہی شدید تھی، ثمنینہ بیگم دونوں میاں بیوی کا رویہ دیکھ کر پریشان، حسن کی شدید خواہش بن چکی تھی نشا، سمیرا بیگم کیسے نشا کو نمرہ کا حق مارنے دیتیں، اپنے تئیں وہ حسن کو نمرہ کے لئے پسند کر چکی تھیں اور اب حسن پر صرف نمرہ کا حق تھا، ان کا ارادہ صاف انکار ثمنینہ بیگم کے منہ پر کرنے کا تھا، لیکن سجاد کی بات پر وہ آنکھیں پھاڑے شوہر کو دیکھنے لگیں، یہ کیسے نشا کو نمرہ پر ترجیح دے سکتے ہیں، دنیا والوں کو نظر میں نشا کی چچی چچا اس پر جان نچھاور کرتے تھے، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی، ثمنینہ بیگم اور حسن اس بات سے قطعی انجان تھے۔

”ثمنینہ بہن نشا آپ کی ہی بیٹی ہے، مجھے نشا کے لئے حسن کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔“ سمیرا بیگم کے سر پر گویا بم بلاسٹ ہوا تھا، نگاہ نے غصہ اور طیش ایک ساتھ اگلا تھا، لیکن مقابل بھی

سجاد صاحب تھے جن کو اس پل صرف نشا کی بھلائی مقصود تھی۔

”ارے بھائی صاحب، بہت بہت شکریہ، نشا اتنی پیاری ہے، میرا تو دل ہے چٹ مٹنی پٹ بیاہ کر ڈالو، اکلوتا بیٹا ہے، میں گھر میں اکیلی بھائیں بھائیں کرتے گھر میں کیسے دن گزارتی ہوں مجھے پتہ ہے، ملازم بے شک ہیں لیکن ملازم رشتوں کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتے نا، بس آپ جلدی سے کوئی تاریخ طے کر دیں میں اپنی امانت لے جاؤں۔“ ثمنینہ بیگم کا لہجہ بے صبر بے پن کا غماز تھا، نشا نے ہی چائے وغیرہ سرو کی تھی، نشا کے چہرے کے بھولپن اور معصومیت ان کے دل کو بری طرح بھاگتی تھی، حسن کی پسند واقعی لا جواب تھی، سمیرا بیگم کے تن من میں گویا آگ لگی تھی، جس کی پلٹیں اس کی آنکھیں اگل رہی تھیں۔

”بات تو آپ کی ٹھیک ہے بہن لیکن کچھ تو تیاری کرنا ہوگی ہمیں۔“ سجاد صاحب کا انداز خوشگوار بیت کا عکس لئے ہوئے تھا، بیوی کے تپے تاثرات سے وہ ہرگز انجان نہ تھے۔

”تیار رہی بیٹی بھائی صاحب، ہمیں صرف نشا کی ضرورت ہے باقی اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس ہے، آپ کو تو چھان بین کی بھی ضرورت نہیں، حسن آپ کا دیکھا بھالا ہے، بس آپ کوئی تاریخ دے دیں۔“ ثمنینہ بیگم کو سمیرا بیگم کے انداز بہت کچھ جتلا گئے تھے۔

”یہ عورت ضرور خنہ ڈالے گی رشتے میں۔“ وہ سمجھ گئی تھیں۔

”اگر آپ بضد ہیں تو اس ماہ کی پچیس تاریخ مناسب رہے گی، نکاح کر لیتے ہیں، پھر ایک ماہ بعد رخصتی ہو جائے گی۔“ سجاد صاحب نے بھی زیادہ ٹال مٹول سے کام نہ لیا، جھٹ

”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ نشا کو تشویش نے آگھیرا، رات کے اس وقت فرح اس کے کمرے میں آئی حالانکہ آٹھ بجے کے بعد سرونٹ کو ارڈرز سے کوئی نہیں لگتا تھا یہ سمیرا بیگم کا حکم تھا۔

”سب خیریت ہے؟“

”تم میرے ساتھ آؤ۔“ فرح نشا کا نرم و نازک ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے آئی، سمیرا بیگم نمبر نمبرہ کو لے کر سجاد صاحب کے کسی دوست کے بیٹے کی شادی میں گئی تھیں، راوی چین ہی چین لکھتا تھا، ایسے میں فرح کا یوں کمرے سے کھینچ کر باہر لے جانا، وہ حیران کم پریشان زیادہ ہوئی، دونوں لان میں چلی آئیں جہاں اک سکوت کا عالم تھا، مدہم روشنیوں نے ان کا استقبال کیا، فرح نشا کو لے کر ایک پھولوں کی کیاری کے قریب لے گئی تو نشا کا دل گویا دھڑکتا بھول گیا، سراسیمگی بھری نگاہ نے فرح کو دیکھا تھا، فرح کندھے اچکا کر اٹل قدموں لوٹ گئی، خوبصورت وجہہ نو جوان نے محبت سے اس پر ی کو دیکھا تھا جو ہمہ وقت خوف کے پہرے میں رہتی تھی۔

”کیسی ہوشیار“ گنبد لہجے میں بے قراری پنہاں تھی، نشا کا حلق گویا کانٹوں سے بھر گیا، وہ کب اتنی بہادر تھی جو حسن سے تنہائی میں ملنے کی حسرت کرتی، وہ محض لب چل کر رہ گئی، حسن نے دلچسپی سے اس گھبرائی حسین صورت کو دیکھا تھا۔

”آپ کو دیکھنے کو دل چاہا تو چلا آیا، شکریہ آپ کی دوست کا، آپ سے ملوانے میں میری ہیلپ کی، آپ ڈرتی کیوں ہیں، ہمارا رشتہ فاضل ہو چکا ہے، چند دن بعد نکاح ہے۔“

”پلیز نشا مجھ سے کچھ تو بات کرو۔“ حسن نشا پر فسوں پھونکتا اس کے قریب ہوا، نشا بدک کر پیچھے ہٹی تھی، سوکھے لبوں نے زبان سے تر کرنے

تاریخ طے کر دی، فرح جو آس پاس منڈلا رہی تھی، گفتگو اپنی سماعتوں میں انڈیلٹی وہ خوشی سے بے قابو ہوئی نشا کو بتانے بھاگی کہ تمہارے اس زندان سے نکلنے کے دن بالآخر آ ہی گئے، سمیرا بیگم تو جھٹ پٹ تاریخ طے ہوتے دیکھ کر گویا جلنے تو ہے پر جا بیٹھیں لیکن ضبط کی طنائیں ہاتھ سے ہرگز چھوٹنے نہ دیں، ابھی بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا اگر وہ عمل کا دامن تھامے رکھتیں۔

”بھئی اتنی جلدی بھی کیا ہے نکاح کی، آپ تو تھیلی پر سروسوں جمائے بیٹھی ہیں۔“

”سمیرا میرا بس طے تو آج ہی حسن کی بارات لے آؤں۔“ ثمنینہ بیگم سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی، سجاد صاحب نے سنجیدگی سے بیوی کی منافقت بھری مسکراہٹ ملاحظہ کی تھی، اب انہیں سب سے ضروری بات ثمنینہ بیگم کے گوش گزار کرنی تھی، لیکن سمیرا کی موجودگی میں طوفان اٹھنے کا اندیشہ تھا، لیکن بات تو کرنی ہی تھی، سو گلا کھکار کر ثمنینہ بیگم کو مخاطب کیا۔

”بہن آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ سجاد صاحب کے انداز پر سمیرا بیگم کے کان کھڑے ہوئے، کون سی ضروری بات کرنے لگے ہیں سجاد صاحب، ثمنینہ بیگم ہمہ تن گوش ہوئیں۔

”جی کہیے۔“ وہ بات کچھ یوں ہے، میرا پرنس اور یہ بگلہ نشا کی.....“ سجاد صاحب کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ سمیرا بیگم نے شدت سے کھانسا شروع کر دیا، سجاد صاحب کی بات ادھوری ہی رہ گئی، لیکن ثمنینہ بیگم ادھوری بات کا مفہوم سمجھ گئی تھیں، سمیرا کی کھانسی پر ان کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

☆☆☆

”نشا..... نشا۔“ فرح نشا کے کمرے میں داخل ہوئی تو نشا کو نہ پا کر بے تاب سے پکارا۔

تھا وگرنہ دل تو چاہ رہا تھا اس خبیث انسان کی آنکھیں نکال دے، نشا کو عجیب نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔

”او کے حسن صاحب آپ اب تشریف لے جائیں، نشا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ ندیم کے لہجے سے حقارت چھلکی تھی، حسن کو اپنی ہنس محسوس ہوئی لیکن جانا تو تھا نشا اپنے کمرے میں جا چکی تھی، حسن کا دل انجانے خدشے میں لپٹا تھا لیکن خود کو پرسکون کرتے وہ بنا الوداعی مصافحہ کیے اپنی گاڑی کی جانب بڑھا، ندیم کی نگاہ نے گاڑی نے گیٹ سے نکلنے تک اس کا تعاقب کیا تھا، گیٹ بند ہوا تو اپنے ہینڈ کیری کو لئے وہ اندرونی حصے کی جانب بڑھا، وہ پورے پانچ سالوں بعد گھر لوٹا تھا، تعلیم حاصل کرنے کے دوران سجاد صاحب نے بہت کہا، سمیرا بیگم نے منتیں کیں کہ ”چکر لگایا کرو لیکن انگلینڈ کی رہنیں فضا اس کے وجود میں رچ بس گئی تھی، سوماں باپ کی منت ساجت کو تاک سے مہی کی طرح اڑا دیتا۔“

اب اچانک ہی اس کا دل کیا پاکستان آنے کو تو بنا اطلاع دیے چلا آیا، پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا، ندیم اپنے کمرے میں چلا گیا اس کی آنکھوں کے پردے پر نشا کا حسین سراپا جگمگائے جا رہا تھا، کتنی بڑی ہو گئی ہے نشا اور پیاری بھی، بڑ بڑاہٹ میں خباثت کی بورچی تھی، وہ بیڈ پر شوش سمیت دراز ہو گیا، ایک خیال نے اس کے وجود میں بجلی بھردی، رات کی تنہائی، گھر میں کسی کا نہ ہونا، ملازمین کا اپنے کوارٹرز میں چلے جانا۔

”ندیم موقع اچھا ہے، گھر میں عیاشی کا سامان موجود ہے اور تو خواہ خواہ پردیس کاٹ رہا ہے، دبوی، ڈری سبھی نشا کیا شکایت لگائے گا میری جب تک موقع ملا کھیتا رہوں گا۔“ سوچ

کی التجا کی تھی جو منظور ہوئی تھی، اس کے حلق سے بمشکل چند لفظ ادا ہوئے تھے۔

”آپ پلیز جائیں یہاں سے۔“
”کیوں جاؤں، بلکہ اب تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ حسن لہجے لہجے ڈگ بھرتا لان میں رکھی چیئر کی طرف بڑھا اور شان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا، نشا کا رنگ اڑ گیا، سمیرا اچھی اور سجاد چچا کے آنے کا وقت ہو چلا تھا، نشا چھوٹے چھوٹے خوف میں لپٹے قدم اٹھاتی حسن کے عین سامنے رکی، حسن نے فرصت سے اسے دیکھا تھا ہاتھ جوڑے سینے پر بندھے تھے، نشا نے پل بھر کے لئے نگاہ مقابل شاندار بندے پر ڈالی تو اس کی نگاہوں میں محبت کا اک جہاں آیا نظر آیا تھا، وہ اس محبت کے جہاں میں کھوس گئی، حسن کی محبت اس کے لئے ایسا روزن تھا جس سے زندگی اپنا احساس دلا گئی تھی اسے، وہ محبت کے جہانوں کی سیر پر نکلتی تھی، جب جانی پہچانی آواز نے اسے حقیقت کی دنیا میں لا بٹھا تھا۔

”ہیلو ایوری باڈی، کیا ہو رہا ہے یہاں۔“
آنے والے کا لہجہ خاصا مشکوک تھا، نشا نے خوفزدہ نگاہوں سے آنے والے کو دیکھا تو وہ سرسوں کا پھول بن گئی۔

”آپ کی تعریف۔“ حسن نے چیئر سے اٹھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

”میں ندیم سجاد صاحب کا بیٹا، انگلینڈ سے آیا ہوں، سر براؤز دینے کے چکر میں بہت کچھ دیکھنے کو مل گیا۔“ لہجے میں کمینگی کی رت تھی، حسن نے بمشکل خود پر ضبط کیا تھا۔

”اور آپ۔“ ندیم نے حسن کا ہاتھ تھام کر نشا پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

”میں حسن، سجاد انکل کا بزنس پارٹنر اور نشا کا منگیتر۔“ حسن نے بادل خواستہ اپنا تعارف کروایا

نشا آیت الکرسی پڑھ کر خود پر ہمیشہ دم کرتی تھی، فرح کے آنے سے قبل وہ نماز عشاء کی ادائیگی کے بعد خود کو اللہ کی امان میں دے چکی تھی، ندیم جیسا بھیڑیا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اسے اللہ پر کامل یقین تھا، ندیم نشا پر جھپٹتا تو وہ سرعت سے ایک طرف ہو گئی، ندیم اپنی ہی جھونک میں بیڈ پر جا گرا لیکن گرتے ہی اس نے نشا کا بازو جھپٹ کر اسے بھی اپنے قریب گرا لیا، نشا کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں، اللہ کسی کو تو اس کی مدد بھیجے گا، ندیم نشا کی چیخوں پر بوکھلا سا گیا تھا۔

”یہ آواز تو نشا کی ہے۔“ سجاد صاحب جونہی گاڑی سے باہر نکلے تو اندرونی حصے سے بلند ہوتی چیخوں کی آواز پر دھک سے رہ گئے، سمیرا بیگم نمرہ اور ثمرہ جو گاڑی سے نکل کر اندرونی حصے کی جانب بڑھ چکی تھیں، اندرونی حصے میں چارو نفوس داخل ہوئے تو نشا کی تیز ہوتی چیخ و پکار نے ان کا استقبال کیا، سجاد صاحب بجلی کی سی تیزی سے نشا کے کمرے کی جانب بڑھے، نمرہ ثمرہ اور سمیرا بیگم نے بھی سجاد صاحب کی تقلید کی، نہ جانے کون سی آفت آگئی تھی جو یوں چلا رہی تھی، سجاد صاحب جونہی کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے کمرے کا منظر دیکھ کر ان کا خون کھول گیا، ندیم نشا پر قابو پانے میں نڈھال ہوا جا رہا تھا جبکہ نشا اپنے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھی۔

”ندیم!“ سجاد صاحب پوری قوت سے دھاڑے تھے، کمرے میں داخل ہوتی سمیرا نمرہ ثمرہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، سجاد صاحب کے انتہائی غصے میں آنے کی علامت بھی یہ، سمیرا بیگم بھی سجاد صاحب کے اس انتہائی درجے کے غصے سے خائف رہتی تھیں، ندیم اچھل کر بیڈ سے اترتا تھا نشا نے بجلی کی سی تیزی سے دوپٹہ اوڑھا

میں غلاطت تھی، وہ نہیں جانتا تھا، بات جب عزت اور کردار پر آ جاتی ہے تو ڈری سہی دیولڑکی بھی شیرنی کا روپ دھار لیتی ہے۔

نشا کے ذہن و دل پر حسن سے ملاقات کی سرشاری چھائی تھی تو دوسری طرف ندیم کی نگاہوں کا خوف، عجیب سی نگاہیں تھیں، اس گھر کے کسی فرد کی نگاہ میں اس کے لئے محبت اور احترام نہ ہوتا تھا ماسوائے سجاد پچا کے، کو لاک لگانے کے لئے انھی بھی فرح آئی تھی اور اس سے ملاقات کا احوال سن کر خوب خوش ہوئی تھی، لیکن ندیم کی آمد کا سن کر وہ جی بھر کر بد مزہ ہوئی تھی، وہ گئی تو نشا اپنے بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے لگی، دروازہ لاک ہی نہ کیا، جیسے ہی وہ دروازہ لاک کرنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی کھلے دروازے سے ندیم داخل ہوا تھا۔

”کیسی ہونٹا ڈنیر، بہت خوبصورت ہو گئی ہو۔“ گھر میں کسی کو موجود نہ پا کر ندیم بے خوف تھا، دروازہ اس نے بھی کھلا ہی چھوڑ دیا تھا، نشا نے اپنے اندر خوف و ہراس اترتے دیکھا تھا۔

”جب حسن کے ساتھ تنہائی میں ملاقات ہو سکتی ہے تو میرے ساتھ کیوں نہیں، ویسے بھی اتنی رات گئے نہ جانے کس حد تک گئے ہو تم دونوں۔“

”چٹاخ۔“ نشا کا نرم و نازک ہاتھ ندیم کے رخسار پر پڑا تھا۔

”جتنے تم گھٹیا ہوا اتنی ہی گھٹیا تمہاری سوچ ہے، دفع ہو جاؤ میرے کمرے سے، ورنہ شور مچا کر سب کو اکٹھا کر لوں گی۔“ نشا ایک ایک لفظ پر زور دیتی گرجی تھی۔

”تمہاری اتنی جرأت تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ اور مجھے گھٹیا کہو۔“ ندیم ٹھپڑ کھانے پر ساقط ہوا پھر مغلظات کا طوفان تھا جو اس کے منہ سے اٹھتا تھا۔

تھا۔

”ڈیڈ نٹا مجھے زبردستی اپنے کمرے میں کھینچ لائی تھی۔“ ندیم بوکھلا کر بے تکلف پن کا مظاہرہ کر گیا، چھ سالوں بعد وہ لوٹا تھا، باپ سے ملا بھی تھا تو کس انداز میں، جب ان کی نگاہوں محض اس کے لئے دکھ بھرا غصہ تھا، سمیرا، نمرہ، شمرہ بھی ندیم کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”تم تو ننھے کا کے تھے نا، جو نشا نے تمہیں بلایا اور تم کھینچے چلے آئے، یوں کیوں نہیں کہتے تمہاری گندی تربیت نے تمہیں میری نظروں سے گرا دیا ہے، اپنے گھر کی عزت پر نقب لگانے چلے تھے، شرم آ رہی ہے مجھے تمہیں بیٹا کہتے ہوئے۔“ سجاد صاحب کی آواز بھرا گئی، ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی اخلاقی طور پر پستی کا شکار دل دکھ سے بھر گیا تھا، گندی تربیت کا لفظ سمیرا بیگم کے منہ پر جوتے کی مانند لگا تھا، بلبل کر پھینکا رہیں۔

”میرا بیٹا ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ ہے ہی ایسی، یونہی تو حسن اس کا دیوانہ نہیں ہوا، کوئی تو گل کھلایا ہوگا اس نے، میرے آنے سے قبل حسن نشا کے ساتھ کمرے میں تھا۔“ ندیم نے ماں کی شبہ پا کر مزید زہرا گلا، نشا پتھر ہوئی۔

”گھٹیا ذہنیت سے گھٹیا بات کی توقع ہی کی جا سکتی تھی، بکواس بند کرو اپنی، اپنی غلاظت چھپانے کی خاطر تم اس معصوم پر تہمت لگا رہے ہو اور تم نا عاقبت اندیش عورت۔“ سجاد صاحب نے روئے سخن بیوی کی جانب موڑا، اس لقب پر سمیرا بیگم کھول کر رہ گئیں۔

”نشا اور شائستہ بھابھی کے ساتھ دشمنی میں تم اپنا کتنا نقصان کر چکی ہو، کاش تمہیں اندازہ ہو جائے، یہ تمہارا بیٹا اخلاقی گراؤ کا شکار، تمہاری تربیت کی نا اہلی کا ثبوت، تم سے شائستہ بھابھی کی تعریف برداشت نہ ہونی تھی، ان کے اخلاق و

کردار کا سراپا ہے جانا کبھی ہضم نہ ہوا تمہیں، کبھی اپنے اندر جھانکا تم نے، کہ مجھ میں ایسی کون سی خامی ہے جو مجھے ان کے درجے تک نہیں جانے دیتی، اسی بات پر اولاد کو لگا دیا، نہ خود سکون سے رہتی ہو اور نہ دوسروں کو رستہ دیتی ہو۔“ سجاد صاحب دل تھام کر بیڈ پر بیٹھ گئے تھے، سمیرا بیگم زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہی تھی، ان کی تربیت کو سجاد نے نشا کی خاطر گالی بنا دیا تھا، نشا نے دو خونخوار نگاہوں کو خود پر مرکوز پایا تھا، ندیم کے چہرے پر شرمساری کی رمتی تک نہ تھی، بلکہ وہ اب خاصی حد تک سنبھل چکا تھا۔

”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے ابھی اسی وقت اس پر عمل درآمد بھی ہونا چاہیے۔“ سب نفوس نے چونک کر سجاد صاحب کو دیکھا تھا، نشا کے بے آواز آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔

”ندیم تب تک گھر میں قدم نہیں رکھے گا جب تک نشا کی شادی نہ ہو جائے، دو تین دن رہو اور پھر اپنا بوریا بستر گول کر کے انگلینڈ واپس چلے جاؤ لیکن ان دنوں میں مجھے تم نشا کے قریب بھی نظر آئے تو تمہارا انجام بہت برا ہوگا، اسے دھکی مت سمجھنا جو کہا ہے میں نے اس پر عمل کرنا بھی جانتا ہوں۔“ ندیم تو ندیم سمیرا بیگم سجاد صاحب کے اس فیصلے پر بھونچکا رہ گئیں، نمرہ، شمرہ نے طیش اٹھتی نگاہوں سے نشا کو دیکھا تھا جس نے محبت بھری نگاہوں سے چچا کے چہرے کا طواف کیا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سجاد، اتنی معمولی سی غلطی پر بیٹے کو گھر سے نکال رہے ہیں۔“ بے یقینی سمیرا بیگم کے لہجے سے چھلکی تھی۔

”پہلی بات غلطی معمولی ہر گز نہیں دوسری بات گھر سے نکال نہیں رہا، ایک اور ماہ کے لئے انگلینڈ واپس بھیج رہا ہوں۔“ اس کے نفس میں

اور نمرہ کو ساتھ لے کر جاتی تھیں، سجاد صاحب کے کسی دوست نے گیٹ تو گیدر رکھی تھی، وہ بطور خاص تینوں ماں بیٹیوں کی مدعو کرنے آیا تھا، سمیرا بیگم کیوں نہ جاتیں، انہیں اپنی بیٹیوں کے شاندار بر بھی تلاش کرنے تھے، گیٹ تو گیدر پارٹی رات بارہ بجے تک چلتی تھی، گھر کی دیکھ بھال فرح کی امی کے سپرد کر کے سمیرا بیگم اپنی بیٹیوں کو لے کر جا چکی تھیں، فرح نے جلدی جلدی نشا کو تیار کیا، سیاہ نیٹ کی قمیض پر سرخ پھولوں کی ایمر ایڈری تھی، نیٹ کا دوپٹہ اور ریڈ ٹراؤزر، نشا کی گلابی رنگت کھل اٹھی تھی، آج اس نے کسی کی اترن نہ پہنی تھی، یہ سوٹ اسے سجاد چچا نے دلویا تھا جو اس نے سنبھال کر رکھا تھا حسن کے گھر سے آنے والی اشیاء کی نشا کو شغل بھی دیکھنے کو نہ ملی تھی۔

”نشا جلدی سے ریڈی ہو جاؤ، حسن صاحب بس پہنچنے والے ہوں گے۔“ فرح پر جوش طاری تھا، حسن لینڈ لائن پر فرح سے رابطے میں رہتا تھا، نشا کی تو ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ وہ حسن سے فون پر بات کرے، سمیرا چچی لاؤنج سے فون بھی اٹھا لیتیں اگر ان کو بھنک بھی پڑ جاتی، فرح پر اعتماد دل گیا تھا، وہ بڑی آسانی سے سمیرا بیگم کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نشا کی خیریت حسن تک پہنچاتی رہتی تھی، سمیرا بیگم کے سب عزائم سے بھی حسن کو قبل از وقت آگاہ کر دیتی اور نشا کو حسن کی خیریت بتا دیتی، حسن اور نشا کے درمیان رابطے کا پل فرح تھی، سات بجے ہی فرح نشا کو گیٹ پر لے آئی، چوکیدار کو فرح نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا، وہ بھی صاحب کی بیٹی کے لئے دل میں ہمدردی بھرا جذبہ رکھتا تھا، وہ کون سا نامحرم سے ملنے جا رہی تھی، وہ حسن کی منکوحہ تھی، جونہی نشا حسن کے کھولے گئے فرنٹ ڈور سے گاڑی کے اندر بیٹھی، حسن کی میٹھی محبت بھری نگاہ

اتنی غلاظت بھری ہے سمیرا کہ اس کو گھر میں رکھنے کا رسک نہیں سے سکتا، سجاد صاحب کی آواز دکھ سے لرز رہی تھی، ٹھیک تین دن بعد ندیم واپس جا چکا تھا، نشا کا وجود سمیرا بیگم کے لئے مزید ناقابل برداشت ہو گیا تھا، حسن سے نکاح روکنے کی سر توڑ کوششیں کر ڈالیں، نشا کے کردار پر کیچڑ اچھالا، لیکن نہ جانے ماں بیٹا پر نشا کی معصوم صورت نے کیسا جادو کر دیا تھا، دونوں نے نکاح پڑھا کر ہی دم لیا تھا، سجاد صاحب جو اندر ہی اندر بیٹے کی اخلاقی گراؤ کا غم لئے کھل رہے تھے۔

نشا کے نکاح کے چند دن بعد ہی دل کا دورہ پڑنے پر خالق حقیقی سے جا ملے، نشا بلک بلک کر روئی تھی، صبح معنوں میں وہ بے اہاں تواب ہوئی تھی، ان کی وفات کے بعد سمیرا بیگم نے رخصتی کرنے سے صاف انکار کر دیا، بیٹے کو فوری بلا بھیجا، ندیم نے ماں کو سختی سے کہہ دیا۔

”حسن سے پانچ سو روپے ختم کی جائے اور نشا کو اس کے آنے سے قبل گھر سے دفنان کر دیا جائے۔“ وہ نشا کی شکل دیکھنے کا روا دار نہ تھا، دوسری طرف حسن اور ثمنینہ رخصتی کے لئے اتاؤ لے ہوئے جا رہے تھے، بالآخر سمیرا بیگم نے بھاری رقم کی ڈیمانڈ کر کے رخصتی کی رضا مندی دیدی، حسن نے کوئی اعتراض نہ کیا اور بٹے یہ پایا سمیرا بیگم نشا کی باعزت طریقے سے رخصتی کر دیں، رخصتی ہوتے ہی حسن چیک سمیرا بیگم کے حوالے کر دے گا، لاچ سے بھری سمیرا بیگم بجائے نشا کو اس کے حصے کی جائیداد دیتیں لانا حسن سے منہ مانگی رقم مانگ لی، حسن کی رخصتی سے قبل پوری کوشش تھی، نشا سے ملاقات کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے، یہ موقع بھی جلد میسر آ گیا فرح کی بدولت، حسن کا دل تھا نشا کے ساتھ کینڈل لائٹ ڈنر کیا جائے، سمیرا بیگم جہاں بھی جاتی تھیں شرہ

نے سکون کا ذائقہ چکھا تھا، وہ اس کے پاس بھی، یہ احساس اتنا خوش کن تھا، وہ ہواؤں کے سنگ اڑنے لگا، وہ نشا کو پا کر ہی دم لے گا، محبت بھری مسکراہٹ نشا کو دان کر کے حسن نے گاڑی سارٹ کر دی، نشا پر شرم اور گھبراہٹ نے ایک ساتھ حملہ کیا تھا، وہ ندوس سی نرم و نازک ہاتھوں کی لالچی مخرطی انگلیوں کو باہم پھنسائے شیشے کے پار دیکھنے لگی، ذہن و دل تو حسن کے آس پاس تھے نگاہ کیا دیمپتی۔

”کچھ بات کرو نشا۔“ حسن کا گہمیر لہجہ نشا کی سماعتوں سے ٹکرایا اور اس کے دل کو دھڑکا گیا۔

”کیا بات کروں؟“ نشا کی سریلی مترنم آواز نے گویا جادو جگا دیا۔

”کچھ بھی اپنی پسند نا پسند بتاؤ، کچھ اپنے بارے میں بتاؤ، کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ یہ ان کی پہلی فرصت بھری ملاقات تھی جس میں کسی کے آنے کا خوف شامل نہ تھا، حسن کو جاننا تھا نشا کے دل میں اس کا کیا مقام ہے، نشا اس سوال پر کھوسی گئی، کیا وہ واقعی حسن سے محبت کرتی ہے یا حسن کی صورت اس کو اس گھر کے ظالمانہ گھٹے ہوئے ماحول سے چھٹکارا پانے کے لئے کوئی روزن ملا ہے، حسن اسے اچھا لگتا تھا بہت اچھا، وہ اس سے محبت کرتا تھا، اسے اپنے دل کی اونچی مسند پر بٹھا چکا تھا، نکاح کر چکا تھا، کیا وہ حسن سے محبت کرتی ہے، اس کے دل کے تار اس بار خاموش رہے تھے۔

”محبت بھی ہو جائے گی، محبت تو انسان کو بہادر اور نڈر بنا ڈالتی ہے، ہر خطرے سے آزاد کر دیتی ہے۔“

اگر اسے حسن سے محبت تھی تو اس کے اندر کا ڈر خوف جوں کا توں کیوں تھا۔

”کیا ہوا سوچنے کی، اتنا سسلس سوال نہیں پوچھ لیا میں نے۔“ حسن کو اپنے سوال کے جواب میں نشا کا خاموش رہنا اچھا نہ لگا تھا۔

”آپ بہت اچھے انسان ہیں چاہے جانے کے لائق، آپ سے محبت کیوں نہ ہوگی۔“ نشا کو حسن کو ناراض نہیں کرنا تھا، وہ اسے اچھا لگتا تھا، پسند تھا لیکن محبت، محبت تر تزیاتی ہے، بے چینیوں اور اضطراب کے جہانوں کی پہروں سیر کروانی ہے۔

”اگر محبوب ساتھ ہو تو ہر چیز گنگنائی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ہر منظر دل کو حسین تر لگتا ہے۔“ اس کا دل اتنا خاموش کیوں تھا، لیکن حسن اس کی پہلی اور آخری محبت تھا اس نے اپنے دل کو یقین دلا دیا تھا، حسن نشا کے جواب پر کچھ بل اس کے حسین چاند سے کھمڑے کو دیکھتا رہا۔

”اپنا دیوانہ نہ بنایا تو میرا نام نہیں۔“ پر فسون سرگوشی گاڑی میں چکرانے لگی، نشا نے مسکرا کر سر جھکا لیا، حسن نے ایک ریشورنٹ کے سامنے گاڑی روکی اور گاڑی سے نکل کر نشا کی سائیڈ کا دروازہ کھولا، نشا کسی شہزادی کی مانند گاڑی سے اترتی تھی۔

”ہیلو حسن!“ حسن اور نشا دونوں بے اختیار اس آواز پر پلٹے تھے جس میں آگ تھی۔

”اوہ عریشہ، تم یہاں کیسے۔“ حسن بے ساختہ مسکرایا تھا، وہ جانتا تھا لہجے کی آگ میں حسد اور رقابت کی بوتھی۔

”میں یہاں اپنی فرینڈز کے ساتھ ڈنر کے لئے آئی تھی اور تم اس نئی نیلی چڑیا کو ڈنر کروانے لائے ہو، ہاؤ امیزنگ، اجازت دے دی اس کی چچی نے۔“ عریشہ نے لفظ لفظ دانت پیس کر کہا تھا۔

”تم اپنی فرینڈز کے ساتھ انجوائے کرو،

خواہ مخواہ خود کو جلاؤ مت، تم جانتی تو ہو مجھے اچھی طرح۔“ حسن بامعنی انداز میں مسکرایا تھا، نشا ہونٹوں کی طرح دونوں کی شکل دیکھنے لگی۔

”جانتی ہوں اچھی طرح، تم پر اس لڑکی کی محبت کا بھوت سوار ہے، حاصل کر چکے ہو تم اسے، لیکن یاد رکھو، بہت کچھ کھو کر۔“ عریشہ لفظ چاچا کر بولتی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئی، اسے اب ڈنریہاں ہرگز نہیں کرنا تھا جہاں حسن موجود تھا اس لڑکی کے ساتھ۔

”آؤ نشا۔“ عریشہ کے جاتے ہی حسن نشا کا ہاتھ تھام کر ریٹورنٹ کے گلاس ڈور کو دھکیلتا ریٹورنٹ میں داخل ہوا، بیٹھنے کے لئے نسبتاً تنہائی والے گوشے کا انتخاب کیا۔

”یہ لڑکی کون تھی۔“ نشا نے چیخ سنھا لیتے ہی دل و دماغ میں کلبلاتا سوال حسن کے گوش گزار کیا۔

”یہ لڑکی میری فریڈ تھی عریشہ، ہم دونوں ایک ساتھ بڑھے ہیں، لیکن پلیر نشا اب مزید عریشہ کے متعلق کوئی سوال نہیں، مجھے تمہارے ساتھ اچھا خوشگوار وقت گزارنا ہے۔“ حسن کی وارفتہ نگاہوں کی زد میں تھی، نشا کو نہ جانے کیوں محسوس ہوا تھا حسن کے لہجے میں نرمی بھری فکر تھی۔

”کچھ نہیں کبھی گھر سے باہر نکلی نہیں نا، اس لئے کنفیوژ ہو رہی ہوں۔“ اور یہ سچ بھی تھا وہ واقعی کنفیوژ ہو رہی تھی۔

”بس رخصتی ہو لینے دو تمہیں پوری دنیا کی سیر کروادوں گا۔“ حسن نے آگے کوچھک کر نشا کے خوبصورت چہرے کو نگاہوں میں سمو کر سرگوشی کی تھی۔

☆☆☆

آہ ماضی اس ٹھوکر نے آن واحد میں تحلیل

کیا تھا، وہ حال میں آچکی تھی، سڑک کنارے سینے سے لیڈر بیگ چمٹائے، وہ نہ جانے کب سے بے سمت چلتی اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں گم تھی، چلتے چلتے وہ ماضی کی یادوں میں ڈوبی راستے میں آنے والے پتھر کو نہ دیکھ سکی اور ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گری تھی، آہ اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی، اس نے چونک کر آس پاس دیکھا تھا، وہ مکمل بھیگ چکی تھی، بارش گوتھم چکی تھی، حسن نے تو اسے دنیا کی سیر کروائی تھی، قسمت نے اسے دنیا کے سپرد کر دیا تھا، لیڈر بیگ کے باعث اس کے ماما پاپا کی تصویریں اس کے ڈاکو منٹس بھیگنے سے محفوظ رہے تھے، اس وقت حسن سے زیادہ اسے اپنی عزت اور بقا کی فکر دامن گیر تھی، وہ کہاں پناہ لے، وہ دیوبسی سہمی ہوئی سترہ سالہ لڑکی اس ایک پل میں عورت کا روپ دھار گئی، دنیا کے پھٹروں سے بچنے کے لئے اسے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے، یہ پہلا سبق تھا جو نشا نے اس پل خود کو پڑھایا تھا، وہ آیت الکرسی کا ورد کرنی سڑک ختم ہوتے ہی نظر آتی آبادی میں قدم رکھ گئی، خستہ حال مکان، ٹوٹی پھوٹی گلیاں، گلیوں میں گندگی کی بھرمار، بارش کے باعث گلیاں مزید تعفن پھیلا رہی تھیں، سمیرا چچی نہ جانے اسے کہاں چھوڑ گئی تھیں۔

”کتنی ظالم عورت تھی ایک پل کے لئے بھی نہ سوچا میرا۔“ اس کا دل سسکا تھا لیکن آنکھوں کے سوتے خاموش تھے، وہ آنسو بہا کر کیا اپنے لئے پناہ گاہ تعمیر کر لیتی، اسے ہمت کرنا تھی اور آنسو ہمت کمزور کرتے ہیں اور اسے اب کبھی آنسو نہیں بہانے تھے، اس پر آزمائش کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔

”اللہ اپنے بندوں سے غافل تو نہیں، اس کے روئے گھبرائے دل کو تقویت پہنچائی تھی۔“

اس پر مشکل آئی تھی یقیناً اللہ آسانی بھی دے گا، یہی یقین اس کے قدموں کو آگے بڑھائے گیا۔

”کون ہو تم لڑکی، اور کس سے ملنا ہے۔“ سامنے سے آتی عورت نے ایک خوبصورت ترین اچھے لباس میں ملبوس لڑکی کو گلی میں گھروں کو بغور دیکھتے دیکھا تو قریب آنے پر استفسار کیا، نشا ٹھہر گئی، نگاہ عورت کے حیرانگی و استعجاب سے اُلے چہرے پر پڑی۔

”کیا کوئی ہو تم، کپڑے بھی تمہارے گیلے ہیں، ساری رات بارش میں بھیجتی رہی ہو جیسے۔“ عورت کی آواز اب قدرے بلند تھی، نشا کی زبان گنگ، وہ کیا بتائے اس عورت کو، اس پر کیا یقینی اور وہ بھیگی کیسے؟

”او بی بی، کچھ تو بولو، اچھے گھر کی دکھائی دیتی ہو، راستہ بھول گئی ہو کیا؟“ عورت کی بات پر نشا نے چونک کر غوریت کو دیکھا تھا، عورت اس پر کتنا بڑا احسان کر گئی تھی، اسے لفظ دان کر دیے تھے وہ تو لفظ تک بھول چکی تھی۔

”ہاں میں راستہ بھول گئی ہوں، مجھے راستہ ڈھونڈنا ہے اپنے گھر پہنچنے کا۔“ نشا دھیمے لہجے میں بولی، عورت کے چہرے پر ستائش ابھری۔

”خود تو پریوں کی حسین ہے، آواز بھی سریلی گھنٹیوں جیسی ہے، کتنی سوتی ہے یہ، آؤ میرے گھر آ جاؤ، کپڑے خشک کر دیتی ہوں، میرا میاں بس آنے والا ہے، وہ تمہارا گھر ڈھونڈ دے گا۔“ نشا کو اس پل اس عورت کا اپنے گھر میں پناہ دینا، غنیمت لگا تھا، اس نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اس پوری بستی میں صرف میرے گھر میں ڈرائر مشین ہے۔“ عورت کے لہجے میں فخر کی بھرمار تھی، نشا کو اس کی باتوں سے کوئی غرض نہ

تھی، اسے بس حسن کے گھر پہنچنا تھا کسی طرح، وہ اس کی بیوی تھی، اس کا گھر ہی اس کی منزل تھا اب اس کے گھر کا ایڈریس تو نہ جانتی تھی لیکن سوسائٹی کا نام جانتی تھی وہ، یقیناً عورت کا شوہر اس کو اس سوسائٹی میں پہنچا دے گا، اپنی سوچوں میں غلطیاں وہ عورت کے ہمراہ اس کے گھر میں داخل ہوئی، باہر کی نسبت اندر سے گھر صاف ستھرا تھا، نشا کو کچھ پل کے لئے سکون محسوس ہوا۔

”آؤ میں تمہیں اپنے کپڑے دوں، تمہارے ڈرائر میں خشک کر دیتی ہوں۔“ عورت نشا کو کمرے میں لے گئی، دھوپ دیواروں سے دبے پاؤں اتر کر صحن میں پھیل رہی تھی، سرد فضا نے دھیرے دھیرے گرم رکھا دیا تھی ٹھہرتے بدن سکون پائے، نشا بھی صحن میں آ بیٹھی اس کے تن پر عورت کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا، بیگ قیمتی متاع کی طرح اس کے سینے سے لگا تھا، تار پر نشا کے کپڑے پھیلائی عورت کا دھیان مسلسل اس کے بیک پر تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ عورت کپڑے پھیلا کر نشا کے لئے کھانا لے آئی تھی، اس کے سامنے چائے پانی پر کھانا رکھتے ہوئے عورت نے اس کا نام پوچھا۔

”میرا نام آزمائش ہے۔“ کھانے کو دیکھ کر نشا کی بھوک چمک اٹھی تھی، لیکن انجان جبکہ انجان عورت پر وہ بھروسہ کیسے کر لیتی، بے اختیار اس کے منہ سے اپنی بے بسی پر یہی نام نکلا تھا، یہ بھلا کیا نام ہوا، عورت تعجب کا اظہار کر گئی۔

”بس یہی نام ہے میرا۔“ نشا سر جھکا کر مدھم لہجے میں بولی۔

”اور اس بیک میں کیا ہے؟“ عورت نے تجسس کے ہاتھوں بالآخر مجبور ہو کر بالآخر استفسار کر ہی لیا۔

اس گھر سے نکلنے کی جلدی تھی نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس مسلسل کچھ غلط ہونے کا اشارہ دے رہی تھی۔

”بس آنے ہی والا ہے، راستے میں ہے، ابھی فون کر کے پوچھا ہے میں نے۔“ اس پہلے نشا کو اپنی بے وقوفیوں کا شدت سے احساس ہوا، کیا تھا اگر وہ فرح سے حسن اور شمیمہ آنٹی کے نمبر ہی لے لیتی اور محفوظ کر لیتی، تب اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، اس کے ساتھ یہ سب ہو سکتا ہے، اب اگر اس کے پاس نمبر ہوتا تو وہ عورت کے موبائل سے شمیمہ آنٹی سے رابطہ کر لیتی، حالات کے بدلنے ہی اس کے ذہن کی کھڑکیاں بھی کھلنے لگی تھیں، شاید یہ بھی قدرت کی جانب سے اس کی مدد تھی۔

”تم چائے پی لو، میں دوبارہ پوچھتی ہوں کال کر کے۔“ عورت اسے لمبے دم دیکھ کر رزمی سے بولی، نشا نے ہلکے سے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا، عورت نے واقعی اس پر احسان کیا تھا اسے گھر میں پناہ دے کر، لیکن اس کا دل کیوں انہونی کے خدشے سے لرز رہا تھا، اسے چائے نہیں پینا بھی نہ جانے کیسے احساس ہوا تھا اسے اس بلے، وہ چائے کا کپ اٹھا لے کچن کی جانب بڑھی تو کچن کے اندر سے عورت کی مدھم آواز میں اپنا ذکر سن کر وہیں ساکت ہوئی، اس کا وجود لرز اٹھا۔

”جلدی آ جا اب گھر، لڑکی کو چائے پلا دی ہے میں نے، چاند کا ٹکڑا ہے ٹکڑا، تم اسے اپنے ساتھ لے جانا اور پہنچا دینا اسے اس کی منزل پر، لیکن دام منہ مانگے لینا ہیرا بائی سے ایسی گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کی منزل ہیرا بائی کا کٹھا ہی ہوتا ہے، ہونہر کہہ رہی تھی راستہ بھول گئی ہوں۔“ عورت کی آواز اتنی دھیمی تھی نشا کو سننے کے لئے دروازے کے قریب ہونا پڑا، تو یہ تھا انجانا خدشہ

”اس میں میری ساری دولت ہے، بہت اہم ہے یہ میرے لئے۔“ نشا دل میں بولی تھی لیکن زبان سے صرف اتنا کہا۔

”بس کچھ ضروری چیزیں ہیں۔“

”چلو کھانا تو کھاؤ، بسم اللہ کرو، شکر جیسے ہی آیا، تمہارا گھر ڈھونڈنے تمہارے ساتھ چلا جائے گا، تو فکر نہ کرو۔“ عورت نے اپنی طرف سے بھرپور تسلی دی لیکن نگاہیں بیک پر مرکوز تھیں، نشا اتنی ہی پریشان کن سوچوں میں غلطاں، خود کو دیا گیا پہلا سبق اس پہلے بھول گئی، بھوک کے مارے اس کے پیٹ سے گڑ گڑا کر آوازیں بلند ہو رہی تھیں، وہ کھانا دیکھ کر صبر نہ کر سکی اور کھانے پر گویا ٹوٹ پڑی، بیک گود میں دھریا، کھانے کے بعد پیٹ اور بدن کو سکون ہوا، پیٹ کو خوراک ملی تھی اور بدن کو کھانے کی حرارت۔

”میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ عورت اسے کھانا ختم کرتے دیکھ کر مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی، نشا کو اس عورت کا نام پوچھنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی، اس کی چھٹی حس ہرگز اسے اچھا پیغام نہیں دے رہی تھی، عورت کے کچن میں جاتے ہی اس نے اپنے کپڑے چیک کیے، ہلکے ہلکے نم تھے لیکن اسے اپنے کپڑے ہی پہننا ہے وہ اپنے کپڑوں کو لئے واش روم میں گھس گئی، بیک اس ہمراہ تھا، جب عورت چائے لے کر آئی وہ اپنے کپڑوں میں ملبوس چار پانی پر بیٹھی تھی۔

”کپڑے بھی بدل لئے تم نے۔“ عورت نے حیرت سے استفسار کرتے چائے اسے پکڑائی۔

”جی!“ نشا چائے کا کپ تھام کر دھیرے سے بولی تھی۔

”آپ کا شو ہر کب آئے گا؟“ نشا کو اب

بھاگنا۔

”وہ کیا کرے، اللہ جی مدد کریں میری۔“

اس نے دل سے اللہ کو پکارا تھا اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان سے یہ نشا نے جان لیا تھا، جب اس نے خود کو لمحہ بہ لمحہ بستی سے دور بھاگتے دیکھا تھا اس کے پیچھے بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں کہیں دور رہ گئی تھیں، وہ بس بھاگ رہی تھی اور اسے اب نہیں رکنا تھا، اسے اللہ سے

اپنے لئے محفوظ ٹھکانہ چاہیے تھا، وہ کتنی دقتوں سے اس گھر سے نکلی تھی، عورت کو داش روم کی حاجت ہوئی تھی، وہ مطمئن تھی نشا جائے بیٹے ہی لڑھک جائے گی، خاوند کچھ آدمیوں کو لے کر آ رہا

تھا وہ اسے لے جائیں گی، عورت کے شوہر نے ہی کہا تھا وہ ہیرا ہانی کے آدمیوں کو لے کر آئے گا وہ سوئی ہوئی لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں گے، ورنہ لڑکی بھاگ بھی سکتی ہے، عورت کو بھی شوہر کی بات ٹھک لگی تھی، چونکہ وہ عورت داش روم کی کچھ ہی لمحوں بعد وہ گلی میں اندھا دھند دوڑ رہی تھی، عورت کا شوہر جو آدمیوں کے ہمراہ اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا، گھر سے لڑکی کو نکلتے دیکھ کر آدمیوں کو اشارہ کرتا بھاگا، لیکن لڑکی کے پاؤں میں گویا بارہا بھر گیا تھا، وہ ان کے ہاتھ سے یوں نکلتی گئی گویا چلتی پھلتی مچھلی ہاتھ سے پھسلتی ہے، وہ بھاگ بھاگ کر ہاپنے لگے۔

وہ پانچویں مرد واپس لوٹ چکے تھے، اللہ نے نشا کی مدد کی تھی اور اللہ اپنے بندوں کو بھی تنہا نہیں چھوڑتا، نشا اللہ سے دعا کرتی بھاگ رہی تھی، اسے نہیں ٹھہرنا تھا، اسے تھکنا بھی نہیں تھا دنیا تو ساری کی ساری ظالم تھی، انسانوں کے روپ میں بھیڑیے تھے، جو مجبور یوں کا فائدہ اٹھانے بیٹھے تھے، نشا سمست کا تعین کیے بغیر بھاگتی مین سڑک پر آ گئی، سڑک پر اکا دکا گاڑیاں آ

اور چھٹی حس یوں ہی تو بے چین نہ تھی، اس کے ساتھ بہت غلط کرنے والی تھی یہ عورت، اسے اس گھر سے نکلتا تھا اب، عورت کا ارادہ اس کو بچنے کا تھا، وہ تو اس کو آسانی سے تو نکلنے نہ دے گی، نشا نے بجلی کی سی تیزی سے داش روم کے باہر بنے بنس میں چائے گرا کر پانی بہا دیا اور خالی کپ تھا سے چار پانی پر آ بیٹھی، اسے اپنے حواس اب قائم رکھنے تھے۔

”پی لی جائے۔“ عورت اپنے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی کچن سے نکل کر نشا کی جانب بڑھی، نشا جواباً دھیسے لہجے میں بولتی پھیکا سا مسکراتی۔

”تم کمرے میں آرام کر لو، بس بستی میں داخل ہونے ہی والا ہے میرا شوہر۔“ عورت اب کہہ سرشار تھی، نشا کے وجود میں گویا خطرے کے الارم بجنے لگے۔

”میں یہیں ٹھیک ہوں، جیسے تمہاری مرضی۔“ عورت کہہ کر کمرے میں چلی گئی، نشا نے بے بس نگاہ آسمان کی جانب اٹھائی تو دل دھک سے رہ گیا، کالے بادلوں نے ساری روشنی دھوپ کی گرمی نکل لی تھی، سورج نے کالے بادلوں کی چادر کیا اوڑھی ہر سوسردی اپنی ٹھنڈک بانٹنے لگی۔

”اف، ایک اور رات برستی بارش میں۔“ کالے بادلوں کے تیور بتا رہے تھے، وہ برس کو چھوڑیں گے۔

”اندر آ جاؤ لڑکی، ٹھنڈک لگ جائے گی۔“ سہ پہر کے تین بجے ہی گویا رات چھانے لگی ہے، عورت برآمدے میں کھڑی بولی، اسے نشا کا نام پسند نہیں آیا تھا یہ بھی بھلا کوئی نام ہے آزمائش، نشا بے بسی بھری نگاہوں سے عورت کو دیکھ کر رہ گئی، اسے یہاں سے فرار ہونا تھا، عورت کا شوہر آ جاتا تو اس کے لئے مشکل ترین ہو جاتا اس گھر سے

رہی تھیں، دہلی پتلی نشا جو سارا دن گھر کے کام کاج میں کولہو کے تیل کی طرح جتی رہتی تھی، اس نے دوڑنے سے اب تھکا دیا تھا، مین سڑک بار کرتی وہ دائیں طرف سے آنے والی گاڑی نہ دیکھ سکی، گاڑی میں بیٹھے دو نفوس نے غصے اور طیش سے اس سر پھری لڑکی کو دیکھا تھا جیسے خود کشی کرنے کو ان کی گاڑی ہی ملی تھی، گاڑی کے ڈرائیور نے لڑکی کو ٹکر سے بچانے کے لئے پوری قوت سے بریک لگائی تھی، ٹائروں کی چڑچڑاہٹ نشا کے اوسان خطا کر گئی، اس کے قدم وہیں منجمد ہو گئے، اسے اب ادراک ہوا تھا اس گاڑی کا، گاڑی رکتے رکتے بھی نشا نرم و نازک وجود سے ٹکرائی، دلخراش چیخ تھی جس نے گاڑی میں بیٹھے دونوں نفوس کو اس باخنیہ کر دیا تھا وہ بوکھلا کر گاڑی سے نکل کر سڑک پر گر گئی ہوش و خرد سے بیگانہ لڑکی کی طرح بھاگے تھے، لڑکی کے سر پر چوٹ آئی تھی، گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں، لڑکی کے سر کے پچھلے حصے پر خون بہہ رہا تھا۔

”اب کیا کریں گا مڑ، کتنی بار کہا ہے اتنی ریش ڈرائیونگ نہ کیا کرو، اب اگر یہ لڑکی مر رہی ہو تو“ بولنے والا گھبراہٹ اور جھنجھلاہٹ کی انتہا پر تھا۔

”کوئی نہیں مری، زندہ ہے۔“ جواب دہ بے زاری سے گویا ہوا، اس کے ہاتھ لڑکی کی نبض پر تھے۔

”پھر بھی اب ہسپتال تو لے جانا پڑے گا اور بھابھی مجھے گھر میں گھسنے نہ دیں گی اگر مزیدیر ہوئی تو۔“

”ارمان صاحب اب یہ وقت غصہ کرنے کا نہیں ہے، اس لڑکی کو ہسپتال لے کر چلتے ہیں، پکا پراس اب گاڑی آہستہ چلاؤں گا۔“ بے زار لہجہ شریر ہوا۔

”اب تو آہستہ گاڑی چلائے گا، جب مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔“ ارمان نے تابش کی گردن دیوچ لی، اسے یقین تھا، غلطی سراسر تابش کی ہے، نہ وہ اتنی بری ڈرائیونگ کرتا نہ یہ لڑکی گاڑی کے سامنے آئی، اس کی بھابھی اس کے آنے جانے کے اوقات کو انگلیوں پر گنا کرتی تھیں، اسے رات کے آٹھ بجے ہر صورت گھر ہونا تھا اور اب اس لڑکی کو ہسپتال لے جانا، وہ جھنجھلاتا نا تو اور کیا کرتا۔

”او کے اب غصہ تھوک بھی دو، مان لیا میری غلطی ہے، اب اس لڑکی کو اٹھاؤ اور پچھلی سیٹ پر لٹاؤ، ہو سکے تو اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ جاؤ۔“ تابش نے اپنی بات مکمل کی تو بچی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹا تھا ورنہ ارمان کا مکہ اس کا جبراً توڑ دیتا، وہ جان گیا تھا ارمان کو کس بات کی تپ چڑھی ہے۔

”تو بھی ہر وقت بھابھی کے خوف کو سر پر سوار نہ رکھا کہ، اتنی ناکس ہیں وہ، چل اب اٹھا اس مصیبت کو۔“ تابش بھی بدلچاٹی سے گویا ہوا تھا۔

”ویسے ثابت تو مصیبت ہی ہوئی ہے، کاپی بلی کی طرح راستہ کاٹ دیا، اب ہسپتال کی ڈیوٹی بھگتاؤ۔“ ارمان بدلچاٹی میں کیونکر پیچھے رہتا، دونوں دوست ہی اس پل نی مصیبت سے خاصے بے زار ہوئے تھے، نشا کا بے ہوش وجود دونوں کی سنگدلی پر اوندھا پڑا تھا۔

”ویسے ارمان ہم دونوں میں انسانیت نام کی بھی نہیں ہے، ایک زخمی وجود ہمارے سامنے پڑا ہے اور ہم اسے مصیبت کہہ کر جان چھڑانے کے چکر میں ہیں، مجھے اچھی خاصی شرم آگئی ہے، تو بھی کچھ شرم کھالے، لڑکی اٹھا اور پچھلی سیٹ پر لٹا دے، جلدی کر، کہیں سچ مچ ہی نہ مر جائے۔“

تابش غلٹ میں گویا ہوا۔

”یہ لڑکی کی پرسنل چیزیں ہوں گی۔“ وہ کیوں دیکھتا۔

”یار شاید اس میں کوئی نام پتہ مل جائے ہمیں لڑکی کا، اگلی لڑکی، آخر کچھ تو علم ہو گا نا۔“ تابش بھند تھا کہ بیک چپک کیا جائے۔

”مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا، بہتر ہے لڑکی کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا جائے، خود ہی بتا دے گی اپنے متعلق اور میرے بھائی گاڑی تیز چلاؤ پہلے ہی لالچتی، ہم گفتگو میں لڑکی کو کافی اگنور کر چکے ہیں، کہیں کچھ سیریس معاملہ نہ ہو جائے۔“ اب کہ ارمان کے لہجے میں شدید تنکڑ تھا، تابش نے چونک کر اپنے جگری بچپن کے دوست کو دیکھا تھا، دور آسان پر کالے بادلوں نے طمانیت سے گاڑی کی بچھلی سیٹ پر لیٹی لڑکی کو دیکھا تھا اور پھر اپنے ٹل کھول دیے تھے، پانی کی جلتنگ نے ہر سوساں سا باندھ دیا، بھگیا بھگیا سا بدھیر ہے، ارمان ہر طرف جل تھل ہوتی دیکھ کر گنگنا اٹھا تھا، نگاہ بے اختیار پچھلی سیٹ پر ہوش و خرد سے بیگانہ وجود پر پڑی تھی۔

☆☆☆

”کتنا سکون ہے اب گھر میں ندیم میں بتا نہیں سکتی، نشا ہمیشہ کے لئے دفغان ہو گئی، میں تو چپ جب اس کو اس گھر میں چلتے پھرتے دیکھتی تھی، میرا خون کھولی اٹھتا تھا ماں باپ کے ساتھ ہی مر جاتی، میرے راستے کا کائنیا لا خراب میں نے نکال ہی پھینکا۔“ لاؤنج میں قیمتی دبیر صوفے میں دھنسی سمیرا بیگم کی سفاکیت پر شیطان مسکرایا تھا، سمیرا بیگم کی زہر افشانی پر لاؤنج میں ڈسٹنگ کرتی فرح کے چہرے پر دکھ بھری مسکراہٹ ریگ گئی، کتنا تڑپ تڑپ کر روئی تھی وہ جب اسے علم ہوا تھا سمیرا بیگم نشا کو کہیں چھوڑ آئیں

ہے۔

”کہہ تو ٹھیک رہا ہے۔“ ارمان کہہ کر نشا کی جانب بڑھا، اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے کچھ پل کے لئے جھجک اڑے آئی لیکن انسانیت کا نمبر پہلا ہے، یہی سوچ جھجک غائب کر گئی، ارمان نے نرمی سے نشا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جونہی سیدھا کیا، وہ پلکیں جھپکنا بھول گیا، مکمل خوبصورتی، ملکوتی حسن کی ملکہ تھی یہ لڑکی، جو اس کے سامنے بے ہوش پڑی تھی، ارمان نظر باز قسم کا لڑکا نہیں تھا، اس نے تو کبھی کسی اجنبی لڑکی کو کالج میں سلام تک نہ کیا تھا، بھابھی نے اس کی تربیت ہی ایسی کی تھی وہ ہر صنف نازک کا احترام کرتا تھا، اس لڑکی کے حسن میں ایسا جادو تھا کہ ارمان اس پر سے نظر تک نہ ہٹا سکا۔

”کیا ہوا اب تجھے، سب کیوں سو گھ گیا ہے جلدی لے آئے۔“ تابش ہارن بجاتے ہوئے چہرہ کھڑکی سے باہر نکال کر دھاڑا، ارمان نے چونک کر تابش کو دیکھا، تابش کو اس پل کے جانے کیوں لگا ارمان اپنے حواسوں میں نہیں ہے، ارمان نے لڑکی کے بے ہوش وجود کو نرمی سے اپنی ہانہوں میں موم کی گڑیا کی طرح اٹھا لیا، لڑکی اتنی نرم و نازک تھی، اریان کچھ پچھلی سیٹ پر لٹاتے معمولی سی بھی وقت نہ تھی، نشا کا بیک سرک پر پڑا رہ گیا، فرنٹ ڈور کھولتے ارمان کی نظر اس بیک پر پڑی تو وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیک کی جانب بڑھا، بیک اٹھا کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تو تابش نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”ارمان یار اس بیک کو چپک کر، کچھ پتہ تو چلے یہ لڑکی کون ہے۔“ تابش نگاہیں وڈسکرین کے پار سرک پر جمائے بولا۔

”نہیں یار اچھا نہیں لگتا۔“ ارمان تذبذب کا شکار ہوا۔

”وہ نشا کو فرح کے کوارٹر میں بھیج دیتی نہ رکھتی، اپنے گھریلو در بدر تو نہ کرتی، نہ جانے کس حال میں ہوگی نشا، اس فرعون صفت عورت نے کبھی اس کے ذہن و دل کو خوف سے آزاد ہی نہ کیا تھا، اب وہ دنیا کے جنگل میں جا رہی تھی۔ درندہ صفت انسانوں کا مقابلہ کیسے کرے گی۔“ اس کا دل درد سے پھنسا جا رہا تھا، سمیرا بیگم نے نشا کی باقی ماندہ چیزیں فرح کو دان کر کے کمرہ خالی کر دیا تھا، فرح کا دل اب اس محل نما گھر سے بے زار ہو گیا تھا، وہ اپنی امی سے کہہ کر یہاں سے ہمیشہ کے لئے چھپ جائے گی، دل پر رتے آنسوؤں کا بوجھ ناقابل برداشت ہونے لگا تھا، سمیرا بیگم ابھی تک موبائل فون کان سے لگائے بیٹے سے محو گفتگو تھیں، فرح نے باتوں سے ہی اندازہ لگایا تھا، ان کا خفیہ بیٹا آج کل میں واپس آنے والا ہے، سمیرا بیگم نے کال منقطع کی تو ان کے چہرے پر بہار رقصاں تھی۔

”فرح نمرہ ثمرہ کو بلا کر لاؤ فوراً۔“ لہجہ کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی، فرح تھکے تھکے قدموں سے حکم بجالانے نمرہ ثمرہ کے کمرہ کی طرف بڑھی ہی تھی کہ سمیرا بیگم کے گھر درے الفاظ اس کے قدموں کی رنجیر ہوئے۔

”پر تم نے کیوں منہ لٹکا رکھا ہے کل سے، سوگ منارہی ہو اپنی سبیلی کا جواب تک یا تو مر کھ گئی ہوگی یا پھر کسی کے ہتھے چڑھ گئی ہوگی، اپنی شکل سیدھی رکھو ورنہ دونوں ماں بیٹیوں کو بھی چلتا کر دوں گی، میرا بیٹا میری کر دہنتی بہو لے کر آ رہا ہے، میں تم دونوں ماں بیٹیوں کے منہ سے اب نشا کا تذکرہ نہ سنوں بھی۔“ سمیرا بیگم نے سرد انداز میں انگشت شہادت اٹھا کر وارن کیا تھا، فرح کے اندر جوار بھانا ابلنے لگا۔

”یہ عورت اتنی ظالم اور جابر کیوں تھی،

بیٹیوں وان تھی پھر بھی، نشا کا ذرا ترقی قدرت سے اور اب میں بہو بے کر رہا تھا، نہ کی خوشیوں کو۔“ سمیرا بیگم نے نشا کو در بدر کی ٹھوکروں کے سپرد کر کے بھی خوش نہ رہ سکے نہ یہ عورت۔“ فرح کا دل درد ہی تھا، بچپن سے جونی تک نشا اور فرح ساتھ رہی تھیں۔

”جونی بھی رکھو تو اس سے بھی نیست ہو جاتی وہ، یہ کسی عورت ہے جو نشا کو جونی سے بھی بدتر سمجھ گئی۔“

”اب بت کیوں بن گئی ہو، دفعہ بوجہ دو کر دو، نمرہ ثمرہ کو۔“ سمیرا بیگم کے سرد منہ زمیں طیش کے سرے رنگ بھر گئے، فرح کا جذبہ بھی جواب دے گیا۔

”جاری ہوں میں اومیری۔“ رات کے اس زمانہ سے، آپ تو عورت کے نام پر دھبہ ہیں، اتنی خالص اتنی سفاک کوئی حد ہے آپ نہ، آپ رب کو بھول چکی ہیں سمیرا بیگم، میں رب آپ کی شرانگیزی نہیں بھول، رب کچھ نہیں بھولتا، آپ کا ایک ایک قلم پت رات کے لئے آئے گا، تب تب سمیرا بیگم آپ کی روح کو آپ کے بدن سے خدھی صرف نشا نہ معافی ہی دے گی، یہ درکھیے گا میری بات۔“ فرح کا لہجہ پھٹ سا گیا تھا، سمیرا بیگم کے اندر فرح کی باتوں نے گویا لاؤاد ہکا دیا۔

”گنت ہے تیری ہڈی پہلی ایک کرنی پڑے گی، مجھے باتیں سن میں تم نے، مجھے، اوقات دیکھی ہے اپنی تو نے، تیری جرأت کیونکر ہوئی ہے غیرت لڑکی۔“ سمیرا بیگم غصے اور طیش کے رے آپ سے باہر ہو کر فرح کو مارنے کے لئے لپکیں۔

لاؤنچ میں اس وقت ان دونوں کے عداوہ دو ملازماں بھی کام میں مصروف تھیں، فرح کی

یہ تو ب میں صداقت تھی یہ ان کے دل کی گواہی تھی، مگر اب یہ سمیرا بیگم کے عتاب سے نہ بچے گی انہیں یقین تھا، سمیرا بیگم نے جو نبی فرح کے بال پکڑ کر بے دردی سے کھینچنے چاہے، فرح سرعت سے پیچھے ہٹی، لہجہ استہزا سیہ ہوا۔

”میں نشا نہیں ہوں سمیرا بیگم، فرح ہوں، میری ماں میرا باپ ابھی زندہ ہے، یہاں کام کرنے کی تنخواہ لیتے ہیں، ظلم سہنے کی نہیں۔“ سمیرا بیگم کے تو سر پر مٹی اور پتوں پر پڑھی، یہ لڑکی انہیں آئینہ دکھائے جا رہی تھی، جس میں ان کی شکل کریہہ ترین تھی وہ کسے برداشت کرتیں۔

”مجھے تو میں اب مار کر ہی دم لوں گی، کسے پیسے کی تیری ماں۔“ سمیرا بیگم غصے اور طیش میں ٹپ اڑانے لگیں، نمرہ شرمہ بھی لاؤنج میں بلند ہوئی آوازوں پر بھاگ کر لاؤنج میں آئیں۔ فرح کو ماں کے ساتھ زبان درازی کرتے دیکھ کر دونوں کا خون کھول اٹھا تھا، فرح ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائی، آگے لگانے والی، دل جلانے والی مسکراہٹ۔

”یہ دونوں آباد ہو گئیں اپنے گھروں میں تو میرا نام بدل دینا۔“ تینوں ماں بیٹیاں فرح کی بددعا پر طنزیہ ہنسی ہنس دیں۔

”تم نے جتنی بکواس کرنی تھی کر لی، اب اپنی ماں کو لو اور یہاں سے ابھی کے ابھی دفع ہو جاؤ، میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی، ایک نوکرانی کے منہ لگوں یہ میری شان نہیں، جاؤ تم اپنی اوقات کے مطابق ہی بولو گی۔“ سمیرا بیگم نے ہل میں خود کو ٹھنڈا کیا تھا، ان کا غصہ ان کا مزید تماشا بنا سکتا تھا ملازمین کے سامنے اور وہ سب ملازم نکالنا انور ڈونمیں کر سکتی تھیں۔

”خوشی غارت کر کے رکھ دی میری۔“ سمیرا بیگم تنفر سے بڑبڑائیں۔

فرح تینوں پر زہریلی نظر ڈال کر لاؤنج سے نکل گئی، شام کے ڈوبتے سورج نے دونوں ماں بیٹی کو بیس سال بعد اس گھر سے جاتے دیکھا تھا، ان کا ٹھکانہ ان کا گھاؤں تھا، جہاں فرح کا بوڑھا باپ رہتا تھا، گھرانہ کا اپنا تھا لیکن فرح کا باپ کما نہیں سکتا تھا، بیوی کما کر بھیجتی تھی، اب خود ہی اندر رزق کا سبب بنا دے گا، دونوں ماں بیٹیاں مطمئن تھیں۔

☆☆☆

”آئی حسن اب کیسا ہے؟ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔“ ثمنین بیگم ہسپتال کے جو طویل کاریڈور میں صاف شفاف چمکتی ٹائلز پر نگاہیں جمائے دگر فٹہ پیٹھی تھیں، مضطرب، بے چینی بھری آواز پر تڑپ کر سراٹھایا تھا، عریشہ اپنے چہرے پر دنیا جہاں کی بے تابی سموائے ان کے سامنے کھڑی تھی، ثمنین بیگم کے دل سے ہوک اٹھی۔

”کاش۔“ اس کاش کے آگے وہ کیا سوچتیں، تقدیر میں یہی لکھا تھا۔

”آئی بتائیے نا۔“ عریشہ نے ثمنین بیگم کی خاموشی پر ان کے قریب بیٹھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ڈاکٹر کہتے ہیں دعا کرو، وہ میں کر رہی ہوں، کوئے سے باہر وہ کبھی بھی آ سکتا ہے، دن بھی لگ سکتے ہیں، مہینے بھی اور سال بھی، یہی کہا ہے ڈاکٹر نے۔“ ثمنین بیگم کا لہجہ تھا کٹھن آواز نا مسلسل رونے کے باعث بیٹھ سی گئی تھی، زریںہ اور تیمورا بھی کچھ دیر قبل گھر گئے تھے، وہ ماں تھیں، ایک پل کے لئے بھی یہاں سے گھر جانا گوارا نہ تھا۔

”آئی حسن کو کچھ نہیں ہوگا، وہ ضرور صحت یاب ہوگا، ماں کی دعا تو عرش تک جا پہنچتی ہے۔“ عریشہ نے ثمنین بیگم کے سر ہاتھ اپنے نرم ہاتھوں

میں لے کر ہو لے سے دبا کر تسلی دی۔
 ”خوش رہو عریضہ، حسن بس ٹھیک ہو جائے،
 میں اب کوئی غلط فیصلہ نہیں کروں گی۔“ ثمنیہ بیگم
 کو عریضہ ابھی بھی اتنی ہی پسند تھی، نہ جانے حسن کو
 کیا سوچھی، اپنی بچپن کی دوست جو زندگی کے ہر
 قدم پر اس کے ساتھ رہی تھی گھر بھی ساتھ ساتھ
 تھے، ہر وقت کا ملنا ملنا اور پسند نداشت آگئی۔

عریضہ پر تو قیامت گزر گئی تھی ثمنیہ بیگم کو بھی
 دھچکا لگا تھا، حسن کی بات پہلے پہل ماننے میں تو وہ
 متامل تھیں لیکن جب حسن کا اصرار دیکھا تو بیٹے
 کی خوشی کو مقدم جانا، لیکن بیٹے کی خوشی دیکھنے کی
 بجائے، وہ اپنے بیٹے کو ہاسپٹل میں بے حس و
 حرکت پڑے دیکھتیں تو ان کا کچھ کہنے لگتا، انہوں
 نے ایک بار بھی نشا کی خیریت دریافت کرنے کو
 کال نہ کی تھی، سمیرا بیگم نے بھی اس کے بعد کوئی
 کال نہ کی تھی، ثمنیہ بیگم اس گھرانے پر بھت بھیج
 چکی تھیں، اب حسن کا کیا فیصلہ ہوگا، حسن ہی جانتا
 سکتا تھا، لیکن حسن کو مے سے باہر تو آئے وہ
 سسک اٹھیں، عریضہ نے اپنے دل مضطر کو توڑتے
 شدت سے محسوس کیا تھا، وہ ثمنیہ بیگم کے وجود کو
 اپنے ساتھ لگا کر ان کے کندھے پر سر رکھ کر
 آنسو ٹپکنے بند کر چکے تھے، دونوں کا دکھ ہسپتال کے
 بام و در نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

”کیسی کنڈیشن ہے اب نشا کی۔“ ارمان
 نے ڈاکٹر کے باہر نکلتے ہی بے تابگی سے استفسار
 کیا، ہاسپٹل میں لڑکی ایڈمٹ کروانے کے بعد
 بالآخر اس نے لڑکی کا بیگ تابش کے اصرار پر
 کھول ہی لیا، لڑکی کے بیگ میں تصاویر تھیں۔
 ”عورت کی شکل نشا سے بہت ملتی تھی، یقیناً
 پہ نشا کی مما ہوگی۔“ ارمان نے خود ہی قیاس آرائی

کی، تابش نے بھی تائید کی تھی، نشا کے ڈاکومنٹس
 تھے، وہیں سے دونوں کو نشا کا نام پتہ چلا تھا،
 ڈاکومنٹس پر درج ڈیٹ آف برتھ والے خانے کو
 دیکھ کر انہیں علم ہوا تھا لڑکی محض سترہ سال کی ہے،
 اس پر ایسی کون سی مصیبت آگئی جو یہ گھر سے
 بھاگی، گھر کا ایڈریس بھی درج تھا اس پر، یہ دیکھ
 کر دونوں نے سکون کا سانس لیا تھا، وہ ٹرٹی کو
 اب گھر پہنچ سکتے تھے، لیکن وہ ہوش میں تو آئی،
 وہ تو گہری نیند کے نور پر نگی ہوئی تھی، دونوں
 دوست بے چینی سے ادھر ادھر مبل رہے تھے،
 بھوک کے مارے آنتیں خوب آیات قرآنی کا
 ورد کر کے ان کو بخشنا نے پر لگی ہوئی تھیں، بالآخر
 اللہ اللہ کر کے روم سے ڈاکٹر نگی تھی، ارمان کے
 استفسار میں بے تابگی اور بے صبری دونوں کا عنصر
 تھا۔

”آپ کی مریضہ کو ہوش آ گیا ہے، چوٹ
 اتنی شدید نوعیت کی نہیں تھی، بے ہوش وہ خوف
 اور صدمے کے زیر اثر ہوئی تھیں، اب آپ ان
 سے مل سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر پیشہ ورانہ انداز میں ان
 کو تفصیل بتا کر ایک طرف بڑھ گئی، ارمان نے
 تابش کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا، دونوں
 دوست دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے، تو نشا
 کے چہرے پر ہراس کے بادل آن واحد میں
 چھائے تھے، دونوں نے اس ہراس لڑکی کو کچھ
 دکھ اور کچھ غصے کی ملی جلی کیفیت اسے دیکھا تھا،
 دکھ اس بات کا تھا نہ جانے اس لڑکی کے ساتھ کیا
 ٹریجڈی ہوئی تھی جو یہ گھر سے نگی، کیونکہ لڑکی
 انتہائی معصوم تھی، غصہ اس بات کا تھا، وہ اس کے
 اماں ابا بنے باہر کب سے اس کے ہوش میں آنے
 کا دیٹ کر رہے تھے۔

”آپ ہم دونوں کی گامی سے کمرائی تھیں،
 آپ نے ہمارا اچھا خاصا نقصان کر دیا لیکن چلیں

کوئی بات نہیں، ہم بڑے عظیم انسان ہیں، کسی کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتے، اب آپ بتائیے، کہ آپ کیوں ہماری گاڑی سے ٹکرائی تھیں۔“ ارمان نے خاصے مضحکہ خیز انداز میں بات شروع کی تھی، تابش اس کی رگ رگ سے واقف تھا، سو مطمئن کھڑا تھا۔

”میں جان بوجھ کر آپ کی گاڑی سے نہیں ٹکرائی۔“ نشا دونو جوان لڑکوں کو اپنے سر پہ کھڑا دیکھ کر اچھی خاصی بوکھلائی تھی، اوپر سے بولنے والے کا انداز، وہ رووینے والی ہوئی۔

”اب میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی، جو آپ رونے لگیں۔“ ارمان کو اس کی بڑی بڑی حسین آنکھوں اترنے پانی نے خود میں ڈبویا تھا، لہجہ آؤ آپ نرم ہوا تھا، تابش سمجھ گیا تھا نشا نامی لڑکی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہوگا، وگرنہ لڑکی ایسی کو کیسی نہ لگی تھی اسے، وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا نشا کے بیڈ کے قریب کھڑا ہو گیا، نرمی اور احساس بھرا ہاتھ نشا کے سر پر رکھا، ارمان نے بہنوں کی سیلبر کر تابش کو گھورا تھا، کچھ دل کو چھینا تھا، دل بھی بڑا ذفر ثابت ہوا تھا اس کا، اس کی نیکی سالہ زندگی میں کبھی پڑی سے نہ اتر ا تھا اور اب ایک انجان لڑکی کو دیکھتے ہی لٹو ہوا جا رہا تھا۔

”تجھے تو میں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔“ اس نے دل کو تھوڑی دھمکی دی تھی، لیکن یہ تابش کیوں اس کے سر پر جا کھڑا ہوا ہے، دل نے اس کی دھمکی کسی خاطر میں نہ لائی تھی، تابش کی حرکت سوئی کی مانند چھپی تھی، حالانکہ تابش حال ہی میں شادی شدہ ہوا تھا، تابش نرمی سے گویا ہوا تو ارمان کے دل کو چھیتی سوئی یک لخت نکلی اور ارمان کو پرسکون کر گئی، تابش کے الفاظ پر ارمان کے اب کان پوری طرح متوجہ تھے۔

”ہم آپ کا بیک کھول کر دیکھ چکے ہیں،

آپ ہماری بہنوں کی طرح ہیں۔“ اس بات پر ارمان بری طرح کھانسا تھا۔

”تابش بہن بیٹا لے میری بہن نہ بنائے۔“ دل نے پھر دہائی دی تھی، ارمان دہائی پر کان لپیٹے تابش کی سننے لگا۔

”آپ بتائیں ہمیں کہ آپ کیوں گھر سے نکلیں، ہم آپ کو گھر بھی چھوڑ آئیں گے، آپ پریشان نہ ہوں، میں تابش ہوں، یہ میرا دوست ارمان ہے، ہم دونوں دوست آج ڈنر پر جا رہے تھے، آپ ہماری گاڑی کے سامنے آ گئیں، اب آپ بتائیں اپنے متعلق۔“ تابش کے بہن کہنے پر نشا کے آنسو چھلک پڑے، کاش اس کا بھی بھائی ہوتا وہ یوں بے سائبان تو نہ ہوتی، ارمان کا دل اس کے بہتے آنسوؤں پر پھر بے چین ہوا تھا۔

”پلیز بہنا، ہم ہسپتال میں ہیں، ہمیں گھر بھی جانا ہے، ہم آپ کو یوں چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے، آپ کچھ بتائیں گی تو ہم وہی کریں گے جو آپ چاہیں گی۔“ نشا کا دل تابش کی خلوص بھری باتوں پر ایمان لے آیا تھا، اس کے دل کی گواہی اور چھٹی حس نے اب تک اس کا ساتھ دیا تھا، اب چھٹی حس خاموش تھی۔

”یقیناً ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔“ نشا کو جب دیکھ کر ارمان نے کندھے اچکا کر تابش سے آنکھوں ہی آنکھوں میں استفسار کیا۔

”یہ اب چپ کیوں ہے بولتی کیوں نہیں۔“ تابش نے جواباً نگاہوں ہی نگاہوں میں دھیرج رکھنے کو کہا تھا، ارمان کے موبائل پر بھابھی کا کال آنے لگی تو اس کا رنگ فق ہوا، سرعت سے کال پک کی۔

”السلام علیکم بھابھی، میں بس ابھی آیا، وا تھوڑا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ارے نہیں نہیں بھابھی میرا نہیں ہوا، زخمی کو ہسپتال پہنچایا ہے اس کے

تابش کے علم میں تھی، ارمان کا دل لمحہ پہ لمحہ ڈوب رہا تھا۔

لائی بے قدر اس تال یاری
تے مٹ گئی تڑک کر کے
اس کا دل کر لایا تھا، لیکن کسی کے نکاح میں
موجود لڑکی پر اس نے دوبارہ نظر بھی نہ ڈالی تھی،
جتنا دیکھتا تھا اس کے کسی کے منکوحہ ہونے کی
اطلاع دینے سے پہلے وہ دیکھ چکا تھا، اب اسے
ہرگز نہیں دیکھنا تھا، وہ کسی کی امانت تھی اور ارمان
ملک خائن نہیں تھا۔

☆☆☆

”میری بہو تو لاکھوں میں ایک ہے، ماشاء
اللہ، ندیم تم نے تو میرا دل خوش کر دیا، میرا سارا
ملا ماہ نور کو دیکھ کر جھک سے اڑ گیا ہے، تم نے
اپنی شادی میں اپنی ماں اور بہنوں کو شام تک
بٹھایا مجھے یہی ملا تھا۔“ سمیرا بیگم کا جب
شہر آیا تو سمیرا بیگم، بہو ایک تو حسین و جمیل اور پر سے
دولت مند، ندیم نے نکاح کی رخصتی سے قبل شادی
کر لی تھی، جیسے ہی سمیرا بیگم نے نکاح کے ہمیشہ کے
لئے گھر سے جانے کی بات بتائی، تب ندیم نے
اپنی شادی کرنے کا ارادہ اٹھ لیا، وہ ماہ نور کوئے
آج صبح کی فلائٹ سے پاکستان پہنچا تھا، تب
سمیرا بیگم بہو کی تعریفوں کے پل باندھ رہی
تھی، نمرہ اور ثمرہ کو بھی بھابھی بہت پسند آئی تھی،
ندیم تو ماں بہنوں کی آنکھوں میں ستارش اور فخر کا
سمندر ماہ نور کے لئے موزن دیکھ کر صوفے پر
اڑ کر بیٹھا تھا، گویا ماہ نور کے خوبصورت اور
دولت مند ہونے میں اسی کا کمال ہو، بہو بیگم کو کل
جیسا گھر تو بے حد پسند آیا تھا، لیکن سس اور
نندیں کچھ خاص پسند نہ آئیں تھیں، وہ خود
چالاک فطرت لڑکی تھی، انگلیں کے آزاد، حول
میں پل بڑھی۔

فیملی ممبرز کا انتظار ہے جو نہیں وہ آئے میں آ جاؤں
گا، آپ بے شک تابش سے پوچھ لیجئے گا، وہ تو
آپ کے نزدیک ذمہ دار انسان ہے نا، وہ بھی
اس وقت میرے ساتھ ہے، اوکے بھابھی میں
جیسے ہی فارغ ہوا، گھر ہی آؤں گا، آپ فکر نہ
کریں۔“ ارمان نے کال منقطع کی تو روٹن چمکتی
پیشانی سے نا دید پسینہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے
پونچھا۔

”بچت ہو گئی تابش، اب محترم آپ جلدی
سے بتا دیں آپ کون ہیں، کیوں ہیں، کہاں سے
ہیں؟“ ارمان کی زبان پھر چل پڑی، نشا نے
حیرت سے اس نمونے کو دیکھا جو جب بھی بولا تھا
عجیب ہی بولا تھا۔

”نشا بہنا جلدی سے بتا دو، ارمان کی
بھابھی آٹھ بجے کے بعد ارمان کے گھر پہنچنے کے
بعد اس کی پہلے خوب کلاس لیں گی، اب تم ارمان
پر رحم کھاؤ اور شروع ہو جاؤ۔“ وہ ساری رات تو
ہاسٹل میں رہ نہیں سکتے تھے، نشا نے اپنی کہانی
مختصر الفاظ کہہ ڈالی، نکاح کے نکاح کی خبر پر ارمان
کا دل ایسا خاموش ہوا پھر دہائی شرارت پر آمادہ نہ
ہوا۔

”تو پھر اب آپ کو کہاں چھوڑیں۔“ تابش
کو حقیقتاً دکھ پہنچا تھا نشا کے حالات زندگی سن کر،
اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی تکلیفیں جھیلی تھیں اس
معصوم لڑکی نے۔

”میں حسن کے گھر جانا چاہوں گی، میں اس
کی بیوی ہوں، وہ مجھے ضرور اپنے گھر میں رکھے
گا۔“ نشا کو حسن کے گھر پہنچنے کی جلدی تھی، وہ ان
دونوں کی احسان مند تھی، وہ اللہ کی شکر گزار تھی
جس نے ان دونوں کو رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا
تھا، کچھ ہی دیر بعد وہ ان کے ساتھ گاڑی میں
بیٹھی تھی، وہ حسن کی سوسائٹی کا نام بتا چکی تھی جو

ندیم سے شادی کر کے اس نے گھائے کا سودا نہیں کیا تھا، دولت کی ریل چل، گاڑیاں، پھلتا پھولتا بزنس، شاندار گھر، نوکر چاکر، ماہ نور کے منہ میں تو پانی بھرے جا رہا تھا، ندیم کو اس نے اپنی جھوٹی امارت کے خوب قصے سن کر پھنسا یا تھا، ندیم اس کی خوبصورتی اور اداؤں پر تو مری مٹا تھا لیکن فطرت وہ لا لچی تھا، وہ ماہ نور کے ساتھ صرف وقت گزارتا جا چتا تھا شادی کرنا نہیں، شادی اسے دولت مند لڑکی سے ہی کرنی تھی ماہ نور اس کا لالچ بھی نہ گئی، تب اس نے اپنے ماں باپ کو خوب سکھا کر ندیم سے موا دیا، ماں بڑھنوی تھی تو باپ اس کا بآسانی تھا، دونوں بھی بیٹی کے ہمراہ تھے، آخر بیٹی کی شادی ندیم سے ہو جاتی تو ان کے دن پھر جاتے کیونکہ ان دونوں کو بیٹی کی صلاحیتوں پر بھرپور مان تھا، ماہ نور کے حسن اور اداؤں کا اسیر ندیم ماہ نور کے ماں باپ کی باتوں پر ایمان لے آیا، جیسے ہی ماہ نور کے باپ نے شادی کے پانچ ماہ بعد جائیداد ماہ نور کے نام کر دینے کی بات کی، ندیم نے جھٹ ماہ نور کے نکاح کر لیا، اب ماہ نور محل نما گھر کے لاؤنج میں خود پرستہ کی نگاہیں محسوس کر کے صوفے پر شان سے کرسی مہم کی مانند براجمان تھی، بیوں پر دلکش مسکراہٹ چل رہی تھی، جس پر ندیم فدا ہوا جا رہا تھا، سمیرا ایچمدونوں کی دل ہی دل میں نظر اتارنی اٹھ کھڑی ہوئیں، انہیں اپنی بہو کے شایان شان کھانا تیار کروانا تھا، نمروہ اور ثمرہ انہی بھی اور بھائی سے بات کرنے لگیں، اس گھر کے سب مینوں کے چہرے آج خوشی جھکا رہے تھے، انہیں عمر نہ تھا، ان کی یہ خوشیاں مٹی مختصر عمر کی حامل تھیں۔

☆☆☆

”کیا یہ حسن کیانی کا گھر ہے۔“ تابش اور

ارمان نشا کے ساتھ اس وقت حسن کیانی کے گھر کے سامنے کھڑے تھے، نشا کے بتائے گئے حسن کے پورے نام حسن کیانی کی پوری کالونی میں ڈھونڈنے کے بعد بالآخر اب وہ حسن کیانی کے گھر کے سامنے کھڑے تھے یہ ان کا خیال تھا کیونکہ بڑے سے گیٹ کے باہر لگی نیم پلیٹ پر حسن ولا درج تھا، حسن ولا کا نام پڑھتے ہی تابش نے بے تابی سے باہر کھڑے چوکیدار سے استفسار کیا تھا، چوکیدار نے چونک کر نیتوں کو دیکھا۔

”کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“
چوکیدار نے عجیب نظروں سے دیکھتے اٹھا سوال داغ دیا۔

”ہمیں ان کا ادھار دینا ہے اس لئے پوچھ رہے ہیں۔“ ارمان تب کر بولا، اس سے قبل چوکیدار جواب دیتا، نشا کی نظر ساتھ والے بنگلے کے گیٹ سے سست روی سے نکلتی بڑی سی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر تھی عریضہ پر پڑی، نشا کے قدم ڈھیروں بے تابی سو کر اس جانب سرعت سے اٹھ گئے، یقیناً عریضہ کو علم ہو گا حسن کہاں ہے اور اس حال میں ہے، ارمان اور تابش چوکیدار کو گھوری سے گواہ نشا کے پیچھے گئے، پوری کالونی میں وہ غبار ہوئے تھے حسن صاحب کا گھر ڈھونڈنے کے لئے، اس سڑی شکل والے چوکیدار نے انہیں بتایا کیوں نہیں یہی حسن کیانی کا گھر ہے، گھوری تو بٹی تھی۔

”آپ جانتی ہوں گی، حسن کہاں ہے، پلیز مجھے حسن کے پاس لے چلیں۔“

نشا فرنٹ ڈور پر نرم و نازک ہاتھ لگا کر بے قراری اور اضطراب میں لپٹی آواز میں بولی۔

عریضہ بھی نشا کو دیکھ کر گاڑی روک چکی تھی،

وہ حیران ہوئی تھی نشا اور یہاں، وہ بھی اس وقت

”کیا تمہیں نہیں علم حسن کہاں ہے اور تم یہاں اور یہ دونوں کون ہیں۔“ فرٹ ڈور کھول کر قدم باہر رکھتی عریشہ نے اپنی سوچ کو الفاظ کا جامہ پہنایا، نشا عریشہ کو پا کر گویا حسن تک پہنچنے کی راہ پا گئی تھی، تیز تیز بولتے وہ خود پر ہنسی رودار سن گئی، دوسرے لفظوں میں عریشہ کا کام آسان کر گئی، عریشہ نے پر سوچ انداز میں دونوں خوبصورت وجہہ نو جوانوں کو دیکھا تھا جن کے چہرے ان کے بہترین کردار اور شرافت کے گواہ تھے۔

”اگر نشا کو بدگمان کر دیا جائے تو حسن میرا ہو سکتا ہے، حسن کو نشا مل ہی نہ پائے گی، نشا کی چچی سمیرا حسن کو اپنے گھر گھسنے نہیں دے گی، یوں نشا کا کاغذ اس کے اور حسن کے درمیان سے ہمیشہ کے لئے نکل جائے گا۔“ وہ اس وقت ہاسپٹل ہی جا رہی تھی، ڈاکٹرز نے امید کر لی تھی کہ شمیمہ نے عریشہ کو بھاپا تھا، عریشہ نے وہ اور پاپا بھی حسن کو دیکھنے ہاسپٹل گئے تھے، شمیمہ بیہوش تھی مگر متاثر ہوئی تھیں ان کے اچھے اخلاق سے، نشا سے وہ مزید بدظن ہو گئی تھیں، عریشہ نے کھڑے کھڑے حسن کو ہمیشہ کے لئے اپنے نام کرنے کا منصوبہ ترتیب دے ڈالا تھا، چوکیدار جو خاصہ بد دماغ اور بد زبان تھا، وہ گیٹ سے اندر جا چکا تھا، ارمان اور تابش کو عریشہ کی پر سوچ چپ کوٹ میں مبتلا کر گئی، وہ اب اتنے بھی دیے نہیں تھے جو اس محترمہ کے سوچ میں ڈوبنے کو بخیر کرتے، انہیں نشا کو اس کے شوہر کے گھر پہنچا تھا، وہ کافی لیٹ ہو چکے تھے، ارمان کو بھی کئی آوازیں خود پر برستی محسوس ہونے لگی تھیں، نشا امید و بیم کے دور تھا عریشہ کے خوبصورت چہرے پر لگا دھجے کھڑی تھی۔

”محترمہ اب کچھ بول دیں۔“ ارمان تصور

میں کونسا جہان میں دوپٹے دار رہا کرتا تھا۔
جہاں آرتھروں پر رہا۔

”وہ ایسا ہے کہ نشا۔“ عریشہ کی چپ کی چادر میں شگاف ارمان کی ترختی آواز نے ڈ۔ تو وہ سرد آو بھر کر پانچ غلطیوں پر پھر چپ کے دورے پر نکل گئی۔

”یہ ہمیں جلد بتائیے مجھے سے جا میں حسن کے پاس۔“ نشا کا دل اندیشوں و خوف کی زد میں تھا، اس وقت عریشہ ہی اس کی وحدہ امید تھی۔

”نشا مجھے انیسویں کے ساتھ بہن پڑ رہی ہے، حسن کو سے میں جا چکا ہے، شمیمہ نئی سچ بھی کچھ دیر قبل حسن کے بہتر فرینٹ کے لئے سے انگلیڈ سے جا چکی ہیں، حسن بچے گا یا نہیں، ہوش میں آئے گا یا نہیں، اس کی زلفت کچھ بہت مشکل ہے، میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی، تمہیں اب اپنے رہنے کا ٹھکانہ خود ہی ڈھونڈنا ہے۔“ عریشہ کا سفاک جہہ در غلطی کے اوپر سفاک آسان نہ کر گئے، عریشہ نے اس کے وجود کو حوالہ میں دھکیل دیا تھا۔

وہ جہاں جائے گی، یہ سوں بھوت بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے نہ چنے گا، اس پر نشا رو دی تھی، وہ بھی اس کے تھے بے سبب ہوئی تھی، ارمان اور تابش بھی عریشہ کی بات پر تڑپ گئے۔

”عجب ترن ہے یہ، کوئی ترن کی جھٹکی نہیں اس کے سچے میں، آپ ہمیں پتی شمیمہ کی کا نمبر دیں، ہم بات کریں گے اس سے، نشا کو انگلیڈ بھانسنے میں ہم مدد کریں گے اس کی، آخر حسن اس کا شوہر ہے، شمیمہ نئی کس طرح اس سے غافل رہ سکتی ہیں۔“ ارمان کا دل بڑی طرح تڑپا تھا نشا کی بے بسی پر یہی حکمتا پیش تھا۔

”میں کیوں دوں؟ آپ کو ٹھیندا آئی کا نمبر، وہ تو بیک سجھے پہنچیں ہوں نہ نہ، بہو اپنے گھر میں ہے نہ کہ دو بچن ٹروں کے ساتھ۔ بورڈ شہرین پر تیسرے آپ رہتی ہے۔“ عریشہ کے بچے پر تینوں چونک گئے، یہ تھا اس کے لیے میں، صمن، حسد، خضر، قدرت یا دھوکا دہی نہ ہو، تینوں کے دیکھتے ہی دیکھتے عریشہ زن سے گاڑی بھاگے گئی، وہ مصحفین بھی نشانی کا شب اس کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لیے نکل چکا تھا، اب نش جانے بھر میں، کتہہ تونی تھی وہ جب حسن نے اس پر نش کو فوقیت دی تھی، حسن کی زبان ہمہ وقت نش کے حسن کے قصیدے پڑھتی تو وہ جس طرح اک ہو جان تھی، اب رقصت نے حسن کو اس کی جھولی میں۔ پتی تھا، تو وہ موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتی، سے حسن کے ٹھیک ہوتے ہی اس کے ساتھ شادی کر کے ٹھیندا روانہ ہو جاتا تھا وہ عیدار کو سمجھتا تھا، نش دن دونوں ٹروں کو جھولی کر بھی گھر کے قریب بھی پھٹنے نہیں دیتا، اس کی پرکھتے تھے تھی، نش نے عریشہ کے جاتے ہی خوفزدہ لگا ہوں سے تابش درارہ کو دیکھ، در تھا کہ کربن تہ پر تھا، تنی بڑی آرزو نش۔

”یا اللہ ہڈر۔“ اس کا دل کر پاتا تھا، تابش

راہ دنوں سہست۔

جواباً ہوں کہنے پر استغنا کیا تھا، وہ نشا کو کبھی یوں بے آسرا نہیں ہونے دے گا، یہی اس کے دل کی آواز تھی۔

تھی۔

”وہ منحوس لڑکی اگر کنفرم پتا جاتی، حسن ٹھیک ہوگا یا نہیں، نشا کو لٹکا کر چلی گئی تھی، نشا کب تک حسن نامی بندے کا انتظار کرے گی اور سڑیل شکل والا چوکیدار ہمیں ہاسپٹل کا ایڈریس ہی دینے کی حامی بھر لیتا لیکن نہ جی وہ تو اسی وقت گھر میں گدھے کے سر سے سینک کی مانند غائب ہو چکا تھا۔“

”کیا فضول ہانک رہے ہو ارمان، کم از کم لفظ تو سوچ سمجھ کر استعمال کرو، بدکرداری کا ٹیگ ہونہ، میں کیوں ایسا چاہوں گا، میں نے بس اتنا کہا ہے جب تک نشا کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا تب تک تم دونوں ڈرامہ کر لو، تم دونوں کو کس طرح رہنا ہے اس کا فیصلہ بھابھی نے نہیں تم نے کرنا ہے اور مجھے اپنے دوست پر یقین ہے، میرا دوست خائن نہیں ہے، نشا کو تحفظ صرف اسی صورت مل سکتا ہے، وہ پہلے ہی اتنے دکھ جھیل چکی ہے، مزید مشکلات سے تو ہم اس کو بچا سکتے ہیں نا۔“ تابش کو ارمان پر حد سے زیادہ یقین تھا کہ اس کے دوست کی نگاہوں میں کتنی شرم و حیا تھی۔

”نشا سے تو پوچھ لو، وہ چاہے دل ہی دل میں تمہیں بددعائیں دے رہی ہو اتنا حسین حل نکالنے پر۔“ ارمان کا لہجہ طنزیہ ہوا، تابش نشا کی جانب متوجہ ہوا جو اپنی محرومی لرزتی انگلیوں کو چٹھا رہی تھی، اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔

(جاری ہے)

شادی کے قائم رہنے کو شدید خطرہ لاحق ہو جاتا اگر تابش نشا کو اپنے گھر لے جاتا، تابش کی بیوی لائبہ تھی بھی کھر درے مزاج کی، تابش کے والدین دور افتادہ گاؤں میں رہائش پذیر تھے، تابش کی جاب لاہور میں تھی، ہر آسائش اسے میسر تھی لیکن اس کے والدین گاؤں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے، نشا کو وہ کسی دارالامان میں بھی چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔

”کیا کیا جائے۔“ وہ دونوں اچھے خاصے گھوم گئے تھے، ارمان کچھ ہل غور و فکر میں ڈوبا رہنے کے بعد تابش جوش سے بولا۔

”ہاں بول۔“ ارمان نے استفہامیہ نگاہوں سے تابش کو دیکھا تھا، پھر جو بات تابش نے کی وہ دوفت زمین سے اچھلا تھا، نشا جو کچھ فاصلے پر زمین پر بیٹھی تھی، اس کی سماعتوں میں تابش کے الفاظ پڑے تو نگاہوں میں ناپسندیدگی اور بے بسی ایک ساتھ اتری تھی۔

”تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا، یہ کس قسم کا مشورہ ہے، اگر یہ مذاق ہے تو انتہائی بے ہودہ مذاق ہے۔“ ارمان گویا جلتے تو بے پر جا بیٹھا تھا۔

”اس کے علاوہ کوئی اور تجویز نہیں ہے میرے پاس اور ویسے بھی کیا تجھے اپنے کردار کی صداقت پر یقین نہیں۔“ تابش کو صرف یہی حل نظر آیا تھا اور اب اسے ارمان کو قائل کرنا تھا۔

”جیسے یقین اپنے کردار پر، لیکن مقابل میری بھابھی ہوں گی، بال کی کھال اتارنے والیں۔“

”تو شاید بھول رہا ہے یہ بات، تم نہ صرف لڑکی کو مزید مشکل میں دھکیل رہے ہو بلکہ ہم دونوں پر بدکردار ہونے کا ٹیگ بھی لگوانا چاہتے ہو۔“ ارمان کا دل سختی سے انکاری تھا تابش کی تجویز پر عمل درآمد کرنے پر نشا کسی کے نکاح میں

مجموعہ احمد روفانی

بشری سیال

کے پاس جانے کی خواہش تھی، عورت جس مرد سے بے پناہ محبت کرتی ہے، وہ اس کے لئے اپنا تن من دھن قربان کر دیتی ہے، مگر جب وہی مرد اس کے ساتھ بے وفائی کرنا ہے تو وہ ٹوٹ کر ایسا بکھرتی ہے کہ پھر دوبارہ سمٹنا اس کے لئے بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے، اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آسمان پراڑتے پرندوں کو دیکھا، جو دن ڈھلے کے ساتھ ہی گھر کو واپس لوٹ رہے تھے، لوٹنا تو اسے بھی تھا، مگر دل مسلسل انکاری تھا،

موسم نے انگڑائی لی تو درختوں نے سبز لباس اتار کر زرد، اداس اور بے رونق لباس زیب تن کر لیا، ہر سو خزاں کی نیا موٹی اور اداسی، ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، وہ نا جانے کب سے ٹیرس پر کھڑی تھی، اداس شام کا گلا دور سے آئی کوئل کی آواز نے گھونٹا تھا، وہ بے حس و حرکت کھڑی تھی، اس کا دماغ جیسے سن ہو رہا تھا، وہ کچھ دیر قبل آیا تھا، اسے لینے اور ایسا تو ایک دن ہونا تھا، مگر اب نہ تو اسے اس کا انتظار تھا، نہ ہی اس

ناہ

مگر پھر اسے یاد آیا کہ وہ ایک عورت ہے اور بھلا عورت کا بھی دل ہوا کرتا ہے، وہ کیا سوچتی ہے، کیا محسوس کرتی ہے، اس سے کسی کو فرق کب پڑتا ہے۔

☆☆☆

مریم مقامی کالج میں لیکچرار تھی، اپنی دو بیٹوں اور شوہر کے ساتھ وہ ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔

ارحمن اسے بے حد چاہتا تھا، دو بچوں کے بعد بھی اس کی محبت میں کوئی کمی نہ آئی تھی، ہر بات میں اسے اہمیت دیتا، ہر کام میں اس کے ساتھ کا پریٹ کرتا تھا، مریم کی کو لیکچر اس پر رشک کرتی تھیں۔

آج کل وہ خاصی پریشان تھی، کیونکہ جاب





سارا مسئلہ ارحم کے سامنے رکھ دیا تھا، اسے یقین تھا ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی وہ اس کا مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دے گا۔

”تو پھر اب کیا کیا جائے؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”ایک حل ہے میرے پاس۔“ ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند اس کے ذہن میں لپکا تھا۔

”اگر تم Cooperate کرو تو۔“ اس نے

آس بھری نظروں سے ارحم کی جانب دیکھا تھا۔

”ہاں کہو۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے

بولاً۔

”تم ساڑھے نو بجے آفس جاتے ہو، اگر

میڈ آٹھ بجے آجائے اور نو یا سوا نو بجے تک صفائی

کر کے چلی جائے، تمہیں تو کوئی پرابلم نہ ہوگی؟“

اس کی بات پر ارحم سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

”یار یہ کچھ مناسب نہیں لگتا۔“ اس نے

کہا۔

”میری کو لیگ شازیہ کی میڈ بہت اچھی

ہے، اعتماد والی لڑکی ہے، بس میں اسے ہائر کر رہی

ہوں، تمہیں ذرا بھی مسئلہ نہیں ہوگا، وہ کام کر کے

چلی جائے گی، تم گھر کو لاکڈ کر کے آفس چلے

جانا۔“ اس نے اپنی پریشانی کا گویا خود ہی حل

نکال لیا تھا۔

”دیکھ لو، یہ میڈ وغیرہ کو ہینڈل کرنا تم

خواتین کا کام ہے، ایسا نہ ہو وہ گھر کا صفایا کر کے

چلتی بنے۔“ اس نے ازراہ مذاق کیا تھا، مگر مریم

نے محسوس نہ کیا، وہ اپنا مسئلہ حل ہو جانے پر بہت

خوش تھی۔

”اتنی آسانی سے میں اپنے گھر کا صفایا نہیں

کرنے دیتی کسی کو۔“ وہ چائے کے برتن اٹھا کر

کچن کی جانب چل دی تھی، ارحم نے محبت بھری

نظر اس پر ڈالی اور سامنے ٹیبل پر پڑا نیوز پیپر اٹھا

کے ساتھ پورا گھر سنبھالنا، ارحم کو ٹائم دینا، بچوں کو پڑھانا اور پھر مریم کے پاس اپنے لئے کوئی وقت نہ بچتا تھا۔

آج کل اسے ایک میڈ کی تلاش تھی، بہت

کوشش کے بعد اس کی کو لیگ مس شازیہ نے

اسے اپنی میڈ کا بتایا تو وہ اسے ہائیر کرنے کے

لئے جھٹ مان گئی، مگر ارحم کو منانا کافی مشکل تھا۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا، وہ اور ارحم لاؤنج میں بیٹھے

چائے پی رہے تھے، ارحم ری موٹ کنٹرول تھا سے

چینل سرچنگ میں مصروف تھا، مریم بھی اس کو

اور کبھی ٹی وی کی اسکرین کو دیکھتی اس کی یہ بے

چینی ارحم سے مخفی نہ تھی، مگر وہ چاہتا تھا کہ مریم

خود اسے بتائے کہ کیا بات ہے، جب وہ کسی

طرح بھی اسے بتانے پر آمادہ نظر نہ آئی تو ارحم

نے ٹی وی کا دایوم کم کیا اور اسے دیکھا۔

”از ایوری ٹھنک اوکے؟ تم کچھ پریشان

دکھائی دے رہی ہو۔“ ارحم نے چائے کا سپ

لیتے ہوئے آخر کار استغفار مہ نظروں سے مریم کی

جانب دیکھا تھا، جو خاصی الجھی ہوئی اور پریشان

دکھائی دے رہی تھی۔

”پرابلم یہ ہے کہ میں تو ساڑھے آٹھ بجے

چلی جاتی ہوں کالج، میں نے اپنی دو تین کو لیگز

سے بات کی، ان میں سے کسی کی میڈ کو اپائنٹ کر

لوں، مگر سب ہی نارنگ کا ٹائم دے سکتی ہیں،

اب تم بتاؤ کیا کروں؟“ اس نے بتایا تو چند ٹائیپے

ارحم بھی سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں یہ تو پرابلم ہے۔“ وہ پر سوچ انداز

میں بولاً۔

”بالغرض اگر کوئی شام کا ٹائم دیتی بھی ہے

تو میرے لئے مشکل ہو جائے گا کالج سے واپس آ

کر سر پر کھڑے ہو کر صفائی کروانا۔“ اس نے اپنا

لیا۔

☆☆☆

”نان سینس گرل۔“ وہ زرب لب بڑبڑایا،
چند ٹاپے خاموش کھڑی وہ اسے دیکھتی رہی اور
پھر باہر نکل گئی، ارحم نے اپنا بیگ، موبائل اور
گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

دوپہر کو جب مریم گھر آئی تو دھلے
دھلائے، صاف ستھرے اور چمکتے فرش اس کے
منتظر تھے، دیکھ کر اس کی طبیعت فریش ہو گئی تھی،
وہ ریلیکس اور مطمئن ہو گئی تھی، اس شام جب وہ
سو کر اٹھی تو اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا، نہ تو اس
نے زبیا کو ہوم ورک کرواتے ہوئے ڈانٹا ڈانٹا اور
نہ ساریہ کو کھلونے پھیلانے پر کچھ کہا۔

”یہ میڈ جو تم نے رکھی ہے خاصی خطرناک
ہے۔“ وہ لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے جب
اچانک ارحم کے کہنے پر اس نے اس کی جانب
دیکھا۔

”مطلب؟“ وہ کچھ نہ سمجھی۔

”یار! جاہل کی لڑکی ہے، بنا دستک دیے
روم میں آگئی، پھر تمہارے جھمکے اٹھا کر کانوں پر
لگا کر دیکھنے لگی۔“ ارحم نے اسے بتایا۔

”میں نے تو اسے اچھا خاصا ڈانٹا۔“

”دیکھو ارحم، بہت مشکل سے میرا مسئلہ
Solve ہوا ہے تم اسے ڈانٹ کر بھگانا دینا۔“
اسے فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں ارحم اسے ڈانٹ کر
بات بگاڑ نہ دے، فی الحال وہ ایسا نہ چاہتی تھی۔

”مگر ان نوکروں کو ان کی اوقات میں ہی
رکھنا چاہیے۔“ اس نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا تھا،
مریم نے اس سے بحث کرنے کا ارادہ موقوف
کیا، کیونکہ اسے ابھی کل کے لئے اپنی بچیوں اور
ارحم کی تیاری بھی کرنی تھی، اس لئے وہ کوئی بھی
جواب دیے بنا اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن مریم کی موجودگی میں ہی وہ آگئی
تھی، وہ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی تھی، بڑی بڑی سیاہ
آنکھیں، بالوں کی دو چوٹیاں بنائے، سفید ہلکی
رنگت، سر و قد، وہ کہیں سے بھی کام کرنے والی
لڑکی نہ لگتی تھی، مریم نے اسے کام سمجھا دیا اور خود
تیار ہونے لگی، دونوں بچیوں کو ریڈی کر کے وہ
ساڑھے آٹھ بجے سے کچھ پہلے ہی کالج کے لئے
نکل گئی تھی، وہ مقامی کالج میں ٹیچر ارحم، اپنی نرم
طبیعت اور خوبصورتی کی وجہ سے وہ طلباء کی
پسندیدہ ٹیچر تھی۔

”صاحب! ہو گیا کام۔“ وہ ڈورینگ کے
سامنے کھڑا خود پر فریوم اسپرے کر رہا تھا جب
وہ بنا دستک دیئے بے دھڑک اس کے روم میں
داخل ہوئی۔

”تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ کسی کے روم
میں جانے سے پہلے ڈورناک کرتے ہیں۔“ وہ
تیزی سے مڑا اور ناگوری سے بولا۔

”کیا کرتے ہیں۔“ وہ اپنی موٹی موٹی
آنکھوں کو پٹپٹاتے ہوئے نا سمجھی کے عالم میں اس
کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”دروازے پر دستک دیتے ہیں۔“ اس
نے پر فریوم واپس رکھا اور لیپ ٹاپ اٹھا کر بیگ
میں ڈالنے لگا۔

”ہا! کتنے پیارے جھمکے ہیں۔“ اس کی
بات کو ان سنی کرتے ہوئے وہ ڈورینگ کی جانب
بڑھی اور اس پر پڑے مریم کے قیمتی جھمکے اٹھا کر
کانوں سے لگا کر اشتیاق بھرے لہجے میں بولی تو
ارحم غصے کے عالم میں تیزی سے مڑا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے، رکھو انہیں واپس۔“ وہ
درشتی سے بولا۔

”ایسے کام نہیں ہوتا صاحب۔“ وہ کہہ کر وہاں رکی نہیں تھی، ارحم کا موڈ خاصا آف ہوا تھا، اس روز بار بار اس کے دل نے اسے ملامت کیا تھا، اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ مریم کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کو غور سے دیکھا تھا، اس ایک نظر کے لئے اس کا دل اسے معاف نہ کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

”ہیلو امی!“ مریم کے ساس سر نہایت شفیق اور اچھی فطرت کے مالک تھے، وہ دوسرے شہر میں رہتے تھے، مریم کے سر جاب کرتے تھے، یہ دونوں میاں بیوی بھی جاب کرتے تھے، اس لئے چھیٹیوں میں ہی آنا جانا ہوتا تھا، مگر فون پر ہر دوسرے روز بات ہو جاتی تھی۔

”میں تو بہت خوش ہوں، میں نے فائنٹی میڈر رکھ لی ہے، بہت اچھا کام کرتی ہے، اب میں کالج میں بھی فکر مند نہیں ہوتی، بچوں کو بھی ٹھیک سے دیکھ لیتی ہوں۔“ وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی۔

”چلو یہ تو اچھی بات ہے۔“ وہ محبت سے بولیں۔

”میں اسے بچا ہوا کھانا، اپنے پرانے کپڑے وغیرہ بھی دے دیتی ہوں تو خوش ہے مجھ سے، بہت اچھے طریقے سے کام کرتی ہے۔“ اس نے مزید تفصیل بتائی تھی۔

”اچھا، مگر دھیان رکھنا، زیادہ سرعت چڑھانا، ان لوگوں کو ان کی اوقات میں رکھنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“ مریم کی امی اس کے بچپن میں ہی وفات پا گئی تھیں، ابو نے دوسری شادی کر لی تھی، اس کی سوتیلی ماں اور بہن بھائی اس سے ہمیشہ بہت دور رہے تھے، ارحم کے والدین اس سے بہت محبت کرتے تھے، ان کا رویہ اس کے ساتھ

اگلے روز وہ سنجیدگی سے صفائی کرتی رہی تھی، نہ ہی اس نے ارحم کو مخاطب کیا تھا، نہ ارحم نے ضروری سمجھا، وہ لاؤنج میں بیٹھا تھا، وہ کئی بار وہاں سے گزری اور کن اکھیوں سے ارحم کو دیکھا، مگر وہ بالکل متوجہ نہ ہوا۔

دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں کہتی ہے میری نظر شکریہ وہ با آواز بلند گنگاتے ہوئے صفائی کر رہی تھی، ارحم نے کچھ زچ ہو کر اسے آواز دے ڈالی۔

”سنو!“ اس کو ایک دم بریک لگا تھا، اگلے ہی لمحے وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر تھی۔

”جی صاحب!“ اس نے شلوار ٹخنوں سے کافی اوپر چڑھا رکھی تھی، اس کی سفید، سڈول پنڈلیا عجیب نظارہ پیش کر رہی تھیں، دوپٹہ شاید صفائی کے دوران اسے ڈسٹرب کرتا تھا، اس لئے اسے اتار کر نا جانے کہاں رکھ دیا تھا، لمبی، موٹی چونٹیاں دائیں بائیں جھولتی ہوئی عجیب بہار دکھا رہی تھیں، اس گندے اور رف چلپے میں بھی وہ بلا کی حسین دکھائی دے رہی تھی۔

”خاموشی سے کام کرو۔“ اس نے دل ہی دل میں خود کو سرزنش کرتے ہوئے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا۔

”صاحب! مجھے ڈانٹنا نہ کرو۔“ اس کی آنکھوں میں غصے کے رنگ اترنے لگے، ارحم کی نظریں جھٹک جھٹک کر اس سے دوپٹے سے بے نیاز دلش سراپے میں الجھنے لگیں۔

”سنو!“ وہ جانے کے لئے مڑی تو ارحم اسے پکار بیٹھا، وہ مڑی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

”دوپٹہ اوڑھ کر کام کیا کرو۔“ اس نے کچھ جھنجھلاتے ہوئے کہا تھا، وہ حیرت زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔

ہمیشہ سگی اولاد جیسا رہا تھا، وہ بھی ان کی بہت عزتی کرتی تھی۔

”جی امی یہ تو آپ نے ٹھیک کہا، مگر وہ کافی معصوم سی ہے، ورنہ مجھے یہ فکر تھی، کوئی چالاک، ہوشیار، خزانہ قسم کی عورت نہ ہو۔“ اس نے بتایا تھا۔

”اور تم بتاؤ، کب چکر لگنا ہے، ہماری طرف، ہم لوگ بچیوں سے بہت اداس ہیں۔“ ارحم ان کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کی بچیاں دادا، دادی کی بہت لاڈلی تھیں، مگر ماں اور باپ دونوں جاب کرتے تھے، اس لئے صرف چھٹیوں میں ہی ان سے مل پاتی تھیں۔

”امی مجھے کالج سے چھٹیاں ہو جائیں، پھر انشاء اللہ ہم لوگ چکر لگاتے ہیں۔“ چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

”مریم، موسم بدل رہا ہے تم نے شاپنگ نہیں کرنی؟“ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر آئی تو ارحم کو چینل سرچنگ کرتے ہوئے پایا۔

”تمہارا دل چاہ رہا ہے تو کرو دو۔“ وہ ڈیرینک ٹیبل کے سامنے بیٹھی نائیٹ کریم لگا رہی تھی، آئینے میں ابھرتی اس کی شبیہ کو دیکھتے ہوئے بہم سا مسکراتے ہوئے کہا۔

”بالکل دل چاہ رہا ہے، کل چلتے ہیں پھر۔“ اس نے فوراً پروگرام ترتیب دیا، اگلے دن وہ مریم اور دونوں بچیوں کو لے کر شاپنگ کروانے گیا، واپسی میں ڈنر بھی کروا دیا، ان کی شادی کو آٹھ سال ہو چکے تھے، مگر دونوں میں اوّل روز کی طرح محبت برقرار تھی۔

”سنو!“ وہ ہولے ہولے گنگناتے ہوئے اپنا کام کر رہی تھی، جب ارحم اس کے پاس آیا، وہ

ڈر کر فوراً خاموش ہو گئی تھی۔

”جی صاحب!“ اس نے مودبانہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

”تمہیں یقین لگانا آتا ہے؟“ اسے میننگ میں جانا تھا، تاہم کم تھا، اور جو شرٹ پہن کر اس نے جانا تھا، اس کا یقین ٹوٹا ہوا تھا وہ اچھا خاصا جھنجھلاہٹ کا شکار تھا۔

”جی صاحب لگانا آتا ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ میری شرٹ پر لگا دو پلیز۔“ وہ ہاتھ دھو کر آگئی اور اس نے شرٹ پکڑ لی، وہ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا، کچھ دیر میں وہ دستک دے کر اندر آگئی، ارحم نے دیکھا اس نے مریم کا پرانا سوٹ پہن رکھا تھا، دوپٹہ لا پرواہی سے گلے میں جھول رہا تھا، سوٹ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا تھا، شرٹ اسے کچھ چھوٹی تھی، مریم کا قد اس سے چھوٹا تھا۔

”شکریہ۔“ اس نے شرٹ اس کے ہاتھ سے لے لی تھی، وہ کچھ مسرور سی باہر نکل گئی، اس شام ارحم نے اپنا کچھ محسوس کیا کہ مریم کا قد چھوٹا ہے۔

”لڑکی تو اسمارٹ اور لمبی ہی اچھی لگتی ہے۔“ اس کے ذہن میں خیال آیا۔

”یہ کیا فضول بکواس میرے دماغ میں سا رہی ہے۔“ اگلے ہی لمحے ذہن میں آنے والی منفی سوچوں کو جھٹکتے ہوئے وہ کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

مریم کا رپٹ پر بکھرے ندا کے کھلونے سمیٹ رہی تھی جب ارحم اسے نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھا، وہ بنا دوپٹے کے تھی، گھر میں وہ دوپٹہ کم ہی لیتی تھی، اس کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک براؤنڈ سوٹ تھا، مگر گھر میں وہی دو

چار گھسے پرانے کپڑے پہنتی تھی۔

”مریم!“ وہ اسے پکار بیٹھا۔

”جی!“ وہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”اپنا ویٹ کچھ کم کرو، موٹی ہوتی جا رہی

ہو۔“ ناچاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گیا۔

”ہیں۔“ اس نے حیران نظروں سے اسے

دیکھا۔

”یہ ایک دن میں، میں آپ کو موٹی کیوں
لگنے لگی؟“ اس نے ناچھی کے عالم میں ارحم کی

جانب دیکھا۔

”پتا نہیں، شاید اس سوٹ میں لگ رہی
ہو۔“ وہ کھیانی سی ہنسی ہنسا۔

”یہ خاصا پرانا سوٹ ہے، اب کافی فٹ ہو
گیا ہے مجھے۔“ اس نے ایک نظر اپنے سر پہ کو
آئینے کے سامنے دیکھا، سادہ اور ف سے چلے
میں وہ کہیں سے کالج کی لیکچرار نہ دکھائی دیتی
تھی۔

”آج امی کی کال آئی تھی، آنے کا پوچھ
رہی تھیں۔“ اس نے اچانک یاد آنے پر بتایا۔

”تمہیں اور بچیوں کو چھٹیاں ہو جائیں، پھر
پروگرام بنالیں گے، میں بھی آفس سے چھٹی لے
لوں گا۔“ وہ سونے کے لئے لیٹ چکا تھا، مریم
نے لائٹ آف کی اور اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

اب اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ ارحم کو کوئی کام
کروانا ہوتا اور گل بانو (نوکرانی) فوراً وہ کام کر
دیتی، جہاں نا محرم مرد اور عورت تنہا ہوں وہاں
تیسرا شیطان ہوتا ہے، ارحم جس کی شرافت اور
نیکی کی گواہی ہی پورا خاندان دیتا تھا رفتہ رفتہ گل
بانو کا منتظر رہنے لگا تھا، بہانے بہانے سے اسے
پاس بلاتا، کوئی کام کہتا، وہ کرنے میں مصروف
ہوتی اور خود اس کے سامنے بیٹھ کر اچھی طرح اس

کا جائزہ لیتا، رفتہ رفتہ ان کے درمیان مالک اور
نوکر والا لحاظ اور جھجک ختم ہونے لگی، گل بانو منہ
بند نوخیز کلی کی مانند تھی، وہ بظاہر معصوم دیکھتی تھی،
مگر درحقیقت بہت چالاک تھی، وہ ارحم کی بدلتی
نظروں کو پہچان چکی تھی، اس کی خاموش نگاہوں
سے ملنے والے پوشیدہ پیغاموں کو وہ بخوبی سمجھ
رہی تھی اور اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی، وہ
مریم کی موجودگی میں دوپٹا اوڑھے، سر جھکائے،
معصومیت چہرے پر سجائے کام کرتی رہتی، نہ ہی
ارحم کے سامنے جاتی، مگر جیسے ہی مریم گھر سے نکلتی
وہ دوپٹہ اتار کر رکھ دیتی دوپٹے کے پلو میں باندھی
لب اسٹک نکال کر دوش روم میں لگے آئینے کے
سامنے کھڑی ہو کر لگاتی، آنکھوں میں کاجل لگاتی
اور بہانے بہانے سے ارحم کے ارد گرد چکر کاٹتی،
وہ بھی مسکراتی ہوئی، میٹھی نظروں سے اس کی
جانب دیکھتا، تو اس کا حوصلہ کچھ اور بڑھنے لگتا،
ان دونوں سے سوا اگر کوئی تیسرا وہاں موجود ہوتا
تھا، تو وہ تھا شیطان، جو دونوں کا حوصلہ خوب بڑھا
رہا تھا، ارحم اس کے حسن اور اداؤں کے جال میں
ایسا پھنس چکا تھا کہ اسے اب اپنی حرکتوں پر کوئی
شرم بھی محسوس نہ ہوتی تھی، ابتداء میں دل جو
ملامت کرتا تھا، اب وہ بھی خاموش ہو گیا تھا اور
ضمیر تو ویسے ہی اس کی تھکیوں سے سوچ چکا تھا۔

☆☆☆

”ارحم! کالج میں پیپر ہو رہے ہیں، ورنہ
میں چھٹی کر لیتی۔“

اسے بخار تھا، وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا، مریم نے
اسے سوپ بنا کر دیا، میڈیسن سائیکل ٹیبل پر رکھے
وہ چیزیں لے کر باہر کی جانب بڑھی، جب
اچانک مڑ کر اس کے پاس آئی محبت سے کہتے
ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی جانب دیکھنے
ہوئے گویا ہوئی۔

”کوئی بات نہیں میں بہتر ہوں۔“ وہ آہستہ آواز میں بولا۔

”میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔“ وہ چلی گئی اور جاتے ہوئے گل بانو کو ہدایت کر گئی کہ صاحب کو ڈسٹرب نہ کرے، خاموشی سے صفائی کر لے، کوئی شور نہ ہو۔

جب کافی دیر گزر گئی اور وہ بیڈروم سے باہر نہ آیا تو اسے تشویش ہونے لگی، جلدی جلدی کام نمٹا کر وہ اندر آئی، کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا، بھاری پردے کھڑکیوں پر پڑے ہوئے تھے، سامنے بیڈ پر وہ بے سدھ پڑا تھا، دبے پاؤں چلتی ہوئی وہ اس کے قریب آ کر رکی، شانندہ سوراہا تھا، وہ بغور اسے دیکھنے لگی، وہ بہت پنڈسم تھا، گل بانو کے دل کی حالت عجیب ہونے لگی، وہ تیزی سے مڑی، مگر ایک قدم اٹھا کر ہی اسے رک جانا پڑا، کیونکہ اس کا ہاتھ کسی کی مضبوط سلکتی گرفت میں آچکا تھا، وہ میکا کی انداز میں مڑی، اس کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ وہ غماز آلود لہجے میں بولا، سرخ انگارہ آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

”صا..... حب!“ اس نے ہکلاتے ہوئے ارجم کے ہاتھ میں موجود اپنی سرخ پڑتی کلائی کو دیکھا اور تھوک لٹکا۔

”یہاں بیٹھو۔“ وہ بیڈ پر تھوڑا سا کھسک کر اس کے لئے جگہ بناتے ہوئے بولا، وہ ہچکچاتی ہوئی کھڑی تھی۔

”مگر صا..... حب؟“

”بیٹھو۔“ ارجم نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا، وہ اس کے پہلو میں آ گری، وہ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”سر دباؤ میرا۔“ وہ تحکم آمیز لہجے میں بولا، حسب معمول اس وقت اس کے پاس دو پیٹہ نہ تھا،

سیاہ، چست، گہرے گلے کی قمیض میں اس کا دلکش گورا بدن ارجم کے اندر کی بے چینیوں کو مزید بڑھا رہا تھا۔

”سوچ کیا رہی ہو، میرے سر میں شدید درد ہے دبا دو۔“ وہ ایک مرتبہ پھر بولا، گل بانو نے اس کا سر دبانے شروع کر دیا، وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، اور وہ اسے اس کا پورا موقع فراہم کر رہی تھی وہ جو اوپر سے اس سے ڈرتی اور بھجتی تھی تو یہ صرف اس کی آتش شوق کو ہوا دینے کے ہتھیار تھے، درحقیقت وہ اس سب سے بہت خوش تھی۔

”صاحب! اب میں جاؤں؟“ جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی اس نے اسے اٹھنے کی اجازت نہ دی تو مجبوراً اسے اجازت طلب کرنا پڑی۔

”تھک گئی ہو؟“ اس کے جانے کے خیال سے اس کا دل بے چین ہونے لگا تھا، وہ جو ہمیشہ دور سے اس پر وار کیا کرتی تھی، آج اس کے اتنے قریب پہلی مرتبہ آئی تھی، اس کی قربت کا نشہ اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کرنے لگا تھا۔

”نہیں صاحب! مجھے اگلے گھر جانا ہے کام کے لئے۔“ اس نے نئی میں سر ہلاتے ہوئے توجیہ پیش کی۔

”تم وہاں مت جاؤ، تم کہیں بھی مت جاؤ، بس میرے پاس رہو، میرے سامنے۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے سینے پر رکھ لیا تھا، گل بانو کا دل ہاتھوں پیروں میں دھڑکنے لگا تھا، وہ متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”چھٹی نہیں ملتی صاحب؟“ اس نے ہاتھ واپس کھینچا، مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

”تم میرے گھر کے علاوہ سب جگہ کام کرنے سے انکار کر دو، وہاں سے جو تنخواہ ملتی ہے

وہ میں تمہیں دوں گا۔“ وہ حیرت زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی، اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ اس کے دل میں اتنا اہم مقام حاصل کر چکی ہے۔

”اگر انہوں نے میری ماں سے بات کی؟“ اس نے کچھ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔
 ”تو میں دیکھ لوں گا، بس تم انکار کر دو۔“ وہ اٹھنے لگی تو ارحم نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔
 ”کہاں چلی؟“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”موبائل لے آؤں، فون کر دوں، ورنہ باجی فوراً میری ماں کو فون کر دے گی۔“ ارحم نے اس کے ہاتھ ہولے سے دبا کر چھوڑ دیئے، وہ باہر نکل گئی، چند سیکنڈز میں اس کی واپسی ہوئی تھی۔

”فون کر دیا میں نے باجی کو۔“ بے تکلفی سے کہتے ہوئے وہ استحقاق بھرے انداز میں اس کے عین سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔
 ”گڈ!“ وہ مسکرایا۔

”یہ اتنے خوبصورت ہاتھ گھر، گھر کام کرنے کے لئے نہیں بنائے گئے۔“ ارحم نے اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا، گل بانو کے لبوں پر شرمیلیں مسکراہٹ رقصاں تھیں، وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھیں، اس روز وہ کئی گھنٹے اس کے پاس موجود رہی تھی، ہر طرح سے اسے رجمانی اور لہجانی رہی تھی، اپنی قاتل اداؤں سے اس کے دل کو مٹھی میں لے کر، کل آنے کا وعدہ کر کے وہ چلی گئی تھی۔

☆☆☆

کالج میں پارٹی تھی، مریم نے بہت خوبصورت ڈریس، ہم رنگ شوز اور جیولری پہن رکھی تھی، نفاست سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ وہ بہت باوقار اور دلکش دکھائی دے رہی تھی، وہ منتظر ہی رہی کہ ارحم اس کی تعریف

کرے، مگر ایسا نہ ہوا، وہ بوجھل دل کے ساتھ کالج گئی۔

”واہ مریم کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔“ مس رقبہ نے اسے دیکھتے ہی ساتھ بیٹھی مس سعادہ کو ٹھوکا دیا، مگر وہ تجھے دل کے ساتھ آگے بڑھ گئی، پھر تقریباً سارے سٹاف نے ہی اس کی تعریف کی۔

”مریم سوٹ کدھر سے لیا؟“ مس شہناز نے اس کا ملائم سا دوپٹہ پکڑتے ہوئے استفسار کیا۔

”Khodi سے۔“ اس نے ہولے سے جواب دیا۔

”بہت ہی نفیس ڈریس ہے۔“ مس شہناز نے بھی توصیفی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا، اس نے صرف مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔

”مریم سب ٹیچرز سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہیں۔“ سارا دن اسٹوڈنٹس کی طرف سے ہنسنے والے کمنٹس اور توصیفی نگاہوں نے اس کا موڈ بحال کر دیا تھا، کلاسز آف ہونے کے بعد پارٹی تھی، وہ شام کو کافی لیٹ فارغ ہوئی تھی۔
 ”ارحم تم بچیوں کو اسکول سے پک کر لو۔“ اس نے اسے کال کر کے کہا۔

”میں میننگ میں ہوں۔“ اس نے دو ٹوک جواب دیا، مجبوراً انہیں خود جا کر اسے لانا پڑا، واپسی میں وہ کافی تھک چکی تھی، ارحم آفس سے آیا تو بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا، وہ چائے بنا کر لائی۔

”میں چائے نہیں پیوں گا۔“ اس نے انکار کیا۔

”کیوں؟“ اس نے استغماہیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”میں کھانا کھاؤں گا، سخت بھوک لگی ہے۔“ وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے تھکے تھکے

انداز میں بولا۔

”سوری ارحم، تم بیٹھو، میں بس ابھی تھوڑی دیر میں کھانا بنا لوں گی۔“ وہ باہر کی جانب بڑھی۔

”بہت شکریہ تمہارا، کوئی ضرورت نہیں یہ احسان کرنے کی۔“ بکنا جھکتا راستے میں آنے والی ہر چیز کو ٹھوکا مارتا ہوا وہ باہر نکل گیا تھا، مریم جلدی سے چکن میں آئی، اس نے آدھے گھنٹے میں بہت پھرتی سے فرائڈ راکس اور گرین چکن تیار کیا، فریج میں سے کباب نکالے، انہیں فراٹی کرنے سے پہلے وہ ارحم کو بلانے کے لئے روم میں آئی، مگر وہ وہاں نہ تھا۔

”بیٹا آپ کے پاپا کہاں ہیں۔“ اس نے رعبا سے پوچھا۔

”پتا نہیں ماما۔“ وہ کھلونوں کے ساتھ کھیل رہی تھی، اس نے پورے گھر میں دیکھ لیا ارحم کہیں نہ تھا، اس نے موبائل اٹھا کر اسے کالز کیں، مگر وہ رسیو نہیں کر رہا تھا، اس نے منبج کیا۔

”ارحم کھانا تیار ہے، پلیز گھر آ جاؤ۔“ مگر نہ تو وہ خود آیا اور نہ ہی اس کا جواب، دونوں بچیاں سوچتی تھیں، وہ بے چینی کے عالم میں لاؤنج میں ٹہلنے لگی، رات کے بارہ کا عمل ہو گا جب اس نے گھر میں قدم رکھا تھا۔

”ارحم! کہاں تھے تم، میں اتنی زیادہ پریشان تھی۔“ اسے آنا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب آئی اور فکر بھرے لہجے میں بولی۔

”کوئی ضرورت نہیں میرے لئے پریشان ہونے کی۔“ وہ غصے سے بھرپور کاٹ دار نظر اس کی سمت اچھا ل کر اندر کی جانب بڑھا۔

”کھانا گرم کروں؟“ اس نے بحث کو پھیلنے سے قبل ہی سمیٹ لیا، وہ ان سنی کر کے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

”ارحم!“ وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

”ارحم! کھانا۔“

”تم کھانا گرم کرو، میں چنچ کر کے آتا ہوں۔“ وہ فریش ہونے چلا گیا، مریم کچھ ابھی، کچھ پریشان سی کھڑی تھی جب وہ واش روم سے نکلا۔

”کیا پکایا ہے؟“ وہ بالوں میں برش کر رہا تھا۔

”میں نے تو کچھ پکایا ہی نہیں، کل کا بھنڈی گوشت پڑا ہے ساتھ میں.....“

”تو کیا اب میں ایک دن پرانا سالن کھاؤں۔“ اس کا موڈ سخت آف ہوا تھا۔

”میں بہت تھک گئی ہوں آج ارحم، تمہیں کالز کرتی رہی کہ کبوں باہر سے کچھ لے آؤ، تم نے پک ہی نہیں کی۔“ اس نے مصالحت آمیز انداز میں وضاحت دی تھی۔

”خود تو تم پارٹی انجوائے کر آئی، کھانا بھی کھا آئی شو ہر جائے جہنم میں اور تم کاوٹ کا رعب مجھ پر مت جھاڑو میں نے نہیں کہا تمہیں جاب کرنے کے لئے۔“ وہ سخت غصے میں تھا، مریم نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا تھا، وہ تو اس طرح کبھی بھی بات نہیں کرتا تھا، پھر آج کیا ہوا۔

”میں کیوں رعب جھاڑوں گی ارحم!“ وہ پست آواز میں بولی تھی۔

”دن بھر کی ٹھکن کے بعد گھر آؤ، تو کوئی سکون نہیں ملتا، جہاں بندے کو کھانا ہی نہیں ملتا، وہاں بیوی کا فائدہ، تم نے ایک کھانا ہی تو بنانا ہوتا ہے اور کرنی کیا ہو، کالج میں دو کلاسیں پڑھانے سے تم تھک جاتی ہو اور میں صبح سے شام جو مغز ماری کرتا ہوں اس کا تمہیں نہیں پتا۔“ وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا، مریم کے لئے اس کا رویہ ناقابل فہم تھا، وہ ایسا تو نہ تھا، پھر کیا ہو گیا اچانک، وہ از حد پریشان تھی۔

”پلیز جان چھوڑ دو میری۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ درشتی سے بولا تھا۔

”نہیں کھانا مجھے کچھ۔“ وہ دھاڑا۔

”ارحم!“ چھن سے کچھ اس کے اندر ٹوٹا تھا، وہ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، جبکہ وہ نگاہیں چرانے لگا۔

”سچ سچ بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے۔“ وہ اس کے قریب آ بیٹھی اور اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر بغور اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”آفس میں کوئی ٹینشن ہے، تمہارا کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے یا پھر۔“ پلیز مجھے سونے دو۔“ وہ جان چھڑاتے ہوئے لیٹ گیا تھا۔

”بھوکے مت سونا ارحم۔“ وہ اس کی منتیں کرنے لگی تھی۔

اس کی کسی بھی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ سو گیا تھا، جبکہ مریم کا سکون غارت ہو گیا تھا، وہ شا کڈ تھی، ارحم نے تو کبھی اس سے اونچی آواز میں بات نہ کی تھی، کجا کہ اس طرح جھگڑا اور لعن طعن، اس نے رات آنکھوں میں کالی تھی، ایک منٹ کے لئے بھی اس کی آنکھ نہ لگی تھی، بار بار آنکھیں بھیکنے لگتیں، دل بھرا جاتا۔

☆☆☆

اگلی صبح اسے ہلکا ہلکا بخار ہو چکا تھا، ساری رات جاگنے سے سر اور آنکھوں میں شدید درد تھا، آنکھیں سوچ گئی تھیں، اس نے بہت محبت اور دل سے ناشتہ بنایا تھا، ارحم نے خاموشی سے ناشتہ کر لیا تھا، اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

”گل بانو رات کا کھانا پڑا ہے، جاتے ہوئے وہ لے جانا۔“ وہ صفائی کے لئے آئی تو مریم تیار ہو رہی تھی، گل بانو نے اثبات میں سر ہلا

دیا۔

”جی بابی۔“ وہ کام کرنے لگی، مریم کو اپنی آنکھوں کی سوچن چھپانے کے لئے آنکھوں پر اچھا خاصا تیز شیڈ لگانا پڑا، عام طور پر وہ ہلکا میک اپ کرتی تھی، کوئی پارٹی بھی ہوتی تو لائٹ میک اپ ہی کیا کرتی۔

”کون کہتا ہے عورت بڑھ لکھ کر، نوکری کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔“ گاڑی کو گیٹ سے نکالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

”وہ چاہے کچھ بھی بن جائے، جتنا بھی کمالے، رہتی مردی محتاج ہی ہے، وہ جب چاہے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ سکتا ہے، سر سے آسمان ہٹا سکتا ہے، اسے اس کی اوقات یاد دلایا سکتا ہے۔“ وہ ارحم کے رویے سے بری طرح ہرٹ ہوئی تھی، کالج میں بے دلی سے کلاس لے کر وہ گھر آ گئی تھی، سارا دن وہ ہر ایک سے چھپتی رہی تھی تاکہ کوئی اس سے سرخ اور سوچی آنکھوں کا راز نہ پوچھے، اسے اپنی عزت، وقار اور پندار بہت عزیز تھا، گھر آ کر اس نے ارحم کے لئے اچھا سا کھانا تیار کیا اور اس کا انتظار کرنے لگی، وہ سارا دن منتظر رہی کہ ارحم اسے کال یا میسج کرے گا، مگر اس کا انتظار لا حاصل ہی رہا، ارحم نے اس سے کوئی کاٹیکٹ نہ کیا۔

ارحم کے آنے سے پہلے اس کے کپڑے نکال کر واش روم میں لٹکائے، ہر چیز کو سلیقے سے سیٹ کیے وہ اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

گل بانو نے اس کی غیر معمولی سنجیدگی کو نوٹ کیا تھا، اس کا دھیان آج اس کی طرف نہ تھا، اس کا نظر انداز کرنا اسے بری طرح کھٹک رہا تھا، وہ تیار ہو کر آفس کے لئے نکلنے لگا تھا، جب وہ کام مکمل کر کے اس کے پاس آئی تھی۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ اس کے سامنے کھڑی وہ آس بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”نہیں۔“ وہ خفیف سا مسکرایا۔

”میری کوئی بات بری لگی ہے؟“ اس نے ایک اور سوال کیا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”رات کو میں نے اتنی مس کالیں دیں، آپ نے فون ہی نہیں کیا۔“ اس نے بڑے لاڈ اور ناز سے اپنا سراس کے بازو سے لگا دیا۔

”رات مریم جاگ رہی تھی، اس لئے کمرے سے نکلنا میرے لئے مشکل تھا۔“ اس نے اپنا بازو اس کے گرد پھیلا کر حصار باندھا۔

”میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں، مجھ سے کبھی دور نہ ہونا ارحم صاحب۔“ وہ اس کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔

”تم مجھے صاحب مت کہا کرو۔“ کل رات سے صبح تک جو اس کا موڈ آف ہوا تھا، تو اب اس کی قربت، اس کا لمس پاتے ہی بحال ہونے لگا تھا۔

”آپ کی نوکر ہوں میں، یہی کہوں گی نہ۔“ اس نے کچھ اس اداسے کہا کہ ارحم نے اسے سیدھا کہا اور دونوں بازو اس کے گلے میں جامل کر دیے، وہ بغور ارحم کے ڈیٹنگ وجود کو دیکھ رہی تھی۔

”آج تو ایسا کہا ہے، دوبارہ نہ کہنا، تم نوکرانی نہیں ملکہ ہو میرے دل کی، یہاں رہتی ہو۔“ اس نے گل بانو کا ہاتھ پکڑ کر سینے پر عین دل کے اوپر رکھا تھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے ہاتھ واپس کھینچا، مگر ارحم کی گرفت مضبوط تھی۔

”خالی دل میں رہنے سے کیا ہوتا ہے، آپ

کی اصل ملکہ تو مریم باجی ہیں، جو آپ کے گھر میں آپ کے ساتھ رہتی ہیں۔“ اس نے دل کی بات آخر کہہ ہی ڈالی تھی اور وہ اس کی بات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ رہا تھا، مگر فی الوقت کچھ نہ کہہ سکا۔

آفس میں اس کا دل کسی کام میں نہ لگ رہا تھا، ایک عجیب سا ہیجان تھا جو اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا، وہ چاہ کر بھی اس میں سے نکل نہ سکتا تھا اور وہ اس میں سے نکلنا بھی نہ چاہتا تھا، عجیب طرح کی سوچیں اسے اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں، وہ گہرا کراٹھا اور آفس کی گلاس وال میں جا کھڑا ہوا۔

”میں مریم کے ساتھ اچھا نہیں کر رہا۔“ دل کے ایک کونے میں ذرا سی بڑی حمیت جو کب سے کر لارہی تھی، ایک دم جھج اٹھی تھی۔

”وہ بھی تو ٹھیک نہیں کرتی نہ، اپنی جاب کے غرور میں رہتی ہے اسے کب میری پرواہ ہے۔“ دل نے فوراً دوسری تاویل پیش کی تھی، وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر کی جانب بڑھا، گھر میں قدم رکھا تو مریم کو اپنا منظر پایا۔

”السلام علیکم!“ اس نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بیک پکٹا تھا، وہ خاموشی سے اندر کی جانب بڑھا۔

”تمہارے کپڑے میں نے واش روم میں لٹکا دیئے ہیں۔“ وہ اس کے پیچھے آئی۔

”فریش ہو کر آ جاؤ، میں کھانا لگاتی ہوں۔“ وہ باہر کی جانب بڑھی۔

”ابھی کھانا نہیں کھاؤں گا چائے پلا دو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا، مریم نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر ایک گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”ارحم! مجھے اور بچیوں کو چھٹیاں ہو رہی ہیں

کل، ہم کب جا رہے ہیں حیدر آباد؟“ رات کے کھانے کے دوران اس نے جانے کا ذکر چھیڑا تو ارجم کا موڈ پھر سے بگڑنے لگا۔

”دیکھو مریم چھٹیاں تمہیں ہو رہی ہیں، مجھے نہیں، میں تو فی الحال نہیں جاسکتا، تم بچیوں کو لے کر چلی جاؤ۔“ اس کی بات پر وہ دل موس کر رہ گئی۔

”مگر ہر سال تمہیں دس چھٹیاں ملتی ہیں، پھر اس بار کیوں نہیں۔“ اس نے استفسار کیا۔

”میں تھکا ہوا آیا ہوں مریم، مجھ سے بحث مت کرو۔“ اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا تھا، کھانا کھا کر وہ اٹھ گیا تو مریم نے سر تھام لیا۔

”یا اللہ! اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔“ اس کی سمجھ سے ارجم ک رویہ باہر تھا، وہ خاموشی سے برتن سمیٹنے لگی۔

ارجم اسے اور بچیوں کو حیدر آباد چھوڑنے جا رہا تھا، آج اس کی پہلی چھٹی تھی، محل بانو صفائی کے لئے آئی تو وہ بچن میں ارجم کے لئے ناشتہ بنا رہی تھی، دونوں بچیاں اندر کمرے میں بیٹھیں تھیں۔

”بات سنو گل بانو۔“ وہ صفائی کر کے جانے لگی تو مریم نے اسے پکارا، وہ رک گئی، ارجم سامنے بیٹھا تھا، وہ بے خیالی میں مریم اور گل بانو کا موازنہ کرنے لگا، وہ مریم سے کافی چھوٹی تھی، اس کا رنگ بھی بہت سفید تھا اور سر و قد کے ساتھ سڈول بدن، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”میں ایک ہفتے کے لئے حیدر آباد جا رہی ہوں، یہ پورا ہفتہ تم کام پر نہ آنا۔“ اس نے اطلاع دی تو وہ سعادتمندی سے سر ہلا کر رہ گئی۔

”جی باجی!“ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

”اور میں نے تمہارے لئے کچھ کپڑے

نکال کر رکھے ہیں، وہ لیتی جاؤ۔“ وہ کپڑے لینے کے لئے اندر گئی تو گل بانو نے معنی خیزی سے ارجم کی جانب دیکھا، جو محبت لٹائی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، اس سے نظر ملی تو اس نے اسے اشارے سے پاس بلایا۔

”کل کام پر آ جانا، میں کل صبح چار بجے واپس آ جاؤں گا۔“ وہ محتاط نظروں سے بند دروازے کی جانب دیکھتا ہوا بولا تھا، وہ خوبصورتی سے مسکرا دی۔

”یہ لو کچھ کپڑے تو صرف ایک مرتبہ پہنے ہیں، میرا تو ویٹ بڑھ گیا ہے، پورے نہیں آتے، تم دہلی چلی ہو تمہیں پورے آ جائیں گے۔“ اس نے کافی بڑا اشارہ لاکر اسے تھمایا، شکریہ ادا کر کے وہ چلی گئی۔

”ارجم!“ وہ تیار ہو رہی تھی، ارجم ایک فائل لے کر بیٹھا ہوا تھا۔

”میری سونے کی بالیاں نظر نہیں آرہیں جو چھٹی Anniversary پر تم نے گفٹ کی تھیں۔“ وہ خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

”مجھے کیا معلوم۔“ وہ نگاہیں چرا گیا۔

”حیرت ہے، آج سے پہلے میری کوئی چیز، کبھی بھی کم نہیں ہوئی۔“ وہ سب جگہ دیکھ چکی تھی مگر بالیوں کو نہ ملتا تھا، نہ وہ ملیں۔

”دیر ہو رہی ہے تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ اس کے کہنے پر وہ مزید تلاش کا ارادہ ترک کرتی ہوئی بچیوں کو تیار کرنے لگی، مگر اس کا دھیان بالیوں میں ہی انکا ہوا تھا۔

☆☆☆

ہمیشہ کی طرح ارجم کے والدین اس سے پر تپاک انداز میں ملے تھے، بچیاں دادا، دادی کے پاس آ کر بہت خوش تھیں۔

”ارجم! تم دو چار دن تو رہو۔“ اسے اگلی صبح

جانے کے لئے تیار ہوتے دیکھ کر امی نے ٹوکا۔
 ”امی مجھے چھٹی نہیں ملی، آفس میں کام بہت زیادہ ہے، جیسے ہی چھٹی ملی میں آ جاؤں گا۔“ اس نے رٹا رٹایا بھانہ سنایا، مریم نے کوئی بھی بات نہ کی، مگر امی نے ارحم کا اس کے ساتھ لیا دیا انداز اور مریم کی اداسی اور غیر معمولی خاموشی اور سنجیدگی کو بھانپ لیا۔

”ہر سال تمہیں چھٹی مل جاتی ہے، اس دفعہ کیا ہوا؟“ انہوں نے استفسار کیا، وہ خاموش رہا، جاتے ہوئے مریم اس کے پیچھے گیٹ تک آئی تھی۔

”میں آنا نہیں چاہتی تھی، مگر چچاں دادا، دادی اور نانا سے ملنے کے لئے بے چین تھیں۔“ وہ چپ کھڑا تھا، جیسے اسے مریم کی کسی بات سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

”میری تمہاری خاموشی اور ناراضی سے بہت پریشان ہوں ارحم، تم ایسے کبھی نہیں تھے، میری ریکویسٹ ہے کہ دوبارہ جب میرے سامنے آؤ تو پہلے ارحم بن کر آنا، میرے والے ارحم۔“ وہ چلا گیا تھا، مریم اسے جاتا دیکھتی رہی تھی، شادی کے بعد آٹھ سالوں میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ اس طرح ارحم کے بغیر وہاں رہنے آئی تھی، ورنہ دونوں بیٹیوں کی پیدائش پر اس کی ساس اسے یہاں لانا چاہتی تھیں، مگر ارحم نے اجازت نہ دی اور مجبوراً انہیں ان دونوں کے پاس جانا پڑا، گیٹ بند کر کے بوجھل قدموں سے ہلتی ہوئی وہ اندر آ گئی اور بچیوں کے پاس لیٹ گئی۔

☆☆☆

وہ گہری نیند سو رہا تھا، جب بیل کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی، پاؤں میں چپل پہن کر وہ بارہ کی جانب بڑھا، گیٹ کھولا، اس کی توقع کے عین

مطابق سامنے گل بانو کھڑی تھی، وہ اسے لے کر اندر آ گیا۔
 ”السلام علیکم!“ گل بانو نے اسے سلام کیا تھا۔

”زہے نصیب۔“ سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا سر کوخم دیا اور اسے ساتھ لے کر اندر آ گیا۔
 ”میں صفائی کر لوں۔“ اس نے دوپٹہ اتار کر لاؤنج کے صوفے پر رکھا اور مڑنے لگی، جب ارحم نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، تمہیں میں نے یہاں صفائی کے لئے بلا یا ہے، گھر صاف ستھرا ہے کوئی ضرورت نہیں صفائی کی۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا، گل بانو مسکرا دی۔

”آج ہم دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔“ وہ باہر سے ناشتہ لے آیا، اسے ساتھ بٹھا کر اپنے ہاتھ سے ناشتہ کروایا، گل بانو کو اپنے نصیبوں پر رشک آنے لگا تھا۔

ارحم نے اسے مریم کا ایک بے حد قیمتی اور نفیس سوٹ پہنایا اور لے کر باہر چلا گیا، سارا دن وہ گھومتے پھرتے رہے، اس کی اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھ کر وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی، اس نے تو ایسا کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا، شام ڈھلے باہر ڈنر کرنے کے بعد وہ گھر واپس آ گئے، وہ سیدھے بیڈ روم میں آئے، گل بانو لباس تبدیل کرنے لگی تھی، مگر ارحم نے منع کر دیا۔

”میں اب گھر چلتی ہوں، رات ہو رہی ہے، ماں کے بار بار فون آ رہے ہیں۔“ وہ ارحم کے سامنے اس کے بیڈ پر بیٹھی تھی۔

”تم آج گھر نہیں جاؤ گی۔“ اس نے حکم صادر کرتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”نہیں..... ارحم۔“ اس نے تھوک نگلا۔

”میں اب جاؤں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی، ارحم نے جھٹکا دیا، وہ بیڈ پر آگری، وہ اس پر جھکا، اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”مجھے پاگل کر کے دیوانہ بنا کے اب مجھ سے دور مت بھاگو، اپنا سب کچھ تمہاری خاطر داؤ پر لگا چکا ہوں۔“ وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا، اس کی گرم سانسیں گل بانو کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں، اس کا دل سینے کے پیچھے میں بے بس قیدی پرندے کی مانند پھڑپھڑانے لگا تھا۔

”سارا دن تو آپ کے ساتھ رہی ہوں، جانے دیں، میں کل جلدی آ جاؤں گی۔“ وہ منت کرنے لگی۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں نے بہت جتن کر کے اپنی بیوی کو یہاں سے بھیجا ہے، تمہاری خاطر، صرف تمہارے لئے۔“ وہ اپنا سب کچھ اس کے حسن پر قربان کرنے کو تیار تھا، مگر وہ مان ہی نہ رہی تھی۔

”پھر میری ماں؟“

”تم اسے کہو مالکوں کے گھر فنکشن ہے، ایک رات کام کے بدلے مجھے دو ہزار ملے گا، وہ تمہیں اجازت دے دے گی۔“ اس نے حل پیش کیا۔

”مگر میری ایک شرط ہے۔“ وہ اس سے صرف دو انچ کے فاصلے پر تھا، اس کی بات سن کر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”مجھے بغیر سنے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“

وہ لا پرواہی سے بولا۔

”آپ مجھ سے نکاح کر لیں۔“ ارحم نے بری طرح چوکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا، وہ جواتنے دنوں سے شش و پنج میں مبتلا تھا، اس

کے دل کی بات گل بانو نے کہہ دی تھی، وہ اس کی بہادری، اعتماد، ہمت اور جرأت پر حیران تھا۔

”نہیں کر سکتے نہ۔“ وہ طنز سے مسکرائی۔

”تو پھر میں نہیں رک سکتی، آپ کے پاس۔“ وہ اٹھ کر پیروں میں جوتے پہننے لگی تھی۔

”رکو۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھی، جب اپنے عقب میں اس کی آواز سن کر رک گئی۔

”مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔“ وہ آنکھیں

پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی، وہ اسے لے کر کورٹ گیا تھا، اس کا ہاتھ تھامے سرور سا وہاں سے نکلا، رات خاصی ہو چکی تھی، اسے لے کر وہ ایک

مہنگے بوتیک پر گیا، وہاں سے ایک بھاری جوڑا خریدا اور پھر اسے پارلر پر لے آیا، اب وہ ایک

دلہن کا روپ دھار چکی تھی، اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے گاڑی تک لایا تھا، آج وہ اس قدر خوش تھا، کہ ہر چیز ہی اسے اچھی اور دلکش لگ رہی تھی

اسے ساتھ لئے وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا تھا، دونوں ہی ایک خواب کی کیفیت میں تھے، دونوں ہی بے یقین اور سرور تھے، ایک دوسرے کو پا کر

شادمان تھے۔

”تو سن گل ارحم۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھا

تھا، لہجے میں شونہی و شرارت سموئے ہوئے۔

”میرے گھر کی صفائی کرتے کرتے تم نے میرے دل کا صفایا کر ڈالا۔“ وہ اسے پیچھے رہا تھا

اس کے لبوں پر حجاب آلود مسکراہٹ رقص کر رہی تھی، وہ اسے سراہ رہا تھا، معتبر کر رہا تھا، ہمیشہ

ساتھ نبھانے کی قسمیں اور وعدے کر رہا تھا اور وہ دم سادے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

”ماما پاپا کہاں گئے۔“ ربیانے خد کر شروع کی تو پھر چپ لینے کا نام نہ لیا، صبح سے شام اور پھر شام سے رات ہو گئی تھی، مگر ارحم نے کوئی

فون نہ کیا تھا، وہ جھنجھلائی ہوئی پھر رہی تھی، جب اس کی ساس اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

”کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے؟“ وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے نرمی سے اپنائیت بھرے لہجے میں بولیں۔

”کچھ بھی نہیں امی۔“ وہ اپنی پریشانی ان سے چھپا گئی، وہ خود بھی نہ جانتی تھی کہ بات کرے تو کیسے کرے اور انہیں بتائے تو کیا۔

”ارحمن کی وجہ سے پریشان ہو؟“ انہوں نے کہا تو مریم نے چونک کر ان کی جانب دیکھا، مگر کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

”مریم بیٹی شوہر کے مزاج کے ہزار موسم ہوتے ہیں ہر موسم کا سمجھنا عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔“ وہ مدبرانہ انداز میں بولیں۔

”یہ جو مرد ہوتا ہے نہ کسی اذیل گھوڑے کی طرح ہوتا ہے، عورت پیار محبت اور توجہ سے اسے اپنا بنا سکتی ہے، خود کو اس کی مرضی کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے، لیکن کرو بیٹا، عورت اگر ملک کی وزیر اعظم بھی بن جائے تو بھی اس کا شوہر اس کے رعب میں نہیں آتا، اس سے متاثر نہیں ہوتا۔“ وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہے، تم ایک نہایت سمجھدار، خدمت گزار اور وفا شعار بیوی ہو، مجھے تم ارحم سے کم عزیز نہیں، ماں سمجھ کر میری بات کو پلو سے پاندھنا۔“ وہ ایسے تمہیدی انداز میں بات کر رہی تھیں، مریم نے استفہامیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

”شوہر سے ضد نہیں کرتے بیٹا اور اگر شوہر ارحم جیسا جان چھڑا کنے والا ہو تو پھر تو ہر گز نہیں۔“ اس نے نا بھجی کے عالم میں ان کی جانب دیکھا تھا۔

”تمہیں ضد کر کے یہاں نہیں آنا چاہیے

تھا، تھوڑا انتظار کر لیتی، شاید اسے جھٹی مل جاتی۔“ اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا تھا۔

”نیکن امی۔“

”میں جانتی ہوں تم اور بچیاں یہاں آنے کے لئے بہت بے چین ہوتی ہو، مگر تھوڑا انتظار کرنا تھا، اب وہ اکیلا کیسے رہے گا، ناشتہ، کھانا، یہ سب کیسے کر لے گا۔“ اور وہ اس بات پر حیران تھی کہ ان سے کس نے کہا کہ وہ ضد کر کے آئی ہے، اسے تو ارحم نے خود کہہ کہہ کر بھیجا ہے کہ امی تم لوگوں کو یاد کر رہی ہیں، پھر خود انہوں نے اسے کال کر کے آنے کے لئے کہا تھا، رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے نا جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

تیری کھڑی میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا

”ارحمن!“ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی تھی، اس کی نظریں وال کلاک کی جانب اٹھی تھیں جو رات کے سوا دو بج رہا تھا۔

”ارحمن تم ٹھیک ہو۔“ اس نے موبائل اٹھا کر اسے میسج کیا، مگر وہاں سے جواب آنے کی اسے کوئی امید نہ تھی، صبح ہونے تک وہ جاگتی رہی تھی، فجر کی اذان پر اس نے بستر چھوڑ دیا تھا، نماز پڑھ کر اس نے ہاتھ بلند کیے تو دل بھرانے لگا۔

”اللہ۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر رخساروں پر بہتے ہوئے اس کے دوپٹے میں کسی راز کی طرح چھپ رہے تھے، وہ کچھ نہ جانتی تھی اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، مگر اللہ سب جانتا تھا، وہ سب دیکھ رہا تھا، وہ اس کی اذیت کو محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

ارحمن کو ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی دس روز کی جھٹی مل گئی تھی، وہ گل بانو کو ساتھ لے کر مری،

گول گول گھونسنے لگی، اس نے سیاہ کلر کی کشمیری فراک پہن رکھی تھی، جس پر شیشوں اور دھاگوں سے کام کیا گیا تھا، ارحم مہوت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ بھی آجائیں۔“ اس نے ارحم کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تھا، اس نے چہرہ آسمان کی جانب کر کے، ہاتھ پھیلا کر مٹیوں میں بارش کو قید کرنا چاہا، اس کے گلابی رخساروں پر بہتا بارش کا پانی عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔

”بس کرو اب۔“ ارحم اسے زبردستی اندر لے آیا تھا، ارحم کافی پیٹنے لگا تھا، جبکہ وہ لباس تبدیل کر کے آئی اور اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”میں نے اپنی زندگی میں تمہارے جیسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔“

اس کے دائیں ہاتھ میں کافی گامگ تھا، جبکہ بائیں ہاتھ اس کی بھٹی زلفوں میں سرسرا رہا تھا، وہ آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

”اس نے تمہیں بہت فرصت میں بنایا ہے۔“ اس کی بات سے گل بانو کے لبوں پر ہلکا سا تبسم ابھر کر فوراً معدوم ہو گیا تھا، وہ اس کی ایسی باتوں کی عادی ہو گئی تھی۔

”میرا دل کرتا ہے تمہیں لے کر کہیں دور چلا جاؤں، جہاں صرف تم اور میں ہوں اور کوئی بھی نہ ہو۔“ اس نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”مریم بھی نہیں؟“ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

”کوئی بھی نہیں۔“ وہ سیدھا ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔

”مجھے ڈر لگتا ہے ارحم، مریم آپ کو مجھ سے چھین نہ لے۔“ اس نے دل کا خدشہ بیان کیا۔

سوات، کاغان، ناران اور نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا تھا، اس کی ہمراہی میں وہ اور بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی، خوبصورت لیئرز میں کٹے بال، جدید تراش خراش کا لباس پہنے، کانوں میں سونے کی بالیاں، گلے میں چین، ہاتھوں میں انگوٹھیاں، اس سب کے ساتھ ارحم کا ساتھ اور اس کی محبت کا غرور اس کی آنکھوں کو ایک الوہی روشنی بخش گیا تھا، اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مال روڈ کی شاہیں پر شاہنگ کرتے ہوئے وہ کہیں سے بھی گل بانو نہ لگ رہی تھی، وہ ہر زاویے سے ایک امیر کبیر شخص کی با اعتماد داور ماڈرن بیوی دکھائی دیتی تھی، وہ سارا دن گھومتے اور رات جب وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر اپنا آپ اس کے سپرد کر دیتی تو ارحم دنیا کو بھولنے لگتا، مریم اور اس کی بچیاں کسی بھولی بھری یاد کی طرح اگر کبھی ذہن کے گوشے میں جگمگانے لگتیں تو وہ فوراً سر جھٹک کر ان کی یاد سے پیچھا چھڑا لیتا۔

اس نے مری میں ایک خوبصورت ہٹ کرائے پر خریدنا ہوا تھا، وہ اس پر پیسہ پانی کی طرح بہا رہا تھا، ہر روز اس کی محبت میں اضافہ ہو رہا تھا، وہ کافی بنا کر لاؤنج میں آیا تو اسے وہاں دکھائی نہ دی، بیڈ روم میں دیکھا وہ وہاں بھی نہ تھی، وہ کافی کے مگ ٹیبل پر رکھ کر باہر نکلا تو سامنے وہ لان میں برستی بارش میں بھیگ رہی تھی۔

”گل۔“ وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔
”یہ کیا پاگل پن ہے۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”بیمار ہو جاؤ گی، اتنی سردی میں کون بارش میں نہاتا ہے۔“ وہ اسے اندر لے جانا چاہتا تھا، مگر وہ جانے کے لئے آمادہ نہ تھی۔
”نہیں ہوتا کچھ۔“ اس نے ہاتھ چھڑایا اور

تھا، چھت اس کے اوپر آگری ہو، اسے زور کا چکر آیا تھا۔

”وہ دونوں کانی دنوں سے اکٹھے رہ رہے ہیں، وہ لڑکی بہت حسین ہے۔“ وہ نا جانے کیا کچھ بتا رہی تھی، مریم ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ سب سن رہی تھی، اسے ارحم سے ایسی بے وفائی کی امید نہ تھی، بہت سارا رو لینے کے بعد بھی جب دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا تو اس نے ارحم کو کال ملائی مگر وہ رسیو نہ کر رہا تھا۔

”ارحم اگر آپ آج ہی ہمیں لینے نہ آئے تو میں خود آ جاؤں گی۔“ اس نے بیچ کیا اور اس کی توقع کے عین مطابق اس کا فون آ گیا۔

”اب آرام سے رہو، کیا بے چینی ہے؟“ اس نے چھوٹے ہی طنز کا شتر چھوڑا۔

”بس بہت رہ لیا، بچیاں آپ کو بہت یاد کر رہی ہیں۔“ اس نے اسے یاد دلانا چاہا کہ وہ دو بیٹیوں کا باپ ہے۔

”میں پرسوں آ جاؤں گا۔“ اس نے جان چھڑانا چاہا۔

”آج کیوں نہیں، سنڈے ہے، آپ.....“

”مریم ہر بات پر بحث مت کیا کرو۔“ وہ گرجا، اور فون بند کر دیا اور پھر وہ ہر روز انتظار کرتی مگر وہ نہ آتا، جب ایک ہفتہ مزید گزر گیا تو اس کا ضبط جواب دینے لگا، وہ اپنے سر کے ساتھ گھر کے لئے روانہ ہو گئی، اسے سامنے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

”بہت ضدی عورت ہو تم۔“ وہ نفرت سے پھینکا را۔

بچیاں باپ کو اتنے دنوں کے بعد دیکھ کر بہت خوش تھیں، مگر اس کے انداز میں کوئی گرجبوشی نہ تھی۔

وہ دن بھر گھر سے غائب رہتا، رات کو بھی

”میں صرف تمہارا ہوں۔“ اس نے یقین دلانا چاہا، اس کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے تھے، ساری دنیا کو بھلائے، وہ دونوں ایک دوسرے میں گم تھے، انہیں کچھ ہوش نہ تھا، اپنی اپنی محبت میں دونوں خود غرض ہو چکے تھے، گل بانو اپنی بوڑھی ماں اور ارحم اپنے سب رشتوں کو بھول چکا تھا۔

☆☆☆

ایک ہفتہ ہو چکا تھا، اسے یہاں آئے ہوئے، مگر ارحم سے صرف ایک بار بات ہوئی تھی، وہ اسے بار بار کہہ چکی تھی کہ انہیں آکر لے جائے، مگر وہ بار بار مصروفیت کا بہانہ بنا کر ٹال جاتا تھا، مریم بہت خاموش رہنے لگی تھی، ایک دن کے لئے وہ اپنے ابو کے گھر بھی گئی تھی، اس کی سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کا لیا دیا انداز، ابو کی سرد مہری دیکھ کر وہ اگلے ہی روز خاموشی سے واپس آ گئی۔

وہ ارحم کو کال کرنے کا سوچ رہی تھی کہ اس کی کوئی رابعہ کی کال آ گئی۔

”مریم اگر تم برا نہ مناؤ تو ایک بات کہوں؟“ چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ تمہیدی انداز میں بولی تھی۔

”ہاں کہو۔“ وہ حیران ہوئی۔

”ارحم بھائی آج کل کہاں ہیں؟“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو گھر پر ہی ہیں، میں ادھر سسرال میں آئی ہوئی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”مریم میں نے پرسوں انہیں مری میں ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے، مجھے لگا میرا وہم ہے، مجھے دو تین دفعہ نظر آئے پھر میں نے قریب جا کر دیکھا، وہ ارحم بھائی ہی تھے، وہ دونوں.....“ مریم کے آس پاس دھماکے ہونے لگے تھے، اسے لگا

بچیوں کو سنبھالتی وہ بیمار ہو گئی تھی، مگر ارحم کو مطلق پرواہ نہ تھی۔

☆☆☆

گل بانو کو ارحم نے ایک خوبصورت فلیٹ لے دیا تھا، اس کی خواہش پر فلیٹ اس کے نام کر دیا تھا، اس نے اپنی اب تک کی تمام جمع پونجی اس پر لٹا دی تھی، اور مستقل لٹا رہا تھا، وہ ہر ہفتے اسے گو لڈ کی کوئی نئی جیولری گفٹ کرتا، برینڈڈ کپڑے اور جوتے، وہ اپنا تن من دھن اس پر وار رہا تھا، سب کچھ دونوں ہاتھوں سے اس پر لٹا رہا تھا، مگر پھر بھی یہ سب اس کے حسن اور اداؤں کے سامنے حقیر اور کم تر لگتا تھا۔

وہ اس کے قدموں میں بچھے لگتی تھی، قاتل نظروں سے اس پر ایسے ایسے وار کرتی کہ بچ کر نکلنا ارحم کے لئے ناممکن ہوتا، مریم کے پاس مجبوری سے جاتا بھی تو گل بانو کی اداؤں کے زیر اثر رہتا، اسے وہ ہر طرف دکھائی دیتی تھی، وہ اس کے لئے عشق میں پاگل ہو چکا تھا۔

”پلو اماں!“ وہ فون پر ماں کا حال چال پوچھ رہی تھی جب ارحم آ گیا، اس نے فوراً فون بند کر دیا۔

”کیا کہہ رہی تھی تمہاری اماں؟“ وہ بیڈ پر اس کے قریب لیٹ گیا اور پوچھنے لگا۔
”پوچھ رہی تھیں کہ مالکوں نے کب واپس آنا ہے، وہ مجھ سے اداس ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ایم سوری میری جان تمہیں میری وجہ سے اپنی اماں سے دور ہونا پڑا۔“ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا۔

”میں جلد تمہاری ماں سے جا کر ملوں گا، اور انہیں بتاؤں گا۔“

”نہیں ارحم۔“ اس نے اپنا ہاتھ اس کے

دیر سے آتا، رات رات بھر موبائل لے کر ٹیبل پر گھومتا رہتا، اس کے بدترین خدشات کی تصدیق تو رابعہ نے کر ہی دی تھی مگر دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ ارحم ایسا نہیں ہے، وہ تو بہت پاک فطرت کا مالک ہے، اس نے آج اس سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر اس کے دکھ کی انتہا نہ رہی، جب اس رات ارحم گھر نہ آیا اور پھر یہ اس کا معمول بن گیا، وہ راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا۔

”ارحم!“ وہ دو دن بعد گھر آیا تھا، مریم کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ وہ اس کے سامنے آرکی تھی۔

”میرے پاس تمہاری فضول باتوں کا جواب نہیں ہے۔“ وہ سائیڈ سے ہو کر نکلنے لگا، مریم نے آگے ہو کر اس راستہ روکا۔
”میں مزید برداشت نہیں کر سکتی ارحم میں تمہارے والدین کو بتا دوں گی۔“ اس نے دھمکی دی۔

”میری بات سنو۔“ اس نے انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا۔

”بات گھر سے نکلی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”ارحم۔“ چھن سے کچھ اس کے اندر ٹوٹا تھا، وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ اندر چلا گیا تھا، وہ ٹوٹ رہی تھی، پھر رہی تھی، مگر اسے سمیٹنے والا کوئی نہ تھا، نہ ماں نہ بہن بھائی باپ تھا مگر اسے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

اس نے چپ سادھ لی تھی، اس نے گل بانو کو فون کر کے کام پر بلایا، مگر اس نے معذرت کر لی اور بتایا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے، دکھ کو دل میں دبائے وہ سارا دن اپنے گھر کا کام کرتی،

مریم کے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا، اس نے ارحم کو ساتھ چلنے کے لئے کہا، مگر اس نے صاف انکار کر دیا، وہ سخت دل برداشتہ ہوئی اور دونوں بچیوں کو ساتھ لے کر تنہا ہی حیدر آباد چلی گئی، ابو کی حالت کافی خراب تھی، جیسے بھی تھے اس کے باپ تھے، وہ ڈیڑھ ہفتہ وہاں رہی، مگر ارحم نے ایک مرتبہ بھی فون کر کے حال نہ پوچھا، جیسے ہی اس کی حالت سنبھلی وہ واپسی کے لئے تیار تھی، ایک دن اس نے سسرال میں گزارا۔

”ارحم نے غیر ذمہ داری کی حد کر دی، اسے ساتھ آنا چاہیے تھا تمہارے۔“ اس کے سر نے کہا، مگر وہ خاموش رہی، وہ جب بچیوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو شام اپنا سر منی آچل پھیلا چکی تھی، گیٹ کھلا تھا، وہ سامان لاؤنج میں رکھ کر اور بچیوں کو وہاں بٹھا کر بیڈ روم کی جانب بڑھی، اندر سے نسوانی آواز آرہی تھی، وہ رقابت کی آگ میں جلنے لگی، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا، سامنے جو منظر تھا اس نے اسے دھلا دیا۔

”گل بانو!“ اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی، وہ یہ تو جانتی تھی کہ ارحم کی زندگی میں کوئی لڑکی ہے، مگر وہ لڑکی اس کی میڈ ہوگی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ارحم سامنے بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا، وہ اس کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی، اس کے سینے پر باپ کون کا باؤل رکھا ہوا تھا، جس میں سے ارحم ایک باپ کون اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتا اور دوسرا اس کے منہ میں۔

”ہاؤ ڈیئر یو۔“ وہ دونوں اسے اچانک سامنے دیکھ کر گنگ رہ گئے تھے، دونوں کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا، گل بانو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ

”اماں کو مت بتائیے گا کہ آپ نے مجھ سے شادی کر لی ہے، میری ماں مرجائے گی۔“ وہ باتچی لہجے میں بولی۔

”تو پھر میں اس سے تمہارا رشتہ مانگ لیتا ہوں ایسے تو وہ مان جائے گی نہ؟“ اس نے ایک اور حل پیش کیا۔

”ابھی چھوڑیں ان باتوں کو، چائے بناؤں آپ کے لئے؟“ وہ اٹھنے لگی، ارحم نے اسے روک دیا۔

”تم میرے سامنے ہوتی ہو تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔“ وہ بخور لہجے میں بولا۔

”مگر آپ تھکے ہوئے ہیں۔“ اس نے ارحم کے بالوں میں انگلیاں پھرنی شروع کر دیں۔

”تمہیں دیکھ کر تھکن بھی اتر جاتی ہے۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے سینے پر رکھ لیا، اب وہ جھک کر اس کے پاؤں میں سے جوئے اتارنے لگی تھی۔

”ارے..... رے، یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ فوراً سیدھا ہوا۔

”تمہاری جگہ یہاں ہے۔“ اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔

”دوبارہ میرے جوتوں کو ہاتھ نہ لگانا۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھالیا۔

”مجھے اچھا لگتا ہے، آپ کے سب کام اپنے ہاتھوں سے کرنا۔“ اس کے شانے پر سر رکھے، نروٹھے پن سے بولی، تو ارحم نہال ہو گیا، بھلا مریم کب ایسی باتیں کرتی تھی، اس نے کب اس کے جوئے اتارے تھے، اس نے خوش ہو کر اسے بانہوں کے حصار میں لے لیا اور اس کے خوبصورت بالوں کو چوم ڈالا اور اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرنے لگا۔

گئی تھی۔

ہے۔“ وہ اس کی گرفت میں مچل رہی تھی۔

گاڑی چلنے کی آواز پر اس نے بیٹی کو چھوڑا اور وہیں نیچے بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی، دونوں بیٹیاں کبھی ہوائی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز اس کی ساس اور سر وہاں آ گئے تھے، انہوں نے بیٹے کو ہر طرح سے سمجھایا، بجھایا مگر اس کی عقل پر گل بانو کے عشق کا پردہ پڑ چکا تھا۔

”اگر تم نے اس لڑکی کو طلاق نہ دی تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔“ کریم الدین نے آخری دھمکی دی، مگر اسے مطلق پرواہ نہ تھی۔

”کر دیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”ارحتم تم اپنی بیٹیوں کے متعلق ہی سوچ لیتے۔“ امی نے اسے گھر کا، مگر وہ خاموش رہا اسے کسی کی باتوں کی پرواہ نہ تھی، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو کریم الدین نے مریم سے اپنا اور بچیوں کا سامان پیک کرنے کے لئے کہا اور یہی تو وہ چاہتا تھا۔

”تم نے جو میرے ساتھ کیا ہے ارحم، اس کی جزا ضرور پاؤ گے۔“ وہ روتے ہوئے اس کی دہلیز پر کڑک رہی تھی، اس نے ایک بار بھی اسے نہ روکا تھا، وہ بہت سکون سے اپنے کمرے میں لیٹا اس کے جانے کا منتظر تھا۔

”میری محبت اور وفا کا تم نے یہ صلہ دیا ہے کہ ایک نوکرانی کو میری سوتن بنا دیا۔“ وہ تمام راستہ روتی رہی تھی، اس کی ساس اور سر سخت شرمندہ تھے، ان کے پاس تو الفاظ ہی نہ تھے کہ اس سے معذرت کرتے، یا اسے بہلاتے۔

وہ مجھ کو چھوڑ کر جس آدمی کے پاس گیا برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

”تم اتنے گھٹیا ہو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، گل بانو اس کے پیچھے چھپی ہوئی تھی، وہ تھر تھکا رہی تھی۔

”یہ ہے تمہاری چوائس، ایک گھر گھر کام کرنے والی میڈ، آخ۔“ وہ حقارت آمیز لہجے میں بولی۔

”یہ گندا کھیل کھیلنے سے پہلے اتنا تو سوچ لیتے تم دو بیٹیوں کے باپ ہو۔“ وہ مسلسل بول رہی تھی وہ دونوں چپ تھے۔

”تم ادھر سامنے آؤ، نکلو میرے گھر سے اور دوبارہ.....“

”خبردار۔“ اس نے گل بانو کو ہاتھ بڑھا کر سامنے لانا چاہا، جب ارحم نے اسے دھکا دیا اور دھاڑا۔

”یہ تمہاری میڈ نہیں بیوی ہے میری، ہاتھ توڑ دوں گا اگر اس کے قریب آئی۔“ وہ شعلہ باز لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے گرجا۔

”ارحتم!“ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹنے لگی تھی، اس نے تمام ہمت جمع کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔

”نکل جاؤ یہاں سے لے کر اسے، میں نہیں چاہتی میری بیٹیاں اپنے باپ کا یہ گندہ روپ دیکھیں، سوچو ذرا وہ تمہیں اپنی میڈ کے ساتھ دیکھ کر کیا فیصل کریں گی۔“ وہ ٹوٹے پھرے لہجے میں بولی تھی، وہ مڑا گل بانو کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی جانب بڑھا۔

”پاپا!“ وہ دروازے میں کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی تھی، اس کا ہر اٹھتا قدم مریم کے دل پر پڑ رہا تھا، اریبا اسے دیکھ کر اس کے پیچھے بھاگی تھی، مریم نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا۔

”ماما چھوڑیں، مجھے پاپا کے پاس جانا

بے چینی کے ان گنت دن اور اذیت کی بے شمار راتیں گزارتے گزارتے اس کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور بچیوں کا بھی سکول کھل گیا تھا، اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

”بیٹا تمہارا کالج کھل گیا ہے، اب آگے کا کیا سوچا ہے؟“ شام کے وقت اپنی ساس اور سسر کے پاس وہ بیٹھی تھی جب اس کے سر نے پوچھا۔

”ابو میں کل جا رہی ہوں واپس۔“ اس نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا تھا، وہ دونوں خوش تھے۔

”تم اس کی بچیوں کی ماں ہو، آخر کو لوٹ کر تمہارے گھر ہی آئے گا۔“ اس کی ساس نے سمجھایا۔

”امی میں ارحم کے گھر نہیں جاؤں گی۔“ اس نے اطلاع دی۔

”تو؟“ اس کے سسر بولے۔

”میں اپنے ابو کے گھر پر رہوں گی۔“ اس کے بتانے پر وہ دونوں خاموش ہو گئے، بولتے بھی تو کیا، ان کے بیٹے نے کچھ کہنے کے قابل چھوڑا ہی کب تھا۔

وہ اپنا ضروری سامان اور بچیوں کی چیزیں لے کر اپنے باپ کے گھر آ گئی تھی اور یہاں آ کر اذیت کا ایک نیا باب کھل گیا تھا، اس کی سوتیلی ماں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ تین ماں بیٹیوں کو فارغ بٹھا کر نہیں کھلایا پلایا جاسکتا، اس لئے اسے کالج سے واپس آ کر دوپہر کا کھانا، شام کی چائے اور رات کا کھانا بنانا پڑتا ہے، کبھی سوتیلے بھائیوں کے دوست آ جاتے ان کے لئے وقت بے وقت کھانا اور چائے بنانی پڑتی، کبھی امی کو اس سے پیسے چاہیے ہوتے اور کبھی بہن

”مریم اپنی بیٹی کو لے کر جاؤ رو رو کر دماغ کھا رہی ہے۔“ وہ بچن میں کھپ رہی ہوتی تو امی کی آواز آتی، وہ بھاگ کر نکلتی پیچھے یا تو دودھ ابل کر چولہا خراب ہو جاتا یا ہنڈیا بھل جاتی۔

”منحوس نہ ہوں تو، اتنا مہنگا شو پیس توڑ دیا۔“ ساریہ کے ہاتھ سے کرشل کا شو پیس گر کر ٹوٹ گیا، امی نے پھینک اس کے گال پر مارا، وہ بہت دیر روئی رہی، ساتھ مریم بھی۔

”ماما پاپا کہاں ہیں، ہم اپنے گھر کب جائیں گے۔“ اریبا اچھی خاصی سمجھدار تھی، وہ دیکھتی تھی کہ اس کی ماں یہاں سب کی نوکر بنی ہوئی ہے، ہر ایک اس پر رعب جھاڑتا ہے، اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا، اور آج تو نانی نے ساریہ کو مارا بھی تھا، وہ سہم گئی تھی۔

”آپ کے پاپا ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں واپس آئیں گے تو ہم اپنے گھر چلیں گے۔“ وہ اسے بہلاتی۔

”پاپا فون بھی نہیں کرتے۔“ وہ پلاکی ذہن تھی، اس بات پر مریم چپ ہو جاتی، وہ اکثر اسے لا جواب کر دیتی تھی۔

”ویسے بڑا کمینہ نکلا تمہارا شوہر۔“ امی اس کی بچیوں کے سامنے ارحم کے لئے ایسے الفاظ بولتیں تو وہ ہٹکا کر بچیوں کو دیکھتی۔

”باجی تمہاری عقل کیا گھاس چرنے لگی تھی کہ گھر میں خوبصورت نوکرانی رکھ لی۔“ اس نے تو کسی کو کچھ نہ بتایا تھا مگر اس کے ابو نے خود ارحم کے والد سے فون پر سب معلوم کر لیا تھا، اس کی چھوٹی بہن ذکیہ بدتمیزی سے تسخر اڑاتے ہوئے بولی۔

”یہ جو نوکرانی پیشہ خواتین ہوتی ہیں نہ ان کو گھر کا کام کرتے ہوئے ویسے ہی موت پڑنی

نے اپنے موبائل فون سے اس کی ایک تصویر نکالی اور ایس ایچ او کو دکھائی۔

”یہ تمہاری بیوی ہے؟“ وہ موچخوں کو تاؤ دے کر بولا۔

”جی!“ ارحم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”نوید!“ اس نے سامنے چوکس کھڑے سپاہی کو آواز دی۔

”لیس سر!“ وہ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلوٹ کرتے ہوئے بولا۔

”ادھر آؤ۔“ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔

”اسے پہچانا۔“ ایس ایچ او نے موبائل اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔

”ارے او.....“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”سریہ وہی لڑکی تو ہے جو بے وقوف اور سیدھے سادے نوجوانوں سے شادی کا ڈرامہ

رچاتی ہے اور پھر انہیں لوٹ کر بھاگ جاتی ہے۔“ اس کی بات سن کر ارحم کی شئی کم ہو گئی تھی۔

”یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اسے یقین نہ رہا تھا۔

”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، یہ میری بیوی ہے اور بہت معصوم ہے۔“

”جی بالکل۔“ ایس ایچ او اس کی بات کاٹ کر طفر سے گویا ہوا۔

”معصومیت ہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جناب۔“ ایس ایچ او نے اس کی معلومات

میں اضافہ کیا، اسے کسی طرح یقین نہ آیا تھا، وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی اس کے ساتھ، وہ تو اسے بے

حد چاہتا تھا، اس کی خاطر اپنا ہنسا ہنسا گھر اجاڑ بیٹھا تھا۔

☆☆☆

مریم جانتی تھی وہ آئے گا، ایک نہ ایک دن

ہے۔“ اس کی بات پر امی نے گوہر افشاری کی تھی، ان ماں بیٹیوں کو تو آج بھی وہ دن یاد تھا جب ارحم جیسے شاندار شخص کا رشتہ مریم کے لئے آیا تھا، انہوں نے بہت باپڑیلے تھے کہ ذکیہ کی شادی اس سے کروا دی مگر ارحم نے مان کر نہ دیا، وہ خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

”اسے کچھ کہتے رہو، بولتی تو نہیں ہے۔“ اپنے عقب میں اس نے اپنے بھائی جواد کی آواز سنی۔

دل دکھ سے بھرنے لگا تھا، مگر وہ کچھ نہ کر سکتی تھی، سواپنے آنسو پی کر وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

ارحم آفس سے جلدی اٹھ گیا تھا، اس کا ارادہ گل بانو کو شاپنگ کروانے کا تھا اور اس کے بعد

اچھا سا ڈنر کرنے کا پلان تھا، وہ خوشی کے عالم میں سیٹی بجاتا ہوا ایڈروم میں داخل ہوا۔

”گل!“ وہ اسے پکارنے لگا۔

”کدھر ہو میری جان۔“ اسے وہ کہیں دکھائی نہ دی، چند ثانیے اس کا انتظار کرنے کے

بعد وہ آگے بڑھا اور واش روم کے بند دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

”گل بانو۔“ وہ تیزی سے مڑا اور پھر پورے گھر میں اسے تلاش کیا مگر وہ کہیں نہ ملی،

شام سے رات ہو گئی مگر وہ گھر نہ آئی، ارحم متفکر ہو کر اس کے بتائے ہوئے اس کی ماں کے

ایڈریس پر گیا مگر وہاں سے پتا چلا اس نام کی کوئی ماں بیٹی وہاں نہ رہتی تھیں۔

”کہاں چلی گئی۔“ سخت پریشانی کے عالم میں اسے تلاش کرتے کرتے وہ پولیس اسٹیشن پہنچ گیا اور رپورٹ درج کروائی۔

”بیوی کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس؟“ ایس ایچ او نے سوال کیا، ناچاہتے ہوئے بھی اس

ضرور پلٹے گا مگر تب تک وہ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھی۔

وہ خاموشی سے اپنا اور بچیوں کا سامان سمیٹ رہی تھی دونوں بچیاں اتنے دنوں کے بعد باپ کو دیکھ کر بہت خوش تھیں۔

”مریم!“ امی کا پتی کا پتی آئیں۔

”میں تو کہتی ہوں اتنے خبیث مہاں سے طلاق لے لو۔“ انہوں نے بغیر کوئی مکی لپٹی رکھے، کہا تو مریم کے چہرے سمیٹے ہاتھ رک گئے۔

”اللہ نہ کرے۔“ وہ پلٹی، بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”اتنی ہی اس آوارہ سے محبت تھی تو یہاں کیوں آئی تھی۔“ وہ غصے سے بھٹکائیں، وہ تو بہت خوش تھیں کہ جس آدمی نے ان کی بیٹی کو نہ بسایا اس کے ساتھ مریم بھی نہ بس سکی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور پلٹ کر دوبارہ اپنا کام کرنے لگی، کچھ دیر کھڑی وہ اسے سخت ست سنا رہی ہیں اور جب مریم بولنے پر آمادہ نہ ہوئی تو وہ پلٹ گئیں۔

☆☆☆

لٹا پٹا ارحم گھر واپس آیا تو ایک اور قیامت اس کی منتظر تھی، اس کا فلیٹ سیل ہو چکا تھا، فلیٹ کے دروازے پر کھڑا گارڈ اسے اندر نہ جانے دے رہا تھا۔

”دیکھو یہ میرا گھر ہے، مجھے اندر جانے دو۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں سر، یہ تو سیل ہو چکا ہے۔“ گارڈ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، مگر اس کا دل کسی طور اس حقیقت کو ماننے کو تیار نہ تھا۔

گل بانولا کمر میں سے تمام زیورات، نقدی اور فلیٹ کے کاغذات لے کر فرار ہو چکی تھی۔

”اتنا بڑا دھوکہ۔“ چکراتے سر کو تھامتے

ہوئے وہ لفٹ کی جانب بڑھا۔

”کیا یہ دھوکہ اس سے بڑا ہے جو تم نے مریم کو دیا؟“ کوئی اس کے اندر زور سے چلایا۔

”مریم جیسی باوقار، شریف اور نیک بیوی کو چھوڑ کر ایک مکار عورت کو اپنا تھانہ، اب چکھو مزہ۔“ وہ بہت دنوں بعد گھر آیا تھا، لاؤنج میں قدم رکھتے ہی یادوں نے اس پر یلغار کیا تھا۔

”مریم!“ وہ لاؤنج کے صوفے پر ڈھے گیا، ہر طرف گھپ اندھیرا تھا، ایسا ہی اندھیرا اس کے اندر بھی تھا۔

”واپس آ جاؤ پلیز۔“ اس نے صوفے کی پشت سے ٹپک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔

”پاپا۔“ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب وہ گل بانولا کے کمرہاں سے جا رہا تھا تو اس کی بیٹی اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی اسے آوازیں دے رہی تھی۔

اور پھر یقیناً مریم نے اسے پکڑ لیا تھا، وہ بے چین ہو کر اٹھا اور اپنے بیدروم کی جانب چل پڑا، اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا تو اسے ٹھوکر لگی۔

”مریم!“ بے اختیار اس کے منہ سے مریم کا نام نکلا تھا۔

”کیا کر بیٹھائیں؟“ وہ اپنے بیدروم میں آ گیا اور لائٹ آن کی۔

”اف۔“ ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ موجود تھی، سوائے مریم اور اس کی بچیوں کے، ارحم پر ہر طرف سے یادیں یلغار کر رہی تھیں، کچھ تھکاوں کے ناگ اسے بری طرح ڈسنے لگے تھے، وہ سر پکڑ کر گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھا تھا۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا، ارحم دونوں بچیوں کو سینے سے لگائے سو رہا تھا، مریم نے سارے گھر کی

تھی کہ عورت شوہر سے الگ ہو کر بے حیثیت و بے وقعت ہو جاتی ہے اور اسے اب چاہے ارحم سے اعتبار و فائدے یا نہ ملے مگر اس کے ساتھ رہنا تھا، کیونکہ وہ دوبارہ سے ٹھکانہ نہ ہونا چاہتی تھی اور یہی تو عورت کی مجبوری ہے۔

☆☆☆

صفائی ارحم کی پسند کا کھانا بنایا اور فریش ہونے کے لئے روم میں آ گئی، اس نے اپنا نسبتاً اچھا لباس وارڈ روب سے نکالا اور چنچ کرنے کے بعد ہلکا پھلکا میک اپ کرنے کے لئے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی، کتنے دنوں کے بعد وہ آئینے میں خود سے نظریں ملا رہی تھی، ورنہ تو شوہر کی بے وفائی کے بعد وہ دنیا کے ساتھ ساتھ خود سے بھی نظریں چرا رہی تھی۔

”میں مسز مریم ارحم، جسے اپنی محبت اور شوہر پر بڑا ناز تھا، بہت سکون کے ساتھ، بے فکری زندگی گزار رہی تھی اور پھر اپنے شوہر کی بے وفائی پر منہ کے بل گری۔“

”میں مانتی ہوں سارا قصور ارحم کا نہیں ہے، مرد کو بھی سنووری، فریش پیوی چاہیے ہوتی ہے، اور میں بیشتر ورکنگ ویمنز کی طرح صبح تک سک سے تیار کالج جاتی اور واپس گھر آ کر سب سے ہلکے اور سادے کپڑے پہن لیتی، بچوں کے ساتھ مصروف ہو کر ارحم اور اس کی خواہشات کو یکسر فراموش کر دیتی اور پھر اپنی زندگی کی سب سے سنگین غلطی جو میں نے کی وہ یہی تھی کہ ایک کم عمر اور حسین ملازمہ کو اپنے شوہر کے پاس تنہا چھوڑ کر چلی جاتی تھی، جہاں نا محرم مرد اور عورت تنہا ہوتے ہیں وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔“

”میں نے انہیں پورا پورا موقع دیا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔“ اس نے تیار ہوتے ہوئے ایک آخری نظر آئینے پر ڈالتے ہوئے سوچا اور بچن میں آ گئی، ارحم اٹھ رہا تھا اور اسے اس کے لئے کھانا لگانا تھا، وہ غلطیاں جو اس سے ہوئی تھیں اور وہ جو اس نے نہیں کی تھیں، سب کو سدھانا تھا، اپنے ٹوٹے ہوئے اعتبار کی کرجیاں جو اس کے پاؤں اور آنکھوں میں چھ رہی تھیں انہیں خود ہی نکالنا تھا، کیونکہ وہ جان گئی

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اور دو کی آخری کتاب.....
- ☆ شمار کنندہ.....
- ☆ دنیا کول ہے.....
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....
- ☆ چلے ہو تو چین کو چلیے.....
- ☆ گری نگری پھر اسافر.....
- ☆ خط انشاء جی کے.....
- ☆ اس بستی کے اک کوپے میں.....
- ☆ چاند نگر.....
- ☆ دل و جی.....
- ☆ آپ سے کیا پڑا.....

ڈاکٹر مولوی عبد الحق

- ☆ قوائد اردو.....
- ☆ انتخاب کلام ہیر.....

ڈاکٹر سید عبداللہ

- ☆ طیف نثر.....
- ☆ طیف غزل.....
- ☆ طیف اقبال.....

لاہور اکیڈمی

چوک اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797

لیکچرنگ

صباحاویہ



اشمل کا نویرا کے آٹا فانا طے پا جانے والی منگنی میں شرکت نہ کر پانا تھا۔
اشمل کی یونیورسٹی سے کلاسز آف تھیں تو گزشتہ ایک ماہ سے فیلٹی کے ساتھ اسلام آباد آؤٹنگ کی غرض سے گئی تھی، اسی دوران نویرا کی منگنی ہو گئی، اس کے شدید اصرار کے باوجود اشمل شرکت نہیں کر پائی نتیجتاً وہ سخت ناراض ہو چکی تھی، لہذا گھر پہنچتے ہی اشمل نے سب سے پہلے گل کدہ کا رخ کیا۔

مقصد جلد از جلد نویرا کو منانا تھا، اسی ایکساٹمنٹ اور سرپرائز دینے کے چکر میں اشمل نے اسے اپنی آمد کے بارے میں مطلع نہیں کیا، اسے دیکھتے ہی نیاز چچا (چوکیدار) نے گیٹ کھولا، ان سے سلام دعا کر کے وہ اندر کی سمت لپکی، لاؤنچ میں داخل ہوتے ہی غیر معمولی خاموشی نے اس کا خیر مقدم کیا، یقیناً سب اپنے اپنے کمروں میں مقید تھے کیونکہ نیاز چچا کی بابت وہ نویرا کے متعلق دریافت کر چکی تھی اور تمام جملہ افراد گھر پر ہی موجود تھے، لیکن اس وقت گل کدہ کی خاموشی اور گھروالوں کا محو استراحت ہونا ایک غیر معمولی اور حیران کن بات تھی، یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے اپنے قدم نویرا کے کمرے کی سمت بڑھا دیئے، اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر تاب گھمائی تو ہلکی سی ملک کی آواز سے دروازہ کھل گیا یعنی دروازہ صرف بند تھا لا کڈ نہیں، سامنے ہی بیڈ پر سر تک کبل تانے وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی، اشمل نے حیرت سے دے قدموں فضاؤں میں اترتی گہری تاریکی دیکھی یقیناً یہ سونے کا وقت نہیں تھا۔

”اوہو..... تو ابھی تک نیند کے مزے لوٹے جا رہے ہیں، ایک مہینہ تم سے دور کیا ہوئی تم نے سارے اہم کام کر لئے اور تو اور سونے کے

اشمل نے نمرہ کے چہرے کی بدلتی رنگت کو بخوبی محسوس کیا، دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ آنسوؤں کی نمی بھی معصوم چہرے کی شہد رنگ آنکھوں میں چھلکی جاتی تھی، محسوس میں اس کے صبح چہرے کی رنگت خطرناک حد تک زرد پڑ گئی، اس نے آنسو ضبط کرنے کو بچلا ہونٹ بے دردی سے کچلا، اس کی پتھرائی آنکھیں اشمل کے چہرے کا ورد کر رہی تھیں، اشمل نے بے ساختہ نظریں چراغیں۔

اشمل بھلا اس کی آنکھوں میں جھلکتے عکس کے استفہام نہیں سمجھتی تھی، ان ڈبڈبائی نگاہوں میں تیرتی بے بسی کے منہبوم وہ خوب سمجھتی تھی، سات سال قبل وہ خود بھی تو انہی احساسات سے دوچار ہوئی تھی، ماضی کی دردناک یادوں نے اشمل کا دامن تھام لیا، ان دامن گیر ہوتی کر بناک یادوں کو جھٹکنے کی کوشش میں اس کا شعور تھکنے لگا تھا، وہ بے بس ہونے لگی اس نے خود کو ان کے سپردیوں کر دیا جیسے ڈوبنے والا خود کو لاچار محسوس کر کے تلاطم خیز موجوں کے دوش پر چھوڑ دیتا ہے، مبہم سی مسکراہٹ، شوخ نگاہیں، جاذب شخصیت، ساحر و دلکش سراپا اس کی بند آنکھوں کے پردوں میں گھسا چلا آیا۔

☆☆☆

وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی، جب پرندوں کے غول واپسی کے سفر پر گامزن تھے تو شاہ خاور افق کے اس پار سندوری سرخی پھیلائے مغرب کے کناروں پر ڈوبنے کی تیاریوں میں تھا، آج اشمل پورے ایک ماہ بعد اسلام آباد سے لوٹی تھی اور بیگ رکھتے ہی وہ ”گل کدہ“ کی سمت دوڑی، دیوار سے چڑی دیوار والے گھر میں اس کی عزیز از جان دوست کم پڑوسن مقیم تھی اور آج کل اس سے سخت ناراض تھی وجہ شدید خواہش کے باوجود

اوقات کار بھی تبدیل کر لئے۔“

دھپ سے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اشمیل نے ہلکے ہلکے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا، اشارہ نویرا کی آنچ منٹ کی سمت تھا، آواز کا گراف بھی قدرے بلند تھا۔

”بس بھی کرو نویرا، اتنی بلند آواز سے مردے بھی بیدار ہو جائیں، میرے ٹانسیلو بلاسٹ ہو گئے ہیں لیکن مادام کی نیند میں کوئی خلل برپا نہیں ہوا۔“ خوابیدہ وجود میں ذرا بھی حرکت نہ ہوئی تو اشمیل مزید گویا ہوئی۔

”نویرا کی چٹی..... رحم کرو یار..... اتنی ناراضی، ایک میں ہوں ذرا سنا بھی آرام کے بغیر تمہیں منانے پہنچ گئی اور یہاں آپ کے خرے ہی الامان۔“ اسے ٹھس لیٹے دیکھ کر اشمیل اچھی خاصی روہانسی ہو گئی۔

جب دوسری طرف سے پھر بھی رسپانس نہیں ملا تو اسے بے ساختہ شرارت سوچی اس نے دبے قدموں سے سائیڈ ٹیبل سے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک لمحے میں چہرے سے کسبل ہٹایا اور پورا کا پورا جگ اٹھایا، اس پوری کارروائی میں چند لمحے ہی لگے تھے، جس طرح خوابیدہ وجود جھنجھٹا کر اٹھا تھا کوشش کے باوجود وہ اپنے قبضے پر قابو نہ پاسکی، ہنسی کو بریک تو تباہ لگی جب ہیکے بالوں اور چہرے والے شخص پر نظر پڑی۔

”بکھرے بال، نیند کا نثار چھلکاتی آنکھیں، جن میں ہلکی سی گلابی سرخی بڑی نمایاں تھی، سوئے سوئے اعصاب، فراخ پیشانی پر ابھرنی بیزاری اور ناگواری کی واضح لکیریں اور چوڑے سینے والا مرد شاید نہیں بلکہ یقینی طور پر نویرا ہرگز نہیں تھا، اس کی زبان لچوں میں گنگ ہوئی، وہ بیڈ پر دوڑانوں ہو کر بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں ابھی تک جگ تھا،

سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے مفلوج ہو کر رہ گئیں، شہد رنگ نگاہیں اس چہرے پر جمی تھیں، جس کے ایک ایک نقش میں اشتعال چھلکا جاتا تھا، انجانے میں وہ بہت بڑی حماقت کر بیٹھی تھی، جس کا احساس نفث و شرمندگی بن کر اس حسین چہرے پر دم ہو گیا تھا، نگاہیں جھکائے، لبوں کو کاٹتی وہ اپنی خجالت پر قابو پانے میں محو تھی۔

”واٹ از دس ٹان سینس۔“ شعلہ بار نگاہوں سے وہ استفسار کر رہا تھا۔

”مم..... مجھے..... لگا..... نویرا۔“ وہ بے ربط سا جواب دے پائی، آنسوؤں کا پھندا حلق میں ایک کر اس کی آواز بلند کر گیا۔

”کیا یہ کوئی جوک تھا؟“ وہ خاموش رہی کیونکہ یہ سوال ہرگز نہیں تھا۔

”آپ واقعی ہی اتنی بے وقوف ہیں یا صرف پوز کر رہی ہیں۔“ اب کی بار نگاہوں کے ساتھ ساتھ اس شخص کا لہجہ بھی سختی سمیٹ لایا تھا، پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو پتی اشمیل ضبط کے آخری دہانے پر کھڑی تھی۔

”ایک چھ فٹ کے لمبے چوڑے مرد اور ایک نازک سی لڑکی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اور چلیں ایک منٹ کے لئے آپ کو اس قدر احمق اور بے وقوف مان بھی لیا جائے تو اتنے میز تو کم از کم آپ کو ہونے ہی چاہیں کہ کسی کے دم میں داخل ہونے سے پہلے دروازہ ناک کیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اجازت طلب کی جاتی ہے۔“

اس شخص کے کڑے تیور اشمیل کو رعایت دینے کے موڈ میں قطعاً نہ تھے۔

”میں نے کہا نا..... مجھے مس انڈر اسٹینڈنگ.....“ اشمیل نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اس کی بات کا ٹ گیا۔

”یہ فضول کے بہانے کسی اور کو سنانا، آپ

قدر سفاکیت اور ظالمانہ کرتا، اس کی نسوانیت کو بے توقیری و تضحیک کے ترازو میں تولتا، ذلت و تذکیل کا بے پایہ احساس اس کے شعور کو چھلنی چھلنی کر رہا تھا تو روح بلبلانہ بھی، وہ جو کوئی بھی تھا اس کی پست اور پراگندہ ذہنیت نے اشمیل کو اپنی ہی نظروں میں گرا دیا، رہ رہ کر اس کے بے رحم لفظوں کی بازگشت پچھلے ہوئے سیسے کی مانند اس کی سماعتوں میں اتر رہی تھی، اس کے رونے میں شدت آئی تھی۔

☆☆☆

”یار میں سوری بول رہا ہوں نا۔“ نویرا یونیورسٹی کے گیٹ تک اس کے پیچھے چل نہیں بلکہ دوڑ رہی تھی، وہ گزشتہ ایک ہفتے سے اسے منانے کی کوشش کر رہی تھی، اگلے دن یونیورسٹی پہنچتے ہی تمام واقعہ نویرا کے علم میں آ گیا تھا اور اشمیل نے تو جیسے نابولنے کی قسم کھا رہی تھی۔

”میری اس میں کیا غلطی ہے۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”تمہاری غلطی یہ ہے کہ تمہارا بھائی آگیا یو کے سے اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“ تیزی سے چلتی اشمیل نے رک کر جارحانہ تیوروں سے جواب دیا۔

”ایک ماہ سے میڈم خود غائب تھیں واپس آئیں تو مجھے بتایا بھی نہیں مجھے کیا الہام ہوتا کہ اشمیل بی بی تشریف لائی ہیں۔“ اس کے سامنے آ کر نویرا نے حساب برابر کیا۔

”اچھا تمہیں الہام نہیں ہوتا، لیکن بھائی صاحب کو اپنے کمرے میں لٹانے کا کیا مقصد تھا۔“ ایک اور فرد جرم عائد ہوئی۔

”تو کیا گیٹ روم میں بھیج دتی، سر پرانز دینے کے چکر میں انہوں نے بھی اپنی آمد سے مطلع نہیں کیا، کوئی روم ریڈی نہیں تھا تو میں نے

جیسی لڑکیوں کو صرف بہانا چاہیے ہوتا ہے لڑکوں کو امپریس کرنے کا، بٹ یونو، لڑکوں کو اپنی زلفوں کا اسیر کرنے کا یہ طریقہ بہت پرانا، گھسا پنا اور اولڈ فیشن ہو چکا ہے، بٹ آئی ایم امپرسڈ، پہلی ملاقات میں اس قدر قربت تو مغرب میں بھی میسر نہیں آتی۔“

اس کے اس گھٹیا تجزیے پر اشمیل کا چہرہ لحوں میں دھواں دھواں ہوا، جس قدر تضحیک آمیز انداز میں اس نے تبصرہ جھاڑا تھا وہ اشمیل کو آگ لگانے کو کافی تھا، اس پر اس شخص کی نگاہوں میں ناچتا مسخر، اشمیل کا بس نہ چلتا تھا اس کا منہ نوچ لیتی پٹھروں کی بادش کردیتی، لیکن وہ کچھ بھی نہ کر پائی، چپ چاپ اس کے رہانت آمیز الفاظ اور بے توقیر جہہ سماعتوں میں اتار دیتی رہی بے بسی کے شدید احساس کے تحت عارض بھیگتے چلے گئے۔

”اب آپ جانے کا قصد کریں گی، مجھے چیخ بھی کرنا ہے۔“ اس کی غیر ہوتی حالت سے لاپرواہی برتتے ہوئے وہ بے زاری سے بولا تو اشمیل کو جیسے ہوش آیا، وہ تیر کی طرح وہاں سے نکلی اور دوڑ لگا دی، یہ سوچے بغیر کہ کوئی اسے یوں بھاگتے دیکھ کر کیا سوچے گا لیکن فی الحال وہ کسی کا بھی سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی، صد شکر کہ ماما اور پاپا بھی آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں جا چکے تھے، ورنہ ان سے سامنا ضرور ہوتا، اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ لاک کیا اور بیڈ پر ڈھسے گئی، اس کا تنفس بے ترتیب تھا تو روح جیسے فنا ہوگئی، آج تک کسی مرد نے اس قدر تلخ اور ذلت آمیز انداز میں بات نہیں کی تھی، بلاشبہ اشمیل سے تنگین غلطی ہوئی تھی جو نادانستہ طور پر ہوئی تھی لیکن اس کا غلط یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس کی ذات کا تجربہ اس

ٹیک لگا کر پیٹھ گیا۔

”بھائی..... آپ میرے سامنے اسے اتنے برے القاب سے نواز رہے ہیں، میری غیر موجودگی میں تو اس کی جان ہی لے لی ہوگی۔“

نور اسراپا احتجاج بنی۔

”بھائی آپ کو اشمیل سے اتنا روڈ لی بی ہو نہیں کرنا چاہیے تھا، اسے تو آپ کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں تھا، وہ تو گزشتہ ایک ماہ سے اسلام آباد آگئی ہوئی تھی، وہ ایسی حرکت کیوں کرے گی، اب وہ ہمارے گھر بھی نہیں آتی چپ سے آپ آئے ہیں۔“ نور تقریباً رو دینے لگی تھی، نور کے ذکر کرنے پر وہ واقعہ ایک بار پھر اس کی یادداشت میں تازہ ہو گیا، اس پجوشن میں وہ واقعی ہی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا اور انتہائی بے تکلیف غیر اخلاقی گفتگو کر گیا تھا جس کا بہر حال صورتحال کلیئر ہونے کے بعد اسے احساس ہو گیا تھا۔

”تو پھر واپس چلا جاؤں۔“ وہ شریر ہوا۔

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ نور نے بھائی کو مصحوبی خفگی سے گھورا۔

”یار تمہاری دوستی ہر بار ادنیٰ ہو گئی حرکتیں کرتی رہتی ہیں تو میرا بدگمان ہونا ایک فطری عمل ہے۔“ شاہ زور نے جیسے اپنا دفاع کیا اور یہ کسی حد تک درست بھی تھا، وہ گزشتہ کئی برسوں سے یو کے میں مقیم تھا اور وہاں صنف نازک کی بے باکیوں سے اچھی طرح واقف تھا، وہ مشرقی لڑکیوں کو ان سے منفرد، ایک خاص فاصلے پر مہذب انداز میں دیکھنے کا معنی تھا لیکن بدقسمتی سے یہاں پر بھی اس کا واسطہ کافی فولڈ قسم کی لڑکیوں سے پڑا تھا، لہذا وہ اچھا خاصا متغیر اور بے زار ہو چکا تھا، یہی بے زاری اور تلخ تجربات اشمیل شفیق کی انسلٹ کا سبب بنے، جس کا اسے

انہیں آرام کرنے کے لئے اپنے روم میں بھیج دیا، بار دو سال بعد لوٹا ہے میرا بھائی، اتنا تو میں کر ہی سکتی تھی ان کے لئے اس سیمپل یار۔“

”او کے اس سیمپل، غلطی ہو گئی مجھ سے جو اسے تم۔“ سمجھ کر ڈیل کیا بٹ اس نے کیا کیا.....“ وہ الفاظ تازیانہ بن کر اس کی عزت نفس کو پچھل گئے ان لمحوں کو یاد کر کے وہ ایک بار پھر جل اٹھی جل جل کر بھسم ہو گئی۔

”اشمیل اس میں تمہارا قصور ہے نا بھائی کا، پچھلی بار جب وہ آئے تھے تو میری کزن نے انہیں امپریس کرنے کے چکر میں کافی الٹی سیدھی حرکتیں کر ڈالیں سوان کا چڑنا ایک نیچرل سی بات ہے۔“ نور نے صفائی پیش کی، اتنے میں نور کو اپنے آس پاس مخصوص ہارن کی آواز سنائی دی تو اس نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا سامنے ہی بلیک لینڈ کرورز میں وہ شخص اپنی پوری مردانہ وجاہت کے ساتھ براجمان تھا، اشمیل کی نگاہوں نے لاشعوری طور پر نور کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو شاہ زور کو دیکھ کر بے ساختہ ہی اس کی آنکھوں میں جلال اتر آیا، مزید نور کی کوئی بھی بات سننے بغیر وہ سامنے پوائنٹ کی سمت بڑھ گئی گو کہ اسے ڈرائیور نے پک کرنے آنا تھا۔

☆☆☆

”کیا ہوا موڈ کیوں آف ہے؟“ شاہ زور نے نور کی سنجیدگی کو شدت سے محسوس کیا جو ایک لمحہ چپ بیٹھنے والوں میں سے نہ تھی تو استفسار کر بیٹھا۔

”آپ کو نہیں پتہ۔“ اس نے منہ بسورا۔

”اف یار تمہاری تمام دوستیں کیا یوں ہی عقل سے پیدل ہیں ساری مس انڈر اسٹینڈنگ ان کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔“ نور کی سنجیدگی کی وجہ جان کر وہ قدرے ریلیکس ہو کر صوفے سے

کسی حد تک افسوس بھی تھا۔

”لیکن اشمیل ایسی نہیں ہے۔“

”اوکے پھر پرالم کیا ہے۔“ اب کی بار شاہ

ذر کچھ سنجیدہ ہوا۔

”پرالم یہ ہے کہ وہ شدید ناراض ہے اور

کسی صورت نہیں مان رہی۔“

”اوہ یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے، خیر یو

ڈونٹ وری کچھ کرتے ہیں۔“ شاہ زر نے

شراریت سے اس کے بال بگاڑے۔

”شیور برو؟“ وہ مشکوک ہوئی۔

”آف کورس مائی لائل اسجبل۔“ وہ مسکرایا تو

نوریا بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

آج ”شفیق ہاؤس“ میں گل کدہ کے تمام

جملہ افراد لانچ پر مدعو تھے، جو خصوصی طور پر شفیق

صاحب (اشمل کے والد) شاہ زر کے اعزاز میں

ارنچ کیا تھا، کچھ ہی عرصے میں وہ ان کا بہترین

دوست بن چکا تھا جس میں زیادہ کمال اس کی

حاضر جوابی اور شوخ و بے تکلف رویے کا تھا اور

یہ ساری معلومات بھی اسے مہما کے توسط سے ملی

تھی مگر اس نے اپنے گھر میں کبھی شاہ زر کو آتے

جاتے نہیں دیکھا تھا، وہ لان میں پچھی سنگی

کرسیوں میں سے ایک پر براجمان بری طرح

کارپوریٹ فنانس کے سوال حل کرنے میں مگن

تھی جب اسے خود پر کسی کی نگاہوں کی پیش کا

احساس ہوا اس نے تصدیق کے لئے سر اٹھا کر

دیکھا تو مقابل نشست پر شاہ زر کو دیکھ کر وہ اچھی

خاصی بدمزہ ہوئی، عام طور پر اشمیل نے اسے ٹو

پیس یا ٹریک سوٹ میں ہی ملبوس دیکھا تھا لیکن

آج سے ہٹ کر وہ کلف شدہ سفید شلوار سوٹ

میں ملبوس تھا اور وہ اس قدر مکمل اور جاذب نظر آ

رہا تھا کہ تمام تر خچی کے باوجود وہ چند ثانیے اس

کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پائی، اسے اقرار

کرنا پڑا کہ اس نے آج تک شاہ زر سے زیادہ

خوبصورت مرد اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔

کیا خاص تھا اس میں بھلا؟ بلکہ یوں کہنا

بے جا نہ ہوگا، کہ کیا خاص نہیں تھا اس میں، شاہ

زر بلال کی آنکھیں جو لمبوں کو جنبش دیئے بنا ہی

باتیں کرتی تھیں، اس کے ابرو، جو سوالیہ انداز

میں اٹھتے تو ہر سمت استفہام کے بادل چھا

جاتے، اس کی مغرور سی کھڑی ناک جو مقابل کو

مغلوب کر دے یا عینانی ہونٹوں کے گوشوں سے

پھوٹا دلکش تبسم، جسے دیکھنے کو ہوا میں ختم جائیں،

وہ پاگل کرتا تھا، وہ طلسم برپا کرتا تھا، وہ اپنے سحر

میں جکڑ لیتا تھا، وہ خود شناسی رکھتا تھا تب ہی تو

اس کی مسکان دھڑکنیں بے ترتیب کر دیتی تھی

تب ہی تو وہ بے نیازی کی حد کر دیتا تھا، اسے

یوں بے خود دیکھ کر شاہ زر نے بے ساختہ گلا

کھینکھا کر صاف کیا، مقصد اس کی محویت توڑنا

تھا، اشمیل نے گھبرا کر نگاہوں کا زاویہ بدلا۔

”آئی ایم ساری..... مجھے غلط نہی ہو گئی،

مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے

تھی۔“ وہ بہت بچے تلے انداز میں گفتگو کر رہا تھا،

کہنے کے ساتھ ہی اس نے سفید خوبصورت

پھولوں کا بے اس کی سمت بڑھایا۔

”آپ کے لئے کس قدر آسان ہے کسی کی

عزت نفس چل کر پھر تین لفظوں سے اس پر مرہم

لگانا۔“ اس ساحر کا طلسم اک لمحے میں پاش پاش

ہو گیا۔

”مرہم لگانے کے اور طریقے بھی آتے

ہیں مجھے، لیکن فی الوقت یہی مناسب لگا باقی کی

کاروائی کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔“ ایک

دم ہی اسے نجانے کیوں اس روٹھی روٹھی معصومی

لڑکی میں دلچسپی ہونے لگی حالانکہ یہاں سوری

کہنے وہ صرف اور صرف نوری کی ضد کی وجہ سے آیا تھا، اس کے لہجے کی شرارت اور آنکھوں میں چمکتا تبسم نجانے کیا باور کروانا چاہتا تھا اشمٰل کے تو گویا سر پر لگی اور ٹکڑوں بجھی۔

”آپ سے میحائی کا کوئی شوق نہیں مجھے اور آپ کی سوری.....“ وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بو کے کا ایک ایک پھول نوج کر سبز گھاس کی زینت بنا دیا، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پیروں سے انہیں مزید روند ڈالا، وہ چپ چاپ سینے پر ہاتھ باندھے اس کی کا گزاری دیکھتا رہا۔

”یہی اوقات ہے آپ کی سوری کی میری نظروں میں۔“ پیروں سے مسلے پھولوں کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے وہ مدہم آواز میں غرائی۔

”نازک لوگوں کا نازک اور خوبصورت چیزوں کے ساتھ ایسا سلوک مجھے قطعی پسند نہیں۔“ اس کا اشارہ پھولوں کے حشر کی سمت تھا۔

”لیکن میں آپ کو اس رویے میں حق بجانب تصور کرتا ہوں، ایک بار میں نے آپ کی انسلف کی جو نادانستہ طور پر ہوئی بدلے میں آپ نے میری انسلف کردی جو دانستہ طور پر کی گئی ہے حساب برابر..... غصہ معاف..... ناؤ سیز فائر۔“

اس کے اس قدر تذلیل بدلے انداز پر شاہ زر کا چہرہ لمحہ بھر کو متغیر ہوا، لیکن خود کو سنبالتا وہ دوستانہ انداز میں گویا ہوا۔

”نوائس امپاسل۔“ نفی میں گردن ہلاتی وہ اندر کی سمت بڑھ گئی، جواباً شاہ زر کی متاسف نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔

☆☆☆

شاہ زر آفس سے واپس آ رہا تھا، اس کی گاڑی نائل اسپڈ پر تھی اور وہ پورے انہماک سے ڈرائیونگ میں مشغول تھا، لیکن پھر بھی نجانے

سات آٹھ سال کا بچہ کہاں سے سامنے آ گیا، اس سے قبل کہ شاہ زر کا پاؤں بریک پر پڑتا کسی نسوانی وجود نے بچے کو آگے کی سمت دھکا دیا اسی اثناء میں شاہ زر کا پاؤں بریک پر پڑا مگر شاید نہیں یقینی طور پر نسوانی وجود گاڑی کی زد میں آ چکا تھا، یہ تمام کارروائی چند لمحوں پر محیط تھی، کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع نہیں ملا، کئی گاڑیاں چرچراہٹ کو خوفناک آواز پیدا کرتیں ساکن ہو گئیں، لمحوں میں جم غفیر لگ گیا، ہڑ بڑاہٹ میں شاہ زر بھی گاڑی سے اترا، ہلکے گلابی اور سیاہ امتزاج کے دیدہ زیب لباس میں ملبوس ایک لڑکی تارکول کی سڑک پر ہوش و خرد سے بے گانہ پڑی تھی، اس کی فائل اور بیگ چند قدموں کی دوری پر پڑا تھا، شاہ زر نے جب اس لڑکی کے چہرے سے بال ہٹائے تو اشمٰل کو دیکھ کر حرج معنوں میں اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑے تھے۔

لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر اس نے اشمٰل کو اٹھا کر گاڑی میں منتقل کیا، کسی نے اس کا بیگ اور فائل بھی اسے تھمائی، ہنڈا کارڈ ہواؤں سے باتیں کرتی ہاسپٹل کی سمت گامزن تھی۔

☆☆☆

”ڈاکٹر انکل کوئی سیریس بات تو نہیں۔“ اس کی میڈیسن کی سلف ڈاکٹر سے پکڑتے ہوئے شاہ زر نے تشویش کے عالم میں پوچھا۔

”نویک مین، سر پر معمولی سی چوٹ ہے اور کچھ خراشیں ہیں چند دن میں ریکور ہو جائیں گی، یہ میڈیسن فائیو ڈیز تک ریکولری یوز کریں، ایوری تھنگ از آل رائٹ۔“

”تھینک یو انکل۔“ شاہ زر سے مصافحہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رانا یوسف کمرے سے باہر نکل گئے جو شاہ زر کے فیملی ڈاکٹر تھے، شاہ زر اشمٰل کو انہی کے ہاسپٹل لایا تھا، ڈاکٹر کے جانے

کے بعد شاہ زربھی بیڈ پر دراز اٹھل کی سمت متوجہ ہوا۔

پیشانی پر سفید بینڈج تھی، بڑی بڑی آنکھیں ہوش و خرد سے بیگانہ، ہاں ہم پیوست تھیں، اس خوابیدہ سی کیفیت میں معصوم اور دلکش نقوش کے ساتھ وہ بے حد مغز دلگ رہی تھی، شاہ زر کے لبوں کے دلکش کناروں میں ایک خوبصورت سی مسکان ابھر کر معدوم ہو گئی، پھر اس نے دھیرے دھیرے اختتام کی جانب گامزن ڈرپ کی طرف دیکھا جو قطرہ قطرہ اس کے بدن میں داخل ہو رہی تھی، کچھ سوچتے ہوئے وہ اس کی میڈیسن لینے میڈیکل سٹور تک چلا گیا۔

جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں اٹھل کی دوائیوں کے علاوہ فریش جوسبز اور فروٹ وغیرہ کے بیگز تھے، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے ماحول میں ہلکا سا ارتعاش برپا ہوا تو اٹھل نے بھی ہولے سے نگاہیں وا کیں، بہر حال اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ وہ این پوزیشن میں نہیں تھی، سر میں شدید نیس اٹھ رہی تھیں، لیکن شاہ زر کو داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھیں تجر سے پھیل گئیں۔

”آپ.....؟“ شاہ زر کے قریب آنے پر اس کے لب پھڑپھڑائے۔

”اب کیسا قیل کر رہی ہیں آپ؟“ اس کے سوال کو نظر انداز کرتا وہ گویا ہوا اور ہاتھ میں پکڑے شاپرز سائڈ ٹیبل پر منتقل کیے۔

”آپ یہاں کیسے؟“ اٹھل کی حیرت بدستور قائم تھی، اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نا کام رہی سر بری طرح چکرایا، جسم سے شدید درد اٹھا۔

”اوں ہوں، اپنے ننھے سے دماغ کو اس قدر مشکل کام پر مت لگائیں، بس مجھے یہ بتائیں

کہ میسجیاں کا شوق بھی رکھتی ہیں۔“ اسے شانوں سے تھام کر اس نے واپس لٹایا، جبکہ وہ نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔

”آپ مین روڈ پر کیا کر رہی تھیں۔“ اسے حیرت سے گھورنے پر شاہ زر نے ہلکے ہلکے انداز میں پوچھا، اٹھل کو یاد آ رہا تھا کہ وہ کسی گاڑی سے ٹکرائی تھی اور پھر سب کچھ جیسے اندھیرے میں گمڈ ہو گیا۔

”میں وہاں پینٹنگ ایگزپیشن پر گئی تھی، فرینڈز کے ساتھ، ایگزپیشن ہال کے ساتھ ہی ایک شاپنگ مال ہے وہاں جانے کے لئے ہال سے نکلی تھی، اتنے میں مجھے مین روڈ پر ایک بچہ نظر آیا اور.....“ وہ آہستہ سے وہاں اپنی موجودگی کے بارے میں مطلع کر رہی تھی۔

”اور آپ اسے بچانے مین روڈ پر کود پڑیں۔“ شاہ زر نے جملہ مکمل کیا اور اٹھل نے یوں سر جھکایا، جیسے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو۔

”نوڈاؤٹ آپ نے بہت نیک کام کیا ہے لیکن اس کوشش میں اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو۔“ اب وہ تھکے چتون اٹھائے اس سے سراپا سوال ہوا، جو اب وہ لب کاٹتی رہی۔

”خیر جس گاڑی نے آپ کو ہٹ کیا وہ بد قسمتی سے میری گاڑی تھی اور اسی سبب اب میں یہاں آپ کی جمار داری کر رہا ہوں۔“ اسے خاموش باکر شاہ زر نے وضاحت دی۔

”طبیعت کیسی ہے؟“ اس کی جلد خاموشی پر شاہ زر نے پوچھا۔

اٹھل نے بے ساختہ اس کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں فکر کے رنگ کس قدر نمایاں تھے اس کے حسین خدوخال میں اٹھل کا عکس کس قدر سرخ انگیز تھا، وہ نہ جانے کیوں زیادہ دیر تک اس کی طرف دیکھ نہیں پائی۔

”میرے سر میں بہت درد ہے اور.....“
 نجانے کیوں وہ بتائیں سکی کہ اس کے پورے جسم
 میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں، بس لب بھینچے باقی
 الفاظ منہ میں ہی دبائی گئی، لیکن وہ شاید اشمٰل کے
 ادھورے جملے کا پورا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

”آل رائٹ، میں ڈاکٹر سے بات کرتا
 ہوں، وہ ڈکلو فینک انجکشن دے دیں گے آپ کو،
 پھر آپ بہتر محسوس کریں گی۔“

”آپ انجکشن لگوائیں گی نا؟“ کچھ سوچتے
 ہوئے وہ پلٹ کر آیا اور اس سے پوچھا جواب اس
 نے اثبات میں سر ہلادیا، لیکن انجکشن کے نام پر
 تیرتا خوف شاہ زر کی آنکھوں سے مخفی نہ تھا، تب
 ہی زیر لب مسکراتا نکل گیا۔

☆☆☆

آج نویرا کی مہندی تھی، پنک جامہ دار کا
 شرآور، گھٹنوں تک آتا لیسن کمر کا کرتا جس پر
 اورغ رنگ کا دیدہ زیب موتیوں کا کام اور
 کڑھائی کی گئی تھی، ساتھ کڑھائی کے ہم رنگ
 دوپٹہ اوڑھے اپنے اندر حسن کی پر اداسیٹھ، دلکشی
 کی آخری حدوں کو چھوتا اس کا پر بہار سراپا حسن
 کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔

”بیوٹی فُل۔“ وہ بس نویرا کی مہندی کے
 فنکشن کے لئے نکلنے ہی والی تھی جب ملازمہ نے
 اسے ماما کا پیغام دیا، وہ ان کے کمرے میں داخل
 ہوئی تو ممانے بے ساختہ اس کی تعریف کی جواباً
 وہ جھٹ مسکرا دی۔

”ماما آپ نے بلایا مجھے؟“

”جی بیٹے..... آج آپ کی خالہ آرہی ہیں
 تو آپ ذرا جلدی گھر آ جانا۔“ اس کی پیشانی
 محبت سے چومتے ہوئے وہ بولیں تو ان کا غیر
 معمولی انداز اسے ٹھکانا گیا۔

”وہ تو اکثر ہی آتی ہیں ماما، آج کیا سیشنل

ہے بہر حال آج نویرا کی مہندی چھوڑ کر تو میں قطعاً
 نہیں آؤں گی۔“ وہ جلدی آنے کا عندیہ سن کر جی
 بھر کر بد مزہ ہوئی۔

”اکثر تو خالہ آتی ہیں میری جان، اظفر تو
 نہیں آتا، اس بار اسپیشلی یہی ہے کہ اظفر بھی آ رہا
 ہے۔“ ممانے سرگوشانہ انداز میں کہا تھا اور یہ
 انداز تو قطعی نیا تھا اشمٰل کے لئے، اس کا دل
 نجانے کیوں گہرائی میں ڈوب کر ابھرا۔

”اوکے، میں آ جاؤں گی۔“ انہیں غائب
 دماغی سے تسلی دیتی وہ بو جھل من کے ساتھ گل کدہ
 آگئی، جہاں گہا گہا اور رونق اپنے عروج پر تھی،
 اس کی آمد پر کئی ستائشی نگاہیں اس پر اٹھی تھیں،
 جنہیں نظر انداز کرتی وہ نویرا کے پہلو میں ٹک
 گئی۔

”اب بھی نہیں آتا تھا۔“ وہ چھوٹے ہی
 بولی۔

”یار ممانے روک لیا تھا۔“ اشمٰل نے
 صفائی دی۔

”بس کرو، ممانے نہیں، اتنی تیاری نے دیر
 کر دی۔“ اشمٰل کی تعریف کا ارادہ موقوف کرتے
 ہوئے وہ مصنوعی ہنسی سے بولی۔

”نویرا مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہی ہو۔“
 ”کیا مطلب۔“ نویرا کے چہرے پر
 استعجاب پھیلا۔

”بھی امید نہیں کی تھی کہ تم اس قدر
 خوبصورت بھی لگ سکتی ہو۔“ وہ شرارتی انداز میں
 بولی تو مرکز نگاہ بنی اور دو لہن ہونے کے باوجود
 نویرا کی باپچیں کھل گئیں جنہیں سیٹھنے کی اس نے
 قطعاً کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

رات کے بارہ بج چکے تھے، اشمٰل کے
 موبائل پر ماما کی دس کا لڑ آ چکی تھیں، یعنی وہ جلد

اس کی واپسی کی منتظر تھیں، اس نے بے ساختہ ہی ٹھنڈا سانس فضا کے سپرد کیا اور آٹنی کی سمت چل دی تاکہ ان سے اجازت طلب کر سکے۔

”ارے اتنی جلدی کس بات کی ہے اشمیل، بیٹا یہ ساتھ تو گھر ہے، رکو میں خود سارا سے بات کرتی ہوں۔“ اس کے جانے کا سنتے ہی وہ محبت سے بولیں۔

”نہیں آنٹی، اصل میں خالہ آئی ہوئی ہیں، اسی لئے تو ماما بھی نہیں آ پائیں۔“ اس نے وضاحت پیش کی۔

”اچھا ٹھیک ہے چلی جاؤ، لیکن کل کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔“ اسے گلے لگاتے ہوئے وہ پیار بھری دھونس سے بولیں تو وہ محض مسکرا دی۔

”اکیسے میت جانا بیٹے، میں شاہ زر سے کہتی ہوں چھوڑ دے گا تمہیں۔“

”نہیں آنٹی میں خود ہی چلی جاؤں گی یہ ساتھ ہی تو گھر ہے۔“ اس نے گھبرا کر ٹوکنا چاہا لیکن آنٹی تو جا چکی تھیں تھوڑی ہی دیر بعد سفید شلوار سوٹ میں ملبوس، پیشانی کے وسط میں بکھرے بالوں اور موڑے ہوئے نقول سمیت وہ اس کے مقابل تھا۔

”چلیں۔“ اس کی سمت دیکھے بغیر وہ بولا اور جواب کا انتظار کیے بغیر چل دیا، خود کا پوں انور کیا جانا نجانے کیوں اشمیل کو بے طرح کھل رہا تھا، اپنی تیاری لمحہ بھر میں ہی فضول لگنے لگی، نجانے کیوں دل ہمک ہمک کر شاہ زر کی ستائی نگاہوں کی طلب کرنے لگا تھا، وہ قدم بہ قدم اس کے ساتھ چل رہی تو اس نے بے ساختہ گردن گھما کر اس شخص کی سمت دیکھا تو اس کی طرف متوجہ نہیں تھا وہ مایوس سی نظریں جھکا گئی، مسافت ختم ہونے کو تھی، منزل سامنے تھی، وہ شفیق ہاؤس کے گیٹ پر پہنچی جب شاہ زر کی پکار اس کے قدموں

کی زنجیر بن گئی۔

”اشمیل۔“ وہ پلٹی مگر سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں وہ دو قدم بڑھا اس کے قریب آیا۔

”گڈ نائٹ۔“ جواباً وہ محض سر ہلا کر رہ گئی، اشمیل کا دل عجیب سے احساسات سے دو چار تھا، وہ سامنے ہوتا تو بھی وہ الجھن کا شکار رہتی، وہ دور جاتا تب بھی بے کل رہتی، وہ پکارتا تو ہمہ تن گوش ہو جاتی وہ نظر انداز کرتا تو توجہ کی منتظر نظر آتی، شاہ زر کا اس کی سمت متوجہ نہ ہوتا اسے گہرے دکھ سے دو چار کر گیا۔

دل اس کی دید کا تمنائی تھا تو نجانے کیسی کیسی خواہشیں بحرِ ظلم میں ڈوب اٹھ رہی تھیں، وہ اپنے جذبات سمجھنے سے قاصر تھی، دل پر اضمحال طاری تھا اک بوجھ تھا جو بڑھ رہا تھا مسلسل۔

☆☆☆

”اشمیل یا میرا موبائل میرے روم میں ہی رہی گیا ہے آتے ہوئے گھر سے لیتی آنا، میں بیوشن کے موبائل سے کال کر رہی ہوں، ہال میں آ کر تم سے مل لوں گی۔“ اشمیل اسنے ممی اور بابا کے ساتھ ہوٹل جانے کے لئے بالکل تیار گھڑی تھی جب نور اکی کال آئی۔

ممی بابا کو مطلع کرتی وہ گل کدہ کی سمت دوڑی، وہ تیزی سے دراز چیک کر رہی تھی جب اسے اپنے پیچھے کسی کے ہونے کا احساس ہوا وہ شعوری طور پر مڑی تو شاہ زر کو وہاں ایستادہ پا کر اچھل کر رہ گئی۔

”آج پھر آپ یہاں۔“ وہ معنی خیزی سے بولا تو اشمیل جل ہی گئی، شاہ زر سے زیادہ غصہ نور پر آیا تھا جس کی وجہ سے وہ یہاں تھی پورا گھر خالی تھا یقیناً سب لوگ ہوٹل جا چکے تھے۔

”نوریا کا موبائل لینے آئی تھی۔“ انگلیاں مروڑتے ہوئے اس نے وضاحت دی۔

”تو اس کے کمرے میں جانا چاہیے تھا نا۔“ وہ سنجیدہ تھا، اشمل کو گہرے کرب نے آن لیا، ذلت کا شدید احساس رگ و پے میں سرایت کرتا اسے زرد کر گیا۔

”میں نوریا کے کمرے میں ہی آئی ہوں۔“ ”کیسی دوست ہیں آپ، جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کی سہیلی ایک ہفتہ قبل فرسٹ فلور پر شفٹ ہو چکی ہے اور اب اس کمرے پر مالکانہ حقوق ہم رکھتے ہیں۔“ وہ مزے سے بولا تو اشمل کا غصہ نئے سرے سے عود آیا، اس میں اشمل کا بھی بھلا کیا تصور تھا شاہ زر کی وجہ سے ہونے والے تلخ واقعے کے بعد اس نے گل کدہ آنا بالکل چھوڑ دیا تھا، نوریا سے ناراضی گو کہ ختم ہو چکی تھی لیکن وہ چاہ کر بھی کبھی گل کدہ نہیں آ پائی تھی، تب ہی نوریا نے بھی شاید اس سے کمرہ شفٹ کرنے والی بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔

”اوکے ٹھیکس فار دس کاسنڈ انفارمیشن۔“ وہ بمشکل غصہ دہانی بولی وہ تیزی سے داخلی دروازے کی سمت بڑھی لیکن یہ کیا، شاہ زر اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

”راستہ چھوڑیں۔“ وہ تقریباً چیخی تھی۔ ”پوچھیں گی نہیں کہ نوریا کے بعد میں اس روم میں کیوں شفٹ ہوا ہوں۔“ اس کے غصے کو نظر انداز کیے وہ اپنی ہی روم میں بولا، ہمیشہ لئے دیئے انداز میں رہنے والا شاہ زر اس کو نظر انداز کرنے کے سارے ریکارڈ توڑنے والا آج اس موڈ میں اشمل گھبرا اٹھی، وہ حیران تھی۔

”میرا اس بات سے کوئی کنسرن نہیں ہے راستہ چھوڑیں مئی پاپا میرا ویٹ کر رہے ہیں۔“ ناگواری سے رخ موڑتی وہ بے زاری کے آخری

حدوں کو چھو رہی تھی۔

”ادکے فائن، یو کیمن لیو۔“ اس نے بے انتہا سنجیدگی سے کہا اور ایک طرف ہٹ گیا، کچھ دیر قبل چہرے سے پھلکتی شوخی و شرارت اب مفقود تھی، وہ ساٹ تاثرات کے ساتھ چند ثانے اسے دیکھتا رہا، اشمل کی حسین نگاہیں اس وجہہ و شکل شخص کے بیگانگی اور خشکی سے بھرپور خدوخال کا طواف کر رہی تھیں۔

جواک بار پھر پہلے جیسا ہو گیا تھا، بے نیاز، لا پرواہ اور سنجیدہ، اور یہ بے نیازی اس کی شخصیت کو چار چاند لگانے کو کافی تھی وہ اسے جانے کی اجازت دے کر ایک طرف ہو چکا تھا مگر اشمل کے قدم اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“ وہ پلٹنے کو تھا جب نجانے کیسے اس کی زبان سے پھسلا۔

”آر یو شیور؟“ وہ پلٹا جیسے اس کے نہ جانے کی یقین دہانی کرنا چاہتا ہو، اشمل اس لمحے کو پچھتائی جب اس شخص کی نگاہوں کے طلسم میں کھوئی، جواباً وہ ایک قدم مزید اس کے کمرے کے اندر بڑھ گئی، تو بڑی دلفریب مسکان اس کے لبوں کے گوشوں میں ابھر کر معدوم ہو گئی، وہ اسے اپنی موجودگی کا اعتماد ہی تو بخش رہی تھی، مگر انداز جان لیوا تھا، جوشاہ زر کو بھا گیا مار گیا۔

”اشمل مجھے غلط مت سمجھے گا، لیکن آپ کو موبائل اٹھانے کے بہانے یہاں بھیجنے کے لئے میں نے ہی نوریا سے کہا تھا۔“ وہ بڑی معصومیت سے اعتراف کر رہا تھا اور اشمل کا پارہ لمحوں میں ہائی ہوا۔

”کیا میں وجہ جان سکتی ہوں۔“ سننے پر ہاتھ باندھے وہ اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ ”وجہ بہت عام اور سادہ سی ہے اشمل، جب سے فرسٹ ڈے والی مس انڈر اسٹینڈنگ

سمت دیکھا۔

”اس لئے کہ شاید تم پھر سے وہ غلطی کر بیٹھو، دیکھو ناول انسان کو کیسے بے بس بناتا ہے۔“ اپنی بچکانہ خواہش پر وہ خود ہی متبسم ہوا۔

”اشمل میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا، صاف اور کھری بات یہی ہے کہ میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں میری خواہش ہے کہ میرے آس پاس جو وجود ہو وہ تمہارا ہو، میرے گرد جس کی خوشبو کا حصار بندھے وہ تمہاری خوشبو ہو، جوڑکی اس گھر میں حقوق ملکیت سے گھومے وہ تم ہو جوڑکی مجھے بیدار کرنے آئے وہ اشمل شفیق ہو اور وہ انداز وہی ہو جو مجھے گھائل کر دے۔“ آخری بات اس کی سمت جھکتے ہوئے اس نے شرارت سے کہی، شاید گزشتہ واقعہ اسے یاد دلانا چاہا، اتنی بے باک خواہشیں..... اشمل کا سارا خون جیسے چہرے پر جمع ہو گیا، چہرہ سرخ تھا تو پلکیں بارحیا سے جھکی جاتی تھیں، شاہ زرخجی شخصیت کے تو نازل انداز کا سامنا کرنا آسان کام نہ تھا اور اب تو وہ یقیناً خاصے رومانوی موڈ تھے ایسے انداز ملاحظہ کرنا..... اشمل تو آدھی جھک چکی تھی۔

”کیا گنا ہے آپ کو، آپ کے اشاروں پر ناپنے والی گڑیا ہوں، جب دل چاہے گا مجھے ذلیل کر دیں گے میری نساوانیت کا مذاق اڑائیں گے اور جب دل چاہے گا مجھے اپنے جذبوں کی تسکین کے لئے استعمال کریں گے۔“ نجانے کیا سوچ کر وہ بھڑک اٹھی، جواباً شاہ زرخجی ہاتھ اٹھ گیا اس پر۔

”اس قدر گھٹیا سمجھ رکھا ہے مجھے، تم سے اپنے جذبوں کی تسکین کروں گا آئندہ ایسی بات کی تو جان لے لوں گا تمہاری۔“ اس نے بات ہی ایسی کی تھی اس کا میٹر ہی گھوم گیا، تکلفات کو

ہوئی ہے آپ نے تو جیسے گل کدہ نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہے اور میرا دل.....“ اس نے لمحہ بھر تو قف کیا اور اشمل کی بھوری آنکھوں میں جھانکا تو وہ فوراً ہی گڑبڑا گئی جو بہت انہماک سے اس کی گفتگو ملاحظہ کر رہی تھی۔

”میرا دل ایسا سرکش اور باغی نکلا کہ آپ کی تصویر ہر لمحہ نگاہوں میں نقش کرنے کی ضد کر بیٹھا۔“ وہ ہولے سے ہنسا شاید اپنے دل کی کیفیت پر، اشمل کی حیران نگاہیں لمحہ بھر کو شاہ زرخجی کی روشن آنکھوں سے متصادم ہوئیں، جہاں تینوں کا اک جہاں آباد تھا، اس کے چہرے پر پھیلے خمار، محویت اور جذب نے اسے آنکھیں چرانے پر مجبور کر دیا، پہلو میں دھرا دل زور و شور سے دھڑکا، پھر دماغ نے اپنی دلیل پیش کی، اس کے دل پر شادی مرگ طاری تھا تو اس کی نساوانیت صف ماتم بچھائے تھی، اس کا دل دماغ کیلے دھوئیں سے بھر نے لگا لیکن وہ لب کا مٹی محض اسے سننے کی متمنی تھی کیونکہ حقیقت بے شک تلخ سہی لیکن دل چاہتا تھا کہ یہ لمحے طویل ہو جائیں، شاید وہ پور پور اس کی محبت میں ڈوب رہی تھی، اس ساحر کا سحر اس پر طاری ہو رہا تھا، تب ہی وہ تنہا اس محل میں اس کے ہمراہ موجود تھی شاید نہیں یقیناً وہ اس کی اسیر تھی تب ہی تو سب کچھ جاننے کے باوجود اشمل شفیق اس کے اقرار کی سند لینے کو بے تاب تھی۔

”مجھے لمبی چوڑی باتیں نہیں آتیں، میں تم سے کوئی وعدے و عہد بھی نہیں کر سکتا لیکن اتنا اقرار ضرور کر سکتا ہوں کہ نجانے کب میرے دل میں بلا اجازت داخل ہوئی اور بڑے استحقاق سے میرے دل کی مسند پر براجمان ہو گئیں، میں نے اپنا روم نویرا کے ساتھ شفٹ کر لیا، جانتی ہو کیوں؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اشمل کی

شگفتہ شگفتہ — رواں دواں

ابن انشاء

اچھی کتابیں

پڑھنے کی عادت ڈالیں



ابن انشاء کی تازہ تصنیف

دخول در معقولات

شائع ہو گئی ہے

آج ہی اپنے قریبی بکسٹال یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں

لاہور اکیڈمی

چوک اردو بازار لاہور

042-3731797, 37321690

خیر باد کہتے ہوئے وہ آپ سے سیدھا تم پر آیا،
چہرے پر ہاتھ رکھے ٹپ ٹپ آنسو بہائی وہ یہ
یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ پلٹنے کو تھی
لیکن وہ پلٹ نہیں سکی کیونکہ اس کی کلائی شاہ زر
کے ہاتھ میں تھی، اس نے چمڑا نے کی کوشش نہیں
کی بس وہیں کارپٹ پر بیٹھتی چلی گئی، اس کے
رونے میں شدت آئی تو شاہ زر کو بھی اپنے رویے
پر ندامت محسوس ہوئی لیکن اس نے بات ہی ایسی
نامناسب کی تھی کہ وہ خود پر اختیار کھو بیٹھا۔
”آئی ایم ساری۔“ اشمیل کے قریب بیٹھتے

ہوئے وہ بولا۔

”آئی ہیٹ یو۔“ وہ گھٹنوں سے چہرہ برآمد
کرتے ہوئے تقریباً چیمچی تھی اور اشمیل کے اس
معصوم احتجاج پر اس نے جی بھر کر پیار آیا تھا،
جس کے اظہار کی فی الحال اسے اجازت نہ تھی۔
”بٹ آئی لو یو۔“ پانی کا گلاس اسے
تھماتے ہوئے وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔
”مجھے نہیں پتا۔“ اس نے گلاس پر سے

دھکیلا۔

”میں پوچھ نہیں رہا۔“ عجیب استحقاق کے
ساتھ دھمکی سی تھی اس کے لہجے میں، اسی لئے وہ
مزید احتجاج نہیں کر سکی، اس کی توجہ اس کی محبت
پر اس کے دل میں جیسے کہرام برپا تھا، دل و دماغ
میں عجیب سی اذیت و کرب کا راج تھا، پانی کے دو
گھونٹ پی کر اس نے گلاس شاہ زر کو تھمایا، پھر ٹشو
کا ڈبہ اس کے سامنے تھا، وہ ٹشو نکال کر آنکھیں
خشک کرنے لگی۔

”کروا لو جتنی خدمتیں کروانی ہیں آج،
آئندہ یہ سب کام تم نے ہی کرنے ہیں۔“ اس
نے اپنا سر ہولے سے اشمیل کے سر سے ٹکرایا۔
اس کا ہر شوخ جملہ پگھلا ہوا سیسہ بن اشمیل
کی سماعتوں میں منتقل ہو رہا تھا۔

”پلیز آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں۔“
بھرائی ہوئی آواز، کھڑے کاجل سے سچی سنہری
آنکھیں جن سے چھلکتی ہلکی سی گلابیت لفظ
خوبصورتی کو بھی مات دے دیتی، گلابی ہونٹ،
سرخ و سپید آنسوؤں سے دھلی رنگت اور معصوم
انداز، بھلا شاہ زربچتا بھی تو کیسے، خوبصورتی سے
تو بیچ جاتا لیکن یہ معصومیت، بھولپن، سچائی اور
نزاکت یہ تو نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ
تھیں۔

”اچھا..... پھر کیسی باتیں کیا کروں۔“ وہ
جیسے اس کی بات سے حظ اٹھا رہا تھا، جواباً وہ لب
کامتی رہی۔

”اچھا بات سنو، آئندہ تمہاری ہر تیاری
میرے لئے ہونی چاہیے، میں نہیں چاہتا میرے
علاوہ کوئی اور نظر اس حسن کو نہ رہے۔“ اس نے
آہستگی سے اشمل کے جسم کے اتار دیئے، وہ اسے
روک بھی نہیں پائی، بس حیرت زدہ نگاہوں سے
اسے دیکھتی رہی، وہ کس قدر خوش تھا لیکن کیا
اشمل خود خوش نہیں تھی۔

اس کے دل پر جیسے گھونسا پڑا، وہ درد سے
زرد پڑ گئی، وہ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہی
تھی، اس کا استحقاق محسوس کر رہی تھی اسے روک
نہیں رہی تھی۔

”اشمل! کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی؟“
اس کی پرسوج نگاہیں پڑھ کر وہ کچھ بخیدہ ہوا۔
”نہیں۔“ وہ پلٹ گئی رخ موڑ گئی۔

”ہوں۔“ اس نے لباً سانس خارج کیا اور
اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”خیر یہ تو میں نہیں مان سکتا، جوڑ کی میرے
دیئے گئے پھولوں کو اتنی توجہ اور چاہت سے جن
کر اپنے کمرے کی زینت بنائے وہ یقیناً اپنے
دل میں میرے لئے کوئی خاص مقام رکھتی ہے۔“

اشمل دھک سے رہ گئی، ہاں یہ سچ تھا وہ اس کے
دیئے ہوئے پھولوں کو بڑی توجہ سے اٹھالائی تھی
جنہیں اس نے شدید مشتعل ہو کر مسل ڈالا تھا، مگر
وہ یہ سب کیسے جانتا تھا، اس کی آنکھیں تیر سے
پھیل گئیں۔

”شاہ زرا!“ وہ نرمی سے گویا ہوئی اور اس
کے یوں پکارنے پر اس کی روشن نگاہوں کی
قدیلیں مزید جگمگانے لگی تھیں، اس خوبصورت
انداز پر وہ فدا ہونے لگا تھا، مبہم سا تبسم اس کے
دلکش لبوں کو حصار میں لے گیا۔

”میری معافی ہو چکی ہے۔“ اس نے گویا
دھماکہ کیا۔

شاہ زرا کو چند سیکنڈز لگے تھے اس کی بات
سمجھنے میں، لمحوں میں اس کے چہرے پر تاریک
سامے لہرانے لگے۔

”اظفر نام ہے اس کا، میری خالہ کا بیٹا ہے،
دو دن پہلے ان کا نام مجھ سے منسوب ہو گیا ہے۔“
کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا انگلی والا ہاتھ اس
کے سامنے لہرایا، آنسو ہولے ہولے اس کے
عارض بھگونے لگے اور شاہ زرا کے تو سارے
الفاظ جیسے ہو گئے، اس نے تو ایک لمحے کے لئے
بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ انگلیڈ بھی ہو سکتی ہے۔

”یہ کوئی مذاق ہے یا تم مجھ سے اپنی انسلٹ
کا بدلہ لے رہی ہو۔“ وہ کافی دیر بعد بولا، اک
موہوم سی امید کا دیا غٹمٹایا۔

”کوئی مذاق ہے نہ آپ سے کوئی بدلہ لے
رہی ہوں جو سچ ہے وہی بتا رہی ہوں۔“ اس نے
اس موہوم سی امید کا گلاب بھی دبا دیا، یہ سب کچھ
اس قدر اچانک ہوا کہ وہ نورا کو بھی نہیں بتا سکی۔

”آئی ایم ساری..... مجھے اس بارے میں
کچھ علم نہیں تھا، ورنہ میں کبھی آپ سے ایسی نا
مناسب بات نہیں کرتا، ہمیشہ خوش رہیں، دعاؤں

میں یاد رکھیے گا۔“ اس نے لمحوں میں خود کو سنبھالا، چند لمحوں میں بے تکلفی سے تکلف تک کا سفر کیا، ساری شوخی و شرارت اور بے لگام ہوتی خواہشیں کسی لاحاصل تمنا کے قبرستان میں اپنی موت آپ ہی مر گئیں، بظاہر مضبوط نظر آتے اس چھ فٹ کے وجیہہ و تکلیل مرد کو اس چار حرفی لفظ ”محبت“ نے توڑ ڈالا، آنکھوں میں آنی نمی کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑتا وہ باہر نکل گیا اور اشمیل من من بھارتی ہوتے قدموں سمیت اس راستے پر قدم بڑھا گئی جہاں سے چند لمحے قبل وہ شخص گزرا تھا جس سے شدید محبت کا ادراک اسے اسی لمحے میں ہوا تھا، وہ شخص جواب بھی اس کا نہیں ہو سکتا تھا، بہر حال ملاقات اختتام کو پہنچی، فسوس خیز لمحے تمام ہوئے جو شاید پہلے تھے اور آخری بھی۔

☆☆☆

ناکام اور نامکمل محبت کے بین ہوئے ہوئے اس کے اندر ضربیں لگا رہے تھے ماضی کی دردناک یادوں سے دامن چھڑاتی اشمیل کی بیسگی نگاہوں نے دور تک نمرہ کی ڈبڈبائی آنکھوں اور لڑکھرائی چال کا تعاقب کیا، نمرہ اس کی پیاری سی دوست کم ندر تھی، آج کل اس کی شادی کا موضوع زیر بحث تھا اور قریب عفال عفان احمد کے نام نکلا جو حیدر انکل (اظفر کے والد) کے کافی گہرے اور پرانے دوست کا بیٹا تھا، عفان ملکیہ کل انجینئر تھا ان کی اپنی فرم تھی، خوش شکل، ملنسار، ہونہار، خوش گفتار اور انتہائی مودب لڑکا تھا لہذا تمام گھر والوں کو یہ پروپوزل ہر لحاظ سے موزوں لگا، رشتہ طے کرنے کے بعد نمرہ کی رضا مندی لینے کی باری آئی تو یہ ذمہ داری اشمیل کو سونپی گئی، رضا مندی تو نہیں البتہ اطلاع دینا کہا جاسکتا تھا۔

بہر کیف، بے شک نمرہ نے اپنے منہ سے عفان کے لئے انکار یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا

تھا لیکن اس کے چہرے کے نقوش میں پھیلا اضطراب، اس کی آنکھوں سے چمکنے کو بے تاب نمکین پانی اور چال کی لڑکھرائی اس بات کی چیخ چیخ کو گواہی دے رہے تھے کہ وہ خوش نہیں۔

اشمیل کی ازدواجی زندگی کو سات سال بیت چکے تھے، اس کا چار سالہ بیٹا اپنے پاپا کا لاڈلا، ماما کی جان اور پورے گھر کی رونق تھا، اس کی زندگی کو تکمیل بخشنے والا تھا، اظفر بے حد سلجھا ہوا صلح جو خوبصورت، پروقار اور مثالی شوہر تھا، اشمیل کے خواہش کرنے سے قبل تمام نعمتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کرنے والا شخص تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے ہر نعمت سکھ اور اطمینان سے نوازا تھا، بظاہر سب کچھ مکمل تھا، وہ بہت خوش اور مطمئن نظر آتی تھی، لیکن ماضی کی کوئی یاد چٹکی سی آغوش میں بھرتی تھی ایک درد مسلسل تھا جو زندگی کے لمحوں کے ساتھ بیت رہا تھا، دور کہیں نارسائی کی غلش اسے مکمل طور خوش بھی نہیں ہونے دیتی تھی اسے کھل کر رونے بھی نہیں دیتی تھی۔

وہ اک عزم کے ساتھ اپنے بیڈروم کی سمت بڑھی جہاں اس کا شوہر، اس کا اظفر موجود تھا۔ وہ نمرہ کا کیس لڑنے جا رہی تھی، اس کا انکار ان تک پہنچانے جا رہی تھی تاکہ اس کی خواہش کو مقدم جانا جائے، اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا، وہ جا چکی تھی نمرہ اپنے خواب پایہ تکمیل تک پہنچانے اور خوشحال و آسودہ رہے۔

وہ کبھی اس کسوٹی پر نہ اترے کہ عفان بہت اچھا شوہر ہے خدا نے اولاد جیسی نعمت بھی عطا کی ہے، دنیا کی ہر آسائش میسر ہے لیکن..... جو دل کی خوشی تھی وہ کہیں نہیں تھی کہیں تھی۔

☆☆☆

فروغ بھڑکیں حبیب

ندا حسین

دوسری قسط

ظاہر ہے کہ اگر وہ حذیفہ کے ساتھ نہیں تو یقیناً وہ ملکوں کے قبضے میں ہے۔“ انیسہ بے رحم لہجے میں بولیں۔

”انیسہ کی بات کڑوی ضرور ہے مگر سچائی کا شائبہ بھی اسی نکتے پر ہے کہ ہماری شیخ، ملکوں کے قبضے میں ہے۔“ نجم النساء بھی انیسہ سے متفق ہوتے ہوئے بولیں تو انیسہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

”سوچ سمجھ کر بات کیا کرو انیسہ، کچھ خبر بھی ہے کہ کیا اول فول منہ سے نکال رہی ہو۔“ آفاق الدین سخت ناگواری سے گویا ہوئے، ان کی بات پر انیسہ نے ایک خاموش نگاہ حذیفہ پر ڈالی اور پھر بے لچک لہجے میں بولیں۔

”اس میں غلط کیا کہا ہے میں نے آفاق صاحب، حذیفہ کو ملکوں کے لڑکے نے مار پیٹ کر ہسپتال پہنچا ڈالا اور شیخ کی کچھ خبر نہیں، صاف

ناولٹ

”میں ان ملکوں کو بخشنے والا نہیں، شیخ کو اگر ان خبیثوں نے پاتال میں بھی چھپا کر رکھا ہوگا تو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔“ آفاق الدین پر طیش لہجے میں گویا ہوئے۔

”کو آفاق الدین، ذرا صبر کرو، یہ معاملہ مجھے نبھانے دو، ویسے بھی ان ملکوں کے ساتھ ہمارے بڑے حساب نکلتے ہیں۔“ نجم النساء پر اعتماد لہجے میں بولیں، قبل اس کے کہ آفاق الدین کچھ کہتے، نرس نے اندر آ کر ان لوگوں کو پولیس کی آمد کی اطلاع دی، نجم النساء نے اثبات میں سر ہلا کر پولیس کو اندر آنے کی اجازت دے ڈالی۔

”پولیس کو اس معاملے میں شامل کر کے ہمارے ہاتھ محض بدنامی آئے گی اماں۔“ آفاق الدین نے بدنامی کے خوف سے فوراً مخالفت کی۔





☆☆☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں وا کیں، کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، کچھ ساعتیں لگیں اسے اپنے اوسان بحال کرنے میں، اوسان بحال ہوئے تو دن میں بیتا وہ واقعہ اپنی تمام تر ہولناکیوں سمیت اس کے ذہن کے پردے پر چھاتا چلا گیا۔

”حذیفہ!“ اس کے لب ہولے سے پھر پھڑپھڑائے، حذیفہ کی فکر اسے بری طرح ستانے لگی، اس نے بے قراری کے عالم میں کمرے کے چہار اطراف نگاہیں دوڑائیں۔

”یہ..... یہ میرا کمرہ تو نہیں، میں کہاں ہوں۔“ اک نئے اندیشے نے اس کے من میں سر اٹھایا، وہ بے چینی سے اٹھ بیٹھی، قبل اس کے کہ وہ بستر سے اترتی، دروازے پر آہٹ ہوئی، وہ گھبراہٹ کے عالم میں دوبارہ بستر پر آنکھیں موندے دراز ہو گئی، دروازہ آہستگی سے کھولا گیا تھا، اگلے پل ہی کمرے میں روشنی کا جھماکا ہوا، ساتھ ہی قدموں کی چاپ ابھری، شمع کا رواں رواں قوت سماعت بن گیا، قدموں کی چاپ قریب آتی چلی گئی۔

”یا اللہ خیر!“ وہ دل ہی دل میں رب سے خیر کی دعا مانگنے لگی۔

”ہائے اور ہا، یہ لڑکی تو اب تک بے ہوش پڑی ہے، دن ڈھل گیا، شام بھی گزرنے کو ہے، اب تک تو اسے ہوش میں آ جانا چاہیے تھا۔“ شمع کی سماعتوں سے ایک عورت کی آواز ٹکرائی، طمانیت کا احساس اس کے اندر سرایت کر گیا۔

”تجھے کیا فکر ہوش میں آئے یا نہ آئے، ہمارا کام صرف اسے کھانا پانی دینا ہے، چل جلدی سے کھانا رکھ اور واپس چل، ملک شاہ ویز آتا ہی ہوگا۔“ کمرے میں موجود دوسری عورت نے اس

”بدنامی تو اب ہے ہی اس خاندان کے تعاقب میں، جب گھر کی بیٹیاں اغواء ہو جائیں تو نیک نامی گلے کا ہار نہیں بنتی۔“ انیسہ ایک بار پھر تنک کر بولیں، ان کی بات پر کب سے خاموش بیٹھے حذیفہ نے خشکی سے انہیں دیکھا۔

”تم خاموش رہو انیسہ، مت بھولو شمع ہمارے گھر کی صرف بیٹی ہی نہیں بہو بھی ہے اور جس بدنامی کے خوف میں تم بتلا ہو انیسہ، دیکھ لینا یہ بدنامی ان ملکوں کے گلے کا طوق بنے گی۔“ نجم النساء بارعب انداز میں وہاں موجود تمام نفوس کو چپ کرا گئیں۔

”دادی کچھ بھی کریں، بس مجھے ہر حال میں شمع واپس اپنے گھر میں چاہیے، وہ ایک لمحے کے لئے بھی ان ملکوں کے قبضے میں رہے یہ میری غیرت کو گوارا نہیں۔“ حذیفہ کے لہجے میں وحشت نمایاں تھی۔

”تم پریشان نہ ہو میری جان، شمع کو ملک فیاض خود ہماری حویلی میں با حفاظت پہنچا کر جائے گا۔“ نجم النساء پر اعتماد لہجے میں مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں، ان کے لہجے سے جھمکتے یقین کو دیکھ کر آفاق الدین پہلو بدل کر رہ گئے۔

”ایسا کیا کرنے والی ہیں آپ اماں جو ملک فیاض شمع کو خود ہماری حویلی چھوڑ کر جائے گا، ایسا کون سا تپ کا پتا آپ کے ہاتھ آ گیا ہے، جو اس کھیل کو جیتنے کے لئے پر یقین ہیں آپ؟“ انیسہ بے چینی سے استفسار کرنے لگیں۔

”وقت آئے گا تو خود دیکھ لینا انیسہ، ہمارے دامن پر کوئی چھینٹ نہیں آئے گی۔“ نجم النساء براسرا سی مسکان لبوں پر سجائے حتیٰ لہجے میں بولیں، ان کے انداز پر جہاں حذیفہ نے انہیں چونک کر دیکھا وہیں آفاق الدین لب بلب بچ کر رہ گئے۔

راہ بھائی۔

شیخ اپنے آنسو صاف کرتی فوراً اٹھ کر کھڑکی کی جانب بڑھی، کھڑکی پر پڑے پڑے کو سرکاتے ہی اس نے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے وا کر ڈالے کھڑکی کھلی تھی مگر اس پر باریک جالی تھی ہوئی تھی، وہ بے بسی سے اس جالی کو دیکھنے لگی۔

”اف..... اب اس جالی کو کیسے ہٹاؤں؟“ وہ فکر مندی سے سوچنے لگی، اس کی نگاہیں کمرے میں متلاشی انداز میں دوڑتے ہوئے کھانے کی تھالی پر جا ٹھہری، شیشے کا گلاس اسے اپنی افادیت پر غور کرنے کی دعوت دے رہا تھا، وہ فوراً سے پیشر گلاس کی جانب بڑھی، گلاس اٹھا کر اس نے فرش پر زور سے پٹ ڈالا، چشم زن میں ثابت گلاس، کانچ کے کئی ٹکڑوں کی صورت بکھر گیا، شیخ نے ایک تیز نوکیلا ٹکڑا اٹھایا اور تیزی سے کھڑکی کی جانب بڑھی۔

☆☆☆

”اے میرے رب، تو ہی ہے عزتوں کا محافظ، تو ہی ہے ذلتوں سے بچانے والا، میرے مالک تو میری عزت بھی بچالے، تو جانتا ہے کہ اس گھر میں کسی کیسی ذلتیں میں نے سہی ہیں حق تلفی، نا انصافی ہر ظلم سہا ہے میں نے، مگر یا اللہ اپنی بیٹی کی رسوائی، اس سے جدائی میں برداشت نہیں کر سکوں گی، میری نصیب کی چھاپ میری بیٹی پر مت ڈال میرے مالک۔“ وہ جائے نماز پر بیٹھیں گڑ گڑاتے ہوئے دعا مانگنے میں مشغول تھیں، اشک ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔

”یا رب میرے نصیب کی چھاپ میری بیٹی کے مقدر میں نہ ڈال، بے تصور ہوتے ہوئے بھی جو رسوائیاں میرے حصے میں آئیں ہیں ان سے میری شیخ کو محفوظ رکھ، وہ بہت معصوم ہے میرے اللہ، اس کی حیاء کی معصومیت کی حفاظت فرما۔“

ملازمہ کو گھر کتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا، ملازمہ کھانے کی ٹرے رکھ کر وہاں سے چلی گئی، کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی شیخ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یا اللہ یہ میں کس مصیبت میں جا پھنسی ہوں، میرے مولا میری مدد کر مجھے اس ملک شاہ ویز کے شر سے محفوظ رکھ۔“ وہ دل ہی دل میں دعا کرتی، پریشانی کے عالم میں نظریں کمرے کے چاروں اطراف دوڑانے لگی۔

”یا اللہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھاء، یہاں گزرنے والا ایک ایک پل میرے پاک دامن کو داندھار کر ڈالے گا، میری ماں پہلے ہی بے حد مصیبت زدہ زندگی گزار رہی ہے، میرے اغواء کا غم سہہ نہیں پائے گی، یہ دنیا اسے لگن طعن کہہ سنا کر مار ڈالے گی، یا اللہ مجھے اور میری ماں کو ایسی آزمائش میں مبتلا نہ کر جس کا بوجھ ہم اٹھانہ سکیں۔“ وہ وہیں زمین پر اکڑو بیٹھ کر سر گھٹنے دیئے رونے لگی۔

”حذیفہ..... حذیفہ نہ جانے کس حال میں ہوگا، اس پر اس قدر تشدد کیا ہے ان خالموں نے کہ روح کانپ جائے، اودہ میرے اللہ میرے حذیفہ کی حفاظت فرما اور مجھے میرے اپنوں سے عافیت کے ساتھ جلد ملا دے۔“ وہ فکر و خدشات میں گھری دعائیں مانگی جا رہی تھی، تب ہی شکاری کتے کے بھونکنے کی آواز نے اسے بری طرح چونکا ڈالا، شیخ نے آواز کی سمت کا تعین کیا تو اسے کمرے کی مشرقی دیوار پر نصب کھڑکی کی موجودگی کا ادراک ہوا۔

”شیخ بے شک اللہ سے بڑھ کر کوئی مددگار نہیں، مگر یہاں سے نکلنے کے لئے تمہیں خود بھی دماغ لڑانا ہوگا، یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر رونے سے کوئی فائدہ ممکن نہیں۔“ عقل نے اسے

دعائیں مانگتے مانگتے سفینہ کا لہجہ رندہ گیا مگر ان کی دعاؤں کا سلسلہ رکنے کا نام نہ لے رہا تھا، شافع الدین اسی پل کمرے میں داخل ہوئے تھے، سفینہ کو یوں روتا دیکھ کر ان کے قدم دروازے پر ہی زنجیر ہو گئے۔

”میرے اللہ، باپ کو تو نے اولاد کا محافظ بنایا، اسے گھر کا نگہبان بنایا، پروردگار مجھے اور میری بیٹی کو ہمارے محافظ، ہمارے نگہبان سے محروم نہ کر، یا اللہ تو میرے شوہر کا دل میرے لئے میری بیٹی کے لئے نرم فرما دے، ان کے دل میں ہمارے لئے محبت پیدا کر دے، ہمارے محافظ کے ہوتے ہوئے ہمیں اس جہاں میں رسوا نہ کر، رحم کر دے مولا تو ہم پر رحم کر۔“ وہ اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر زار و قطار رو رہی تھیں، شافع الدین کے دل پر گھونسا سا لگا، وہ الٹے قدموں کمرے سے واپس لوٹ گئے۔

”محافظ..... کیا واقعی میں محافظ ہوں؟ اور اگر ہوں تو کیسا محافظ ہوں، کہ اپنی بیوی اور بیٹی کی عزتوں کی حفاظت نہیں کر سکا۔“ سفینہ کے شکوے ان کی سماعتوں پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے، زندگی میں پہلی بار انہیں ندامت کے احساس نے آگھیرا تھا، وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں راہداری عبور کرتے ہوئے سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔

”سمع کہاں ہے؟“ بیٹی کا خیال انہیں پہلی بار ستایا تھا، وہ دیوانہ وار شمع کے کمرے میں اسے آوازیں دیتے ہوئے بڑھے، مگر خالی کمرہ انہیں معاملے کی سنگینی کا احساس دلا رہا تھا، وہ سست روی سے چلتے ہوئے دیوار پر نصب شمع کی تصویر کے سامنے آکھڑے ہوئے، وہ مسکرا رہی تھی، اس کے مسکرانے سے اس کی آنکھیں مسکراتی تھیں بالکل ان کی طرح، وہ انہی کا توپرتو تھی، پھر بھی وہ

اس سے غافل رہے، آج سارا دن وہ گھر سے غائب رہی، مگر وہ لائق بنے رہے، کیوں؟ کیا وہ بھول چکے تھے کہ سفینہ سے لاکھ نفرت سہی مگر شمع تو ان کے وجود کا حصہ ہے، پھر اسے کیوں لاوارثوں کی طرح چھوڑ ڈالا؟ اس سے لائق برت کر آخر وہ کیا ثابت کرنا چاہ رہے تھے۔

”یہ سفاکی کی حد نہیں تو اور کیا ہے شافع الدین! تم تو بڑے محبت بنے پھرتے ہو، یہ ظاہر کرتے ہو کہ تم سے بڑا کوئی محبت کا قدردان نہ ہو گا، تو محبت کا کیا ایک ہی روپ ہے، کیا صرف جوانی کی محبت تم پر فرض تھی، اور بیٹی کی محبت، اس کا کیا؟ محبتیں بھی عبادت کی طرح فرض ہوتی ہیں اور جو فرض چوک جائیں وہ پھر فرض بن جاتے ہیں۔“ یہ ان کا ضمیر تھا، جو بڑے طویل عرصے بعد انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور اب انہیں بری طرح لتاڑ رہا تھا، وہ سر پکڑ کر شمع کے بستر پر جا بیٹھے، بیٹی کی کشدگی اور اس کے ساتھ کی گئی نا انصافی انہیں بری طرح ستا رہی تھی۔

☆☆☆

”اماں آپ کا ارادہ کیا ہے؟ آخر آپ کرنا کیا چاہتی ہیں؟“ ہسپتال سے باہر نکلتے ہوئے آفاق الدین نے نجم النساء سے جھنجھلا کر سوال کیا۔

”آفاق الدین تم بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کرنا چاہتی ہوں، سب کچھ جانتے ہو جھتے ہوئے انجان مت بنو۔“ نجم النساء تڑک کر بولیں۔

”سب کچھ بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اماں تب ہی سوال کر رہا ہوں آپ سے، آپ گڑھے مردے اکھاڑنے جا رہی ہیں، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ آپ کے اس اقدام سے دونوں گھرانے آگ کی لپیٹ میں آجائیں گے۔“

آفاق الدین زوج آکر بولے۔

”اتنا بتاؤ آفاق الدین کہ میری پوتی کے اغواء ہونے سے کیا دونوں گھرانے شعلوں کے لپیٹ میں نہیں آئے؟“ نجم النساء گرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”میں آپ کا غصہ سمجھ رہا ہوں اماں، مگر شمع کو ان لوگوں کے قبضے سے بازیاب کرانے کے اور بھی طریقے ہیں، اس آگ کو کیوں ہوا دے رہی ہیں جس کے شعلے بڑی مشکل سے بجھے ہیں۔“ آفاق الدین ماں کی ضد پر زچ آتے ہوئے بولے۔

”ان بد بختوں نے ایک بار پھر ہماری عزت پر ہاتھ ڈال کر حویلی کی غیرت کو لاکار ہے، کیا وہ لوگ بھول چکے ہیں نجم النساء کے غصے کو آفاق الدین؟ اگر وہ لوگ واقعی بھول چکے ہیں تو انہیں یاد دلانے کا وقت آچکا ہے کہ حویلی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی قیمت کیسے چکانی جانی ہے۔“ نجم النساء شدید غضب کے عالم میں آفاق الدین پر برس پڑیں۔

”تمہیں ملکوں کو سبق سکھاتے سکھاتے آپ اپنے گھر کا شیرازہ ہی نہ بکھیر ڈالیں۔“ آفاق الدین نے ایک نظر ماں کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر طنز بہ لب و لہجہ اختیار کیا، وہ دونوں ہسپتال سے باہر نکل کر گاڑی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

”مطلب کیا ہے تمہارا آفاق الدین؟“ نجم النساء نے کڑے تیور سے انہیں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”آپ اچھی طرح جانتی ہیں اماں کہ سفینہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اس واقعے سے کس قدر متاثر ہوئی تھی، شافع الدین نے لکتنا ذلت آمیز رویہ اختیار کر رکھا ہے اب تک اس واقعے کی وجہ سے اور آپ ایکبار پھر اس واقعے کو سب کی

نظروں میں لانا چاہتی ہیں، جانتی بھی ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، انیسہ اس واقعے سے اب تک ناواقف ہے، اس کو خبر ہوئی تو حذیفہ ہنگامہ کھڑا کر ڈالے گی، سفینہ کی بچی بچی عزت بھی ملیا میٹ ہو جائے گی، صرف اسی پر بس نہیں یہ سوچا ہے آپ نے کہ شمع اور حذیفہ کی شادی پر ان باتوں کا کیا اثر پڑے گا؟ سفینہ کی زندگی تو خراب ہو ہی چکی ہے اماں کم از کم اس کی بیٹی کی تو فکر کریں، افسوس ہوتا ہے مجھے اس معصوم کے حال پر۔“

آفاق الدین جیسے بھرے بیٹھے تھے، بناء کسی لحاظ کے وہ سب کچھ کہتے چلے گئے، نجم النساء کی ضد سے وہ بخوبی واقف تھے، مزید یہ کہ ایک وہی تھے جو بلا خوف حویلی کے باسیوں کو آئینہ دکھانے کی جرأت کر سکتے تھے، رعب و دبدبہ ایسا تھا کہ متکبر المراج نجم النساء اور خود پرستی میں غرق شافع الدین بھی ان کی صاف گوئی اور دونوک بات پر خاموش ہو جاتے، حویلی میں ایک وہی تھے جسے سفینہ کے حقوق کا خیال تھا، اپنی بات مکمل کر کے وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگے، نجم النساء نے انہیں سخت نظروں سے گھورا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی بول پڑیں۔

”ان سب فکروں کے لئے ابھی میں زندہ ہوں آفاق الدین، تمہیں حذیفہ اور شمع کی شادی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے شمع جتنی تمہیں عزیز ہے، اس سے کہیں زیادہ وہ مجھے عزیز ہے اور رہی بات سفینہ کی تو اس عورت میں وہ گن ہی نہیں ہیں جو شوہر کو اپنا دیوانہ بنا سکے، شافع الدین ویسے ہی اس سے عاجز رہتا ہے، ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ ہی کہاں پہنچتا ہے جس کے برباد ہونے کی فکر کی جائے..... ہونہ۔“

”تو آپ فیصلہ کر چکی ہیں کہ ماضی جو چنگاریوں کی راکھ میں دب چکا ہے، اس میں

”بڑے صاحب، چھوٹے صاحب تو اپنے کمرے میں موجود نہیں ہیں۔“

”کمرے میں موجود نہیں تو کہاں گیا وہ؟“

ملک فیاض غرائے۔

”وہ فارم ہاؤس گئے ہیں صاحب۔“ مہر دین نے جھجکتے ہوئے اطلاع دی۔

”فارم ہاؤس“ انہوں نے دانت کچکاتے ہوئے فارم ہاؤس کا نام لیا، عین اسی وقت انہیں حویلی کے خاص ملازم کریم کے آنے کی اطلاع ملی۔

”نجم النساء کا ملازم خاص، ٹھیک ہے بھیجو اسے میرے پاس۔“ وہ پرسوج انداز میں حکم صادر کر کے سیڑھیاں اترنے لگے، کچھ ہی دیر میں کریم ان کے سامنے موجود تھا۔

”کہو کریم، کیسے آنا ہوا، تمہاری بی بی نے آج کیسے تمہیں ملکوں کے گھر کی راہ دکھلا دی۔“ وہ چہرے پر اپنی مخصوص کاکمانہ مسکراہٹ سجائے مخاطب ہوئے، غالباً اب تک یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ شائع الدین کی بیٹی کے اغواء کی خبر حویلی تک نہیں پہنچی ہوگی، اسی لئے جمیل سے رابطہ کر کے وہ جلد از جلد اس مسئلے کو نمٹانا چاہ رہے تھے، مگر کریم کی آمد نے انہیں چونکا ڈالا تھا۔

”ملک صاحب یہ رقعہ بی بی جی نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔“ کریم حویلی کا پرانا وفادار ملازم تھا، پچھلے وقتوں میں حویلی نے جو کچھ بھی جھیلنا تھا اس سے وہ بخوبی واقف تھا، اس وقت صورتحال کس قدر نازک تھی وہ بخوبی آگاہ تھا، نجم النساء کا بھیجا گیا رقعہ ملک فیاض کے حوالے کر کے وہ اب سر جھکائے کھڑا جواب کا منتظر تھا، ملک فیاض نے ٹھٹک کر اس رقعے کو دیکھا اور کھول کر پڑھنے لگے۔

”ملک فیاض تمہارے پوتے شاہ ویز نے

ایک بار پھر سے چنگاری لگائی ہے۔“ آفاق الدین خٹکی سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”بالکل، اس بار ایسی چنگاری لگاؤں گی کہ ملکوں کو لگ پتا جائے گا نجم النساء کے گھر پر میلی نگاہ ڈالنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور یہ ملک شاہ ویز ہونہ یہ اپنے باپ کے خلاف نہ کھڑا ہوا تو میرا نام نجم النساء نہیں۔“ نجم النساء ایک مطمئن عالم میں بولتی چلی گئیں، آفاق الدین نے انہیں افسوس بھری نگاہوں سے دیکھا اور گاڑی اشارت کر دی۔

☆☆☆

ملک فیاض کب سے اپنے بیٹے ملک جمیل کے موبائل پر کال ملانے میں مصروف تھے مگر اب تک رابطہ ممکن نہ ہو سکا تھا، بالآخر وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر ملازم کو آواز دینے لگے۔

”جی بڑے صاحب!“ مہر دین (ملازم) فوراً ان کے حضور پیش ہوا۔

”شاہ ویز کو میرے کمرے میں بھیجو۔“ انہوں نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حکم صادر کیا۔

”جو حکم بڑے صاحب۔“ مہر دین حکم بجا لاتا کمرے سے باہر نکل گیا، ملک فیاض پرسوج انداز میں کمرے میں ٹپٹنے لگے۔

”شاہ ویز کو روکنا بڑے گا، ورنہ یہ چنگاری بہت تباہی لائے گی، یہ جمیل اب تک لوٹا کیوں نہیں شہر سے، اپنے کاروبار کے چکر میں گھر بار سب کچھ بھول بیٹھا ہے، نامراد اور اس کی بیوی ہونہ، اس عورت کے تو اپنے غم بھی ختم نہیں ہوتے، نہ شوہر کی پرواہ نہ اولاد کی، یہ مہر دین کہاں مر گیا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر اس کو آواز دینے لگے، مہر دین ہانپتے کانپتے لوٹا۔

بولے۔

”اپنی بی بی جی سے کہہ دو جا کر کہ وہ وقت گزر چکا جب ملک فیاض، نجم النساء کی دھکیوں سے مرعوب ہوا کرتا تھا، ملک فیاض کے گھر کی بنیاد اس اتنی مستحکم ہو چکی ہیں کہ کوئی انہیں اب ہلا نہیں سکتا اور جہاں تک بات ہے سج کی تو اسے میں خود حویلی پہنچاؤں گا۔“ ملک فیاض نے گمبھیر لہجے میں کریم کو جواب دیا، کریم کے جانے کے بعد وہ غضبناک تیور کے ساتھ ایک بار پھر ملک جمیل کو کال ملانے لگے، کال اس مرتبہ بل چکی تھی، وہ بیٹے کو ساری صورتحال تفصیل سے سمجھانے لگے۔

☆☆☆

”تم سے آج ہر حساب بے باک کر لیا میں نے حذیفہ آفاق، تمہارا خاندانی غرور، تمہاری غیرت، تمہاری محبت اب میری مٹھی میں قید ہے، اگر میں مٹھی بھینچتا ہوں تو تمہاری عزت، تمہاری محبت کا دم گھٹنے لگے گا اور اگر میں مٹھی کھول دوں تو تمہارا خاندانی غرور ان فضاؤں میں معلق ہو جائے گا۔“ ملک شاہ ویز کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ چھپاں تھی، اس کی جیب برق رفتاری سے فارم ہاؤس کے راستے پر گاڑن تھی۔

”تم ہمیشہ میرے راستے میں آئے، کسی کالے بے کی طرح میری راہ کو کاٹتے چلے گئے، میرے معاملے میں ٹانگ اڑانا، میری دوستیوں کو خراب کرنا تمہارا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا، اب اپنا کیا بھگتو حذیفہ آفاق، وہ کاٹو جو تم نے بویا ہے۔“ شاہ ویز چشم تصور میں حذیفہ کو ایک ہارے ہوئے انسان کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

”ہا ہا ہا۔“ ایک بلند قہقہہ اس کے منہ سے نکلنے لگا۔

نوارے کی صورت پھوٹا۔

”حذیفہ آفاق وہ دن قریب ہے جب تم

آج ثابت کر ڈالا کہ اس کی رگوں میں بھی اس کے باپ کا ہی خون دوڑ رہا ہے، جو بے غیرتی اس نے آج میری پوتی کو اغواء کر کے دیکھائی ہے، میں یہ خوب جانتی ہوں کہ یہ بے غیرتی اسے ورثے میں ملی ہے، آخر وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر نہیں چلے گا تو اور کیا کرے گا، ہونہہ مگر ملک فیاض تم بھول چکے ہو تو تمہیں میں یاد دلا دوں کہ ہار تب بھی تمہارا مقدر بنی تھی اور آج بھی، کچھ دیر تک پولیس کا چھاپہ تمہارے علاقوں میں پڑنے والا ہے، میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ تم اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے پولیس کو اپنا ہم نوا بنا لو گے، مگر یاد رکھنا پولیس سے بچ بھی جاؤ گے تو شافع الدین سے تمہیں کون بچا پائے گا؟ اور تمہاری بہو؟ شافع الدین اگر تمہاری بہو تک پہنچ گیا تو پھر انجام کیا ہوگا، یہ اچھی طرح سوچ لو ملک فیاض کیا اس عمر میں بیٹے کا گھر ٹوٹا دیکھ سکو گے تم، شافع الدین کے بڑے حساب نکلتے ہیں تمہاری طرف اور میرا بیٹا اگر حساب بے باک کرنے پر آئے تو خسارے میں میرا خاندان نہیں بلکہ تمہارا خاندان رہے گا، بہتری اسی میں ہے کہ میری پوتی کو رات کی سیاہی سے پہلے پہلے تم حویلی میں با حفاظت پہنچا دو، ورنہ صبح کی سفیدی تمہارے لئے قیامت خیز ثابت ہوگی۔“ رقعے کی اک اک سطر ملک فیاض کا فشار خون بلند کرنے کے لئے کافی تھی، انہوں نے طیش کے عالم میں وہ رقعہ پھاڑ ڈالا۔

”تو نجم النساء پوتی کے اغواء کی خبر تم تک پہنچ گئی اور تم اپنی فطرت اسے مجبور فتنہ برپا کرنے کو اٹھ کھڑی ہوئیں، راہ نجم النساء وہ پوتی اغواء ہو گئی مگر تمہارے تکبر میں کوئی کمی نہ آئی۔“ وہ استہزائیہ انداز میں زیر لب بڑبڑائے، پھر خاموش کھڑے کریم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے

اپنی محبت اپنی عزت کے لئے مجھ سے بھیک مانگو گئے اور میں وہ دن تمہیں یاد دلاؤں گا جب تم نے سر عام میری عزت کا جنازہ نکالا تھا، تب تم جانو گے سر محفل تماشا بننا کیسا لگتا ہے۔“ انتقام کی لہر اس کے تن بدن میں دوڑ گئی، وہ منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جب حذیفہ کی وجہ سے اسے یونیورسٹی میں سب کے سامنے تذلیل اٹھانی پڑی تھی۔

وہ سڑتے دن اور ٹھہرتی راتوں کا دلکش موسم تھا، جب پہلی بار اس کا سامنا سین سے ہوا تھا، وہ بڑی بڑی آنکھوں اور کتابی چہرے والی الہز دوشیزہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ وہاں موجود تھی، حسب معمول کینٹین میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔
 ”لوگوں! آج کا دن بہت خاص ہے۔“
 کاشف نے ابلکتے ہوئے بلند آواز میں صدا لگائی۔
 ”کیوں بھی کیوں بھی۔“ اس کے ساتھیوں نے بے ہنگم انداز میں شور مچایا۔

”اسد نے آج ہمارے ہیرو شاہ ویز کی زندگی میں بہار کی آمد کی نوید سنائی ہے۔“ کاشف نے اپنی سابقہ ٹون برقرار رکھتے ہوئے مڑوہ سنایا، اسد پامسٹری کے انتہائی شوق میں مبتلا ان کا کلاس فیلو تھا۔

”مگر میڈم بہار تو گزشتہ دوروز سے چشینوں پر ہیں۔“ ایک منچلے نے بائیں آنکھ دہاتے ہوئے فقرہ کسا، کینٹین ایک بار پھر سے بے ہنگم تہقہوں سے گونج اٹھی۔

”اوہوا حقوں کے سردار، اس اجڑے چمن کا ذکر کون بیوقوف کر رہا ہے، ہم تو بات کر رہے ہیں اس بہار کی جس کے آنے سے باد صبا ٹھہر جائے، جس کے مسکرانے سے دل کے تار بج جائیں، جس کا آنچل لہرائے تو گھٹا چھا جائے، جو بولے تو چمن میں پھول کھل اٹھیں، جس کی

سانسوں کی خوشبو سے سانسیں معطر ہو جائیں، ہائے ہائے ہائے۔“ کاشف آنکھیں موندے اپنی لن ترانیوں میں مصروف تھا کہ شاہ ویز کی ایک چپت سے بری طرح ہڑبڑا اٹھا۔

”اولو کی دم، کسی حسینہ کا اتنا آؤٹ ڈیٹڈ سراپا ہمارے اباؤں کو ان کے خوابوں میں ستاتا ہو گا، اب وہ زمانہ گیا جب لڑکیوں کے آنچل لہرانے سے دل میں ٹھنٹی بجے، اب تو ماڈرن دور ہے گدھے ماڈرن دور، اب کوئی حسینہ آنچل میں اپنا رخ چھپا کر نہیں گھومتی۔“ شاہ ویز کی بات پر اس کے دوست تہقہ لگاتے ہنس پڑے۔

”دیے یار کچھ تو بتا، وہ دوشیزہ کیسی ہے، جو تجھے خوابوں میں آکر چھیڑ جاتی ہے۔“ یہ عابد تھا، شاہ ویز کا ہمراز، جو بڑے اشتیاق سے سوال کر رہا تھا۔

”ہاں یار شاہ ویز کچھ تو بتا یار، کیسی ہے ہماری بھابھی، ہمیں بھی تو پتا چلے۔“ کاشف نے شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے لقمہ دیا۔

”اوئے پانچ فٹے، بڑے بھڑک رہے ہیں تیرے جذبات ہاں۔“ روؤف نے بھی کاشف کے کاندھے پر تھپ لگاتے ہوئے ادباز انداز میں امٹری ماری، کاشف تجل سے انداز میں کھسا گیا، ان سب کا ایک بھر پور تہقہ کینٹین میں گونج اٹھا، ارد گرد بیٹھے کئی اسٹوڈنٹس نے شاہ ویز اور اس کے دوستوں کو ناگواری سے دیکھا، اس سے زیادہ وہ لوگ کچھ اور کر بھی نہیں سکتے تھے اس لئے پھر سے کھانے پینے اور گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

”اوہا لگوں، بیوقوفوں، آج تک ایسی لڑکی پیدا نہیں ہوئی جو مجھے خوابوں میں آکر ستا سکے، جو بھی ملی ان گناہگار آنکھوں کو اچھی لگی، پھر دل بھر گیا اور نظروں سے اتر گئی، آج تک ایسی کوئی

”پتا کرو کاشی، اس برسات میں یہ پری کس ڈیپارٹمنٹ میں اتری ہے۔“ شاہ ویز کی نگاہیں مسلسل اس دوشیزہ کے دلکش سراپے کا طواف کرنے میں مصروف تھیں، وہ لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ بارش سے لطف اندوز ہونے میں مصروف تھی، چٹا سفید رنگ، کتابی چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں گداز گلابی ہونٹ اور شوگرڈ رکٹ بال، اسے وہاں موجود ہر لڑکی سے ممتاز کر رہے تھے، کاشی تھوڑی ہی دیر میں تمام معلومات حاصل کر کے خراماں خراماں واپس لوٹا تھا۔

”کیا خبر لائے ہو میرے چیتے؟“ اس کے واپس لوٹتے ہی شاہ ویز نے سوال کیا۔

”اندازہ ٹھیک تھا بھائی، نئی آئی ہے یہاں، سائنس ڈیپارٹمنٹ کی اسٹوڈنٹ ہے، خاندان بھی بڑا اونچا ہے۔“ کاشی کی رٹوٹوٹے کی مانند فرساری تفصیلات سنانے لگا۔

”اوہ یاروں آگئی سو آگئی، یہ تو دل پر بھی بلت کی طرح ٹھا کر کے گئی ہے۔“ شاہ ویز سینہ سہلاتے ہوئے بھاری لہجے میں بولا۔

”اوئے ہوئے، صدقے جاؤں بہرو کے۔“ عابدہ باقاعدہ عورتوں کی طرح بالائیں لپٹے ہوئے بولا، ان سب کی اوباش نگاہیں اس لڑکی پر ٹھہری تھیں، وہ ان سب سے بے نیاز بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”ویسے یار یہ لڑکی ہمارے بھائی کے ساتھ بچے گی بہت، بالکل سلمان خان اور کترینہ کیف کی جوڑی لگے گی۔“ روؤف نے اپنی گول گول آنکھیں گھما کر چسکے لیتے ہوئے کہا۔

”ذرا آتا ہوں اس سے میل جول بڑھا کر، ساتھ کھڑا ہوں تو اس کے ساتھ میری تصاویر ضرور کھینچ لینا۔“ شاہ ویز دائیں آنکھ دباتے ہوئے ان تینوں کو ہدایت دیتے ہوئے بولا۔

لڑکی پیدا نہیں ہوئی جو ملک شاہ ویز کا دل تسخیر کر سکے۔“ وہ بڑی رعونت سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اوہو کیا بات ہے میرے یار کی، ایسی تو لڑکیاں دل نہیں ہارتیں میرے شیر جوان پر۔“ عابدہ صدقے وارے جاتے نہ ٹھکتا تھا، تب ہی اچانک گھنگھور گھٹائیں چھاتی چلی گئیں اور ساون جیم کر برسنے لگا، شاہ ویز اور اس کے دوست بھی باقی طلبہ کی طرح یونیورسٹی کے میدان میں نکل آئے، کئی دنوں سے اعصاب کو بوجھل کرتی گرمی کا زور آج ٹوٹا تھا، جل تھل کرتا ساون ان سب کے دلوں کو سرشار کر رہا تھا۔

”اوہ یار شاد کرو ڈالا اس جل تھل کرتی بارش نے۔“ شاہ ویز نے بارش میں بھیگتے ہوئے آسمان کی جانب نگاہ کرتے ہوئے کہا، ہوئی کی طرح برستی بوندوں نے اس کی بھوری آنکھوں کو پلکوں کی جھالروں میں چھپنے پر مجبور کر ڈالا، تب ہی کسی کی نفرتی ہنسی اس کی سماعتوں میں رس گھول گئی، شاہ ویز نے ایک جھپٹے سے آنکھیں کھول کر اس حسینہ کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں اس سنگ مرمر سے وجود پر ٹھہری گئیں۔

”کون ہے یہ لڑکی؟“ اس کے لبوں سے لفظ دھیرے سے سرسرائے، عابدہ نے اس کی بات سن کر چونک کر پہلے شاہ ویز کو اور پھر اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے اس لڑکی کو دیکھا۔

”یہ تو نیو انٹری ہے باس۔“ جنیز پر چھوٹی سی کرتی میں ملبوس وہ لڑکی، اپنے ماڈرن لحاظ کے باعث جلد ہی ان لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ ”پہلے بھی دیکھا نہیں، لگتا ہے فیض پور میں نئی نئی آئی ہے۔“ روؤف نے اسے سرتا پیر گھورتے ہوئے اندازہ لگایا۔

خوبصورت چہرے پر نکھرنے لگیں، شاہ ویز بے خود سا اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”بہت حسین ہوتم، تمہارا نام کیا ہے؟“

”سین..... سین کہاں ہوتم یا؟ کب سے

ڈھونڈ رہا ہوں اور تم یہاں بارش میں بھیگ رہی

ہو۔“ حذیفہ جھنجھلاہٹ کے عالم میں اچانک

وہاں پہنچا تھا، مگر سین کو شاہ ویز کے ساتھ محو گفتگو

دیک کر اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل

گئے۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ حذیفہ نے

درستی سے سوال کیا۔

”دیکھو ناں حذیفہ موسم کتنا حسین ہے اور

یہ بارش، بارش تو مجھے بہت پسند ہے، بس اس

خوبصورت موسم سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔“

سین نے اپنی مٹھی میں بارش کی بوندوں کو قید

کرتے ہوئے خوشی سے کہا۔

”واقعی یہ موسم اور یہ نظارہ بے حد دلکش

ہے۔“ شاہ ویز نے دل جلانے والی مسکراہٹ

کے ساتھ پہلے سین اور پھر حذیفہ کو دیکھتے ہوئے

کہا، غصے کی شدت سے حذیفہ کا چہرہ سرخ ہو

گیا۔

”تم چلو یہاں سے اور آئندہ میں تمہیں اس

شخص کے ساتھ نہ دیکھوں۔“ حذیفہ نے سین

کے بازو کو سختی سے تھامتے ہوئے غصے سے کہا۔

”اوہو حذیفہ چھوڑو میرا ہاتھ، کیا ہو گیا ہے

تمہیں؟“ سین نے جھنجھلاتے ہوئے اپنا بازو

چھڑاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو سین، خالہ نے تمہاری ذمہ داری

میرے سپرد کی ہے، تمہارا خیال رکھنا اور ہر شے سے

محفوظ رکھنا میری ذمہ داری ہے۔“ حذیفہ نے

ایک تیز نظر شاہ ویز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”حذیفہ پلیز، امان نے تمہیں میرا خیال

”جو حکم ہمارے یار کا۔“ وہ تینوں عیارانہ

ہنسی ہنستے ہوئے چہکے، شاہ ویز چہرے پر اپنی

مخصوص مسکراہٹ سجائے بڑے بڑے قدم اٹھاتا

ہوا اس لڑکی تک جا پہنچا۔

”ایکیکوزی۔“ شاہ ویز نے کھنکھارتے

ہوئے اس لڑکی کو متوجہ کیا۔

”جی کہئے۔“ اس لڑکی نے مڑ کر شاہ ویز کی

پرکشش شخصیت کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے جواب

دیا۔

”آپ کا چہرہ بتاتا ہے کہ.....“ شاہ ویز

نے لڑکی کی نگاہوں میں اپنے لئے پسندیدگی کا

تاثر بھانپ لیا تھا، تب ہی بات ادھوری چھوڑ کر

اسے پر شوق نظروں سے دیکھنے لگا۔

”ارے رک کیوں گئے آپ، میرا چہرہ دیکھ

کر کیا محسوس ہوتا ہے آپ کو۔“ وہ لڑکی بھی شوخ

وشنگ واقع ہوئی تھی، شوخی سے مسکراتے ہوئے

دریافت کرنے لگی۔

”یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوہ قاف کی

سلطنت ہمارے فیض پور پر اچانک مہربان ہو گئی

ہے۔“ شاہ ویز نے کن اکھیوں سے اپنے دوستوں

کی جانب دیکھ کر خفیف سے انداز میں سر ہلا کر

ہلکا سا اشارہ کیا، روؤف اور کاشی نے ایک

دوسرے کو دیکھا اور نامحسوس انداز میں اس لڑکی

کے ساتھ شاہ ویز کی تصاویر بنانے لگے۔

”اور ایسا کیوں محسوس ہوا آپ کو؟“ اس

لڑکی نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بننے کی

بھرپور اداکاری کی۔

”محترمہ مہربان ہی تو ہوئی ہے تب ہی تو

آپ جیسی پیاری سی لڑکی کو یہاں بھیج دیا۔“ شاہ

ویز کی مسکراہٹ بھرپور تھی، وہ لڑکی اس کی بات پر

کھلکھلا کر ہنس پڑی، بارش کی رفتار تھمنے لگی تھی،

منہی منہی بوندیں موتیوں کے صورت اس کے

رکھنے کا کہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم سائے کی طرح میرے پیچھے پڑ جاؤ۔“ سین نے تنک کر جواب دیا۔

”سین تم میری بات نہ ہیں سمجھ رہیں، یہ شخص اس قابل نہ ہیں کہ تم اس سے بات کرو، تم اسے نہیں جانتیں مگر میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ حذیفہ نے سین کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ شاہ ویز کو بھی گھور کے دیکھا، اس کی بات پر شاہ ویز نے تمللا کر اسے دیکھا۔

”گواس بند کرو اپنی تم، میرے بارے میں تم جانتے ہی کیا ہو جو یوں فضول بکے جا رہے ہو؟“

”میں کیا، تمہارے ملکہ کردار کا تو پورا فیض پور گواہ ہے۔“ حذیفہ نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔

”گواس بند کرو حذیفہ۔“ شاہ ویز بے اختیار حذیفہ کو مارنے کے لئے آگے بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں آپس میں گتھم گتھم ہو گئے، شاہ ویز کے ساتھی بھی اس کی حمایت کے لئے دوڑے چلے آئے، وہ سارے مل کر حذیفہ پر حاوی ہونے لگے، تب تک حذیفہ کے دوستوں کو اس جھگڑے کی خبر مل گئی، اب جھگڑا محض دو لوگوں کے درمیان تک محدود نہیں رہا تھا، دو گروپوں تک پھیل چکا تھا۔

”آپ لوگ پلیز یوں لڑنا جھگڑنا بند کر دیں۔“ سین اس ساری صورتحال سے بری طرح گھبرا کر تقریباً رو پڑی تھی، مگر جھگڑا اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بات یونیورسٹی کی انتظامیہ تک جا پہنچی تھی۔

☆☆☆

نیٹ کی باریک جالی، شیشے کے دھار کی تیزی سہمہ نہیں پائی اور آسانی سے کٹتی چلی گئی، شمع

جلدی جلدی کٹی جالی کو ہٹانے لگی، تھوڑی ہی دیر میں اتنا راستہ بن چکا تھا کہ وہ کھڑکی چلائنگ کر باہر کود سکتی تھی، اس نے ایک نظر شیشے کے تیز دھار ٹکڑے کو دیکھا اور ایک دم سے برے پھینک ڈالا، اگلے ہی لمحے وہ کھڑکی سے چلائنگ لگا کر باہر کود پڑی، وہ سمجھ رہی تھی کہ کھڑکی سے باہر نکل کر اس قید سے رہائی اس کی منتظر ہوگی، لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا، باہر سیاہ اندھیرے میں ڈوبا گھٹنا جنگل سا کھیت تھا، اس نے گھب اندھیرے میں آنکھیں چھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، دور بہت دور، جملوں کے مانند اسے روشنی چمکتی دکھائی دی، شمع اسی جانب جھاڑ جھنکار سے ابھتی ہوئی بھاگنے لگی، اس کی ہانپتی سانسیں، بھاگتے قدموں کی چاپ نے چوکیداری پر معمور شکاری کتوں کو خبردار کر ڈالا، وہ اس کے تعاقب میں بھونکتے ہوئے تیزی سے اس کی جانب بڑھنے لگے۔

شمع کا دل بری طرح سے دہل اٹھا، اس کے قدموں کی رفتار مزید تیز تر ہوتی چلی گئی، وہ بار بار پیچھے پلٹ کر دیکھتی جاتی اور اندھا دھند بھاگتی چلی جاتی، کتوں کے بھونکنے کی آواز مزید قریب تر ہوتی چلی گئی۔

”آہ۔“ اچانک اس کا پیر جھاڑیوں میں جا الجھا، اور وہ ایک دم سے اوندھے منہ جا گری، پیر پر کانٹا چبھا تھا، اندھیرے کے باعث کچھ بھی دکھائی دے رہا تھا نہ سچائی دے رہا تھا، وہ اندازے سے اپنے پیر کے ٹکڑے کو ٹٹولنے لگی۔

”آہ..... یہ کانٹا جان کا عذاب بن گیا ہے آہ۔“ وہ کراہتے ہوئے سہلانے لگی، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اسے اپنے بے انتہا نزدیک سے سنائی دینے لگی، اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی، تب ہی اسے ادراک ہوا کہ اس کی حسیں نہ صرف کتوں کا بھونکنا بلکہ ان کا ہانپنا

نادان پرندے کی طرح وہ اس کے جال میں پھنسی چلی جا رہی تھی اور اس دن اگر حذیفہ وقت پر نہ پہنچتا تو.....!!

وہ دن یاد کر کے حذیفہ نے ایک جبر جھری سی لی۔

”کیا ہوا حذیفہ تم ٹھیک تو ہو؟“ انیسہ پریشان ہو کر تیزی سے اس کی جانب بڑھیں۔
”کچھ نہیں، مجھے بس شمع کی فکر ہے، نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی، دادی کہہ کر تو بہت کچھ گئی ہیں مگر نہ جانے وہ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرا پائیں گی یا نہیں۔“ حذیفہ فکر مندی سے کہنے لگا۔

”دیکھو بیٹا، ہو سکتا ہے میری بات تمہیں کڑی لگے، مگر میری جان میں تمہاری ماں ہوں، جو بھی کہوں گی تمہارے بھلے کے لئے ہی کہوں گی۔“ بیٹی کی فکر مندی دیکھ کر انیسہ اس کے بال سلہاتے ہوئے بولنا شروع ہوئی۔

”آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر امی مگر خدا راسخ کے حوالے سے کچھ مت کہیے گا۔“ انیسہ کے ارادے بھانپ کر حذیفہ نے انہیں پیٹھ کی خبردار کر ڈالا۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو بیٹا، تمہارے زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ جانے سے کچھ ٹھم نہیں گیا، جانتے بھی ہو کتنا وقت گزر چکا ہے، دن رات میں ڈھل چکا ہے، نہ جانے شمع کے ساتھ اب تک کیا کچھ نہ بیت چکا ہوگا، ایک اوباش فطرت انسان کی قید میں گرفتار اس لڑکی کی حالت اس وقت کیا ہوگی، تمہاری غیرت کو تو اس بات کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے حذیفہ، خود سوچو کہ وہ اگر لوٹ بھی آئی تو کیسے اپنا ڈگے اسے تم؟“ انیسہ نے حقیقت کو مزید بد صورت بنا کر اس کے سامنے پیش کیا۔

بھی محسوس کر سکتی ہیں، خوف کی ایک شدید لہر اس کی رگوں میں سرایت کر گئی۔

☆☆☆

اس جھگڑے سے اگر صحیح معنوں میں کسی کی بدنامی ہوئی تھی تو وہ سبین کی تھی، حذیفہ کی خالہ زاد بھی، دوسرے قصبے سے آئی تھی، حذیفہ نے اسے شمع کے کاج میں ایڈیشن لینے کا مشورہ دیا تھا، مگر سبین نے اس کے مشورے کے برعکس اس کی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا، رافعہ (سبین کی ماں) نے حذیفہ کو سبین کا خیال رکھنے کی خاص ہدایت دی تھی اور حذیفہ ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہی اسے شاہ ویز سے گفتگو کرنے سے روک رہا تھا، کیونکہ وہ شاہ ویز کی یونیورسٹی میں ریپوزیشن بہت اچھی طرح جانتا تھا، وہ ایک دل چسبک، رٹلن مزاج شخص تھا، نو خیز کلیوں کے آگے پیچھے منڈلانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور پھر ان خوشبوؤں سے مہکتی کلیوں کے رنگ و بو چرا کر وہ آوارہ بھنورہ کی اور سمت اڑ جاتا تھا۔

وہ سبین کو بچانا چاہتا تھا مگر سبین حذیفہ سے بے حد خفا تھی، یہ اس کی خفگی ہی تھی جو اس نے حذیفہ کی ہر ہدایت کو نظر انداز کر کے شاہ ویز سے دوستی کر ڈالی تھی، وہ ایک ناپختہ سوچ کی حامل خود سر لڑکی تھی، اکلوتی ہونے کے باعث ماں باپ کے لاڈ پیار نے اسے مزید خود پسند بنا ڈالا تھا۔
شاہ ویز کی مقناطیسی شخصیت اور سحر انگیز باتوں نے سبین کو اس کا گرویدہ بنا ڈالا تھا، ان دونوں کی دوستی جلد ہی میل ملاقاتوں میں ڈھلتی چلی گئی۔

سبین، شاہ ویز پر اندھا اعتماد کرنے لگی تھی، وہ اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ اس کی شاہ ویز سے ہر ملاقات کی تصاویر اس کے دوستوں کی بدولت شاہ ویز کے موبائل میں محفوظ ہیں، کسی

جاسکتا ہے، سب میری غلطی ہے امی، میری غلطی کی وجہ سے شمع اس حال تک پہنچی ہے۔“ حذیفہ کے لہجے کے تڑپ انیسہ کو مزید سلگا گئی۔

”کیوں؟ ایسا کیا کیا تھا تم نے جو ملک شاہ ویز تمہارا یوں جانی دشمن بن بیٹھا۔“ انیسہ غضبناک ہوتے ہوئے، ہاتھ لہرا کر بولیں۔

”میں..... میں نہیں بتا سکتا۔“ حذیفہ کہتے کہتے چپ سادھ گیا، انیسہ اسے غصے سے گھورنے لگیں۔

☆☆☆

”تم نے مجھے سین کی نظروں میں گرا ڈالا، میری عزت دو کوڑی کی کر ڈالی، میں وہ دن کبھی نہیں بھلا سکتا جب سین نے میرے منہ پر تھوکا تھا، آج میں تمہیں تمہاری محبت کو اس قابل رحم بنا ڈالوں گا کہ فیض پور کا ایک ایک شخص تھوکے گا، طعنے کے گا اور تمہارے پاس کچھ کہنے کے لئے یہ لفظ ہوں گے نہ سننے کے لئے ہمت ہوگی۔“ زہر خند سوچیں اسے اندر تک ڈس رہی تھیں، انتقام کی آگ اسے جھلسائے دے رہی تھی وہ دن آج بھی اس کی نگاہوں میں سوئی کی طرح چبھتا تھا۔

سین، شاہ ویز کی شخصیت سے اس حد تک متاثر ہو چکی تھی کہ اس کی ہر بات پر اندھا اعتماد کرتی تھی، شاہ ویز کے دیکھائے گئے جھوٹے سپنوں پر وہ دل و جان سے یقین کر بیٹھی تھی، شاہ ویز اس کی خوبصورتی پر نڈا تھا تو نادانیوں پر مسکراتا تھا، محبت کا جھانسا دے کر وہ اس کے ساتھ شرمناک کھیل کھیلنا چاہتا تھا، اسی مقصد کے تحت اس نے سین کو پھسانے کے لئے ایک جال بچھایا تھا۔

”سین کل میری سالگرہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کل کا دن میرے لئے بے حد خاص ہو، تم اپنے ساتھ سے کل کی شام میرے لئے بے حد

”آپ جانتی ہیں امی کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ مجھے کس بات پر اکسار رہی ہیں؟“ حذیفہ نے ماں کی خطی سے گھورتے ہوئے کہا

”میں تمہیں کسی بات پر بھی نہیں اکسار رہی حذیفہ، صرف حقیقت کا سامنا کرنا سکھا رہی ہوں۔“ انیسہ نے پریش لہجے میں جواب دیا۔

”آپ حقیقت کی بات کر رہی ہیں، جانتی بھی ہیں کہ حقیقت کیا ہے؟“ حذیفہ رخ ہوا۔

”حقیقت یہ ہے حذیفہ کہ ایک اغواء شدہ لڑکی کی اس معاشرے میں کوئی عزت ہوتی ہے اور نہ ہی لوگوں کی نظروں میں، گھر سے باہر گزاری ایک بھی رات کسی بھی لڑکی کی زندگی کو نگل جاتی ہے، وہ لڑکی لوٹ بھی آئے اگر تو ایک زندہ لاش کے سوا کچھ نہیں ہوتی اور میں کسی زندہ لاش سے اپنے بیٹے کی شادی نہیں کرنے والی۔“ انیسہ سفاکی سے کہتی چلی گئیں۔

”کتنی سنگ دل ہیں آپ امی، کتنی آسانی سے اپنا فیصلہ بنا گئیں آپ، یہ جانے بغیر کہ آج اگر شبنم اس حال میں ہے تو اس کی وجہ کوئی اور نہیں آپ کا اپنا بیٹا ہے۔“ حذیفہ کو ماں کی بے حسی نے شدید تکلیف پہنچائی تھی، وہ شدت غم سے کہنے لگا۔

”ہر الزام اپنے سر لینے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں حذیفہ، خود کو کیوں مجرم گردانتے ہو آخر تم؟ شمع کے لئے تمہاری یہ حد سے زیادہ بڑھی محبت مجھے ایک آنکھ نہیں بھار رہی حذیفہ۔“ انیسہ کے لہجے کی کٹی، حذیفہ کو سرتا پیر سلگا گئی۔

”میں مجرم ہوں شمع کا، میری غلطی سے وہ اس حال تک پہنچی ہے، میرا جرم ہے، میں اسے لے کر گیا تھا ملکوں کے علاقے میں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ شاہ ویز کی مجھ سے دشمنی ہے اور مجھے تکلیف دینے، تڑپان کے لئے وہ کسی بھی حد تک

خوبصورت بنا ڈالو۔“ وہ دونوں حسب معمول یونیورسٹی کی کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، شاہ ویز نے ایک دم سے سین کا ہاتھ تھام کر گمبیر لہجے میں کہا تھا۔

”شاہ ویز یہ..... یہ کیسے ممکن ہو بھلا؟ ہم دن بھر یونیورسٹی میں تو ساتھ رہتے ہیں مگر شام کا وقت کیسے ساتھ بیٹا سکتے ہیں؟“ سین اس کے ہاتھ تھام لینے کی جرأت پر سمٹی گئی تھی، شاہ ویز کی بولتی نظریں اسے نگاہیں چرانے پر مجبور کر گئیں۔

”کیوں نہیں بیٹا سکتے لمحے ایک ساتھ، میری سالگرہ کا دن میرے لئے ہمیشہ بے حد خاص رہا ہے سین اور اتنے اہم دن کو میں کسی خاص ہستی کے ساتھ گزارنا چاہوں گا اور تم سے زیادہ خاص اس دنیا میں میرے لئے اور کون ہے بھلا۔“ شاہ ویز کی نظریں سین کے خوبصورت چہرے پر گڑھی گئیں تھیں، یہ اس کی نگاہوں کی کارستانی تھی جو سین کے لئے بوجھل ہوتی پلکوں کی جھالروں کو اٹھانا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔

”کیا مجھ سے زیادہ خاص تمہاری زندگی میں کوئی بھی نہیں ہے شاہ ویز؟“ سین نے جھجکتے ہوئے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے شاہ ویز کو دیکھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ تم سے زیادہ خاص میری زندگی میں کوئی ہو سکتا ہے؟“ شاہ ویز ان اس کے سوال کے جواب میں سوال اٹھایا، سین اسے دیکھتی رہ گئی۔

”تم سے زیادہ خاص میری زندگی میں کوئی بھی نہیں ہے۔“ شاہ ویز جذب کے عالم میں کہنے لگا۔

”میں مانتا ہوں تم سے پہلے میری کئی لڑکیوں سے دوستیاں تھیں، کئی لڑکیاں میرے

ساتھ کی متمنی تھیں، مگر میں نے کبھی بھی انہیں اپنے دوست سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھا، ان میں سے کوئی ایک بھی لڑکی ایسی نہ تھی جسے میں اپنے دل کی مسند پہ بیٹھاتا۔“ وہ سین کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے گمبیر لہجے میں کہہ رہا تھا، سین کے صبح چہرے پر قوس و قزح کے رنگ کھل اٹھے، اس کی نگاہیں حياء کے بوجھ تلے جھکتی چلی گئیں۔

”مگر میں جب سے تم سے ملا ہوں، تمہیں دیکھتے ہی خود پر سے اختیار کھو بیٹھا ہوں، ہر پل تمہارے خیالوں میں کھویا کھویا سا رہتا ہوں کوئی تو خاص بات ہے تم میں سین، میں ایسے ہی تو تمہارا دیوانہ نہیں ہوتا جا رہا۔“ وہ کہتا چلا جا رہا تھا، سین بے خودی اسے دیکھتے چلی جا رہی تھی۔

”تمہارے بغیر اب میرا ایک لمحہ بھی نہیں گزرتا اور آج..... آج دیکھو کتنا خاص دن ہے میری زندگی کا اور تم کہتی ہو میری خوشی میں آج شامل نہیں ہوگی، کتنی ظالم ہو تم سین۔“ وہ مصنوعی انداز میں روٹھتے ہوئے بولا۔

”میں کیسے ظالم ہو سکتی ہوں شاہ ویز، تم جاننے تو ہو میرے دل میں تمہارے لئے کیا جذبات ہیں۔“ سین اس کی ناراضگی پر گھبراتے ہوئے بولی۔

”اگر تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ ہے کوئی احساس ہے تو تم میری خواہش کا ضرور خیال رکھو گی سین۔“ اس نے زردٹھے پن سے کہا۔

”اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تم میری سالگرہ کی دعوت ضرور قبول کر دو گی۔“ سین کو کمزور پڑتا دیکھ کر وہ مزید حاوی ہوتا چلا گیا۔

”مجھے تم سے محبت ہے شاہ ویز، میں آؤں گی تمہاری سالگرہ پر۔“ سین اس کی ٹھنکی پل بھر کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکی، فوراً اقرار کر

بیٹھی۔

شاعری پڑھنی چاہیے؟“ نوریا نے تکیھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا، وہ اب مکمل طور پر عالیاں کی جانب متوجہ تھی۔

”اف..... نوری یار کتنی بد ذوق ہو تم، تم ایک شاعری کی کتاب پڑھ رہی ہو، کسی سنان سڑک پر اکیلی نہیں نکل رہیں، جو چھری چاقو سے لیس ہونے کی باتیں کر رہی ہو۔“ عالیاں نے بد مزہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا تو محترم باذوق عالیاں صاحب، ذرا کھل کر بتائیے کہ مجھے کن لوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب پڑھنی چاہیے۔“ عالیاں کے جھنجھلانے پر وہ زیر لب مسکاتے ہوئے بولی۔

”محترمہ کزن صاحبہ چائے یا کافی، کچھ تو خیال رکھا جاتا ان عناصر کا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اوہ یہ تو واقعی مجھ سے بڑی بھول ہو گئی عالی، چائے تو خیر میں پتی نہیں مگر کافی میری من پسند ہے۔“ نوریا نے سر پر دھیرے سے ہاتھ مارتے ہوئے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

”کافی مجھے بھی بے حد پسند ہے۔“ عالیاں نے اسے فوراً سے جتایا۔

”کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہ رہے کہ میں ہنی کافی کے ساتھ ساتھ تمہارے لئے بھی کافی بناؤں، اوہ اب میں بھی تو اتنی لمبی تمہید کافی کے چکر میں بانڈھی گئی تھی۔“ نوریا نے اسے شرارتی انداز میں دیکھتے ہوئے جتایا۔

”ایلیکسیو زوری نوری بیگم آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ عالیاں سکندر کافی صرف اپنے ہاتھ کی پینا پسند کرتا ہے، کسی اور کی بنائی ہوئی کافی کا ذائقہ مجھے پسند نہیں آتا۔“ وہ گردن اکڑا کر جواباً جتا گیا۔

”جھوٹے، یاد دلاؤں صرف میرے ہاتھ

”میں جانتا تھا تم مجھے انکار نہیں کرو گی، میری خواہش ضرور پوری کرو گی۔“ شاہ ویز، سین کا ہاتھ تھام کر مسکرا کر کہنے لگا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چم تھی، سین نے اس چمک کو اس کی خوشی سے تعبیر کیا تھا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر ذرا سا اور وہیں رکتیں تو..... سورج جھانک کر دیکھ رہا تھا کھڑی سے ایک کرن جھیکے پر آکر بیٹھی تھی رخسار کو چومنے والی تھی کہ.....

تم منہ موڑ کر چلدیں اور بیچاری کرن فرش پر گر کر چور ہوئی.....!

تھوڑی دیر، ذرا سا اور وہیں رکتیں تو.....!

وہ کاؤچ پر بیٹھی گلزار کی شاعری کی کتاب پڑھنے میں محو تھی، عالیاں کب اس کے عقب میں آکر کھڑا ہوا اسے خبر بھی نہ ہوئی۔

”تم کتنی بورنگ ہو یا نوری۔“ عالیاں نے اس کے عقب سے کتاب میں جھانکتے ہوئے دھیرے سے کہا، وہ جب بہت موڈ میں ہوتا تو نوریا کو اسی نام سے پکارتا تھا۔

”عالیاں..... ڈرا دیا تم نے تو۔“ نوریا جو نکتے ہوئے پیچھے پلٹی۔

”اور یہ کیا کہا تم نے؟ میں بورنگ ہوں؟ کیوں جواب دو ذرا؟“ خفگی بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ اس سے لڑنے کے موڈ میں تھی۔

”کیونکہ وہ بڑے ہی بورنگ قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو شاعری کی اتنی انمول کتاب خالی خولی بیٹھ کر پڑھ رہے ہوتے ہیں۔“ عالیاں نے اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ کر، اس کی گود میں دھری کتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو کیا چھری چاقو سے لیس ہو کر

اسے ہولے سے پکارا، جاتے جاتے عالیاں نے اسے پلٹ کر دیکھا۔

”طلم مصر ہے اس کے حسین ہاتھ میں۔“

”جو وہ بنائے تو، کافی کو جام کر دے گا۔“

اسے بغور دیکھتے ہوئے نوریا نے مسکرا کر ہولے سے گفتنایا۔

”یہ سحر تمہارا نہیں ہے عالیاں، محبت کا ہے،

جو میں چاہت سے شکست کھائے شخص کے ہمراہ

کافی پینے کے لئے راضی ہوں۔“ وہ اسے واضح

انداز میں بتا گئی، انداز میں تکبر تھا، لہجہ پر غرور

تھا، ہونٹوں پر مسکان تھی، عالیاں نے اسے دیکھی

سے دیکھا۔

”میں دنیا سے جیت سکتا ہوں نوریا، مگر تم

سے نہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے ہار مان گیا، نوریا اس

کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆☆

زندگی کیا ہے اک کہانی ہے

یہ کہانی نہیں سنانی ہے

اپنی تعمیر جان و دل کے لئے

اپنی تعمیر ہم کو ڈھانی ہے

یہ ہے لہجوں کا ایک شہرازل

یاں کی ہر بات ناگہانی ہے

رنگ کی اپنی بات ہے ورنہ

آخر خون بھی تو پانی ہے

ارغ عبت کا وجود ہے جس سے

زندگی کو مراد پانی ہے

شام ہے اور صحن میں دل کے

اک عجب حزن آسانی ہے

وہ خاموشی سے بیٹھیں خلا میں کسی غیر مرئی

نقطے کو گھور رہی تھیں، چائے کی پیالی ان کے

ہاتھوں میں پھنسی، اپنی گرمی کا احساس کھو چکی تھی،

ان کی نگاہوں کے سامنے وقت کا پہیہ بہت تیزی

کی بنی کافی تمہیں اچھی لگتی ہے، کیونکہ میں تم سے زیادہ شاندار کافی بناتی ہوں۔“ وہ کاؤچ سے اٹھ کر اس کے سامنے کمر پر ہاتھ رکھ کر آکھڑی ہوئی اور گھورتے ہوئے کہنے لگی۔

”بالکل بھی نہیں، وجہ یہ نہیں کہ تم مجھ سے

زیادہ اچھی کافی بناتی ہو۔“ عالیاں نے بھی اسی

کے انداز میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا۔“ نوریا نے اسے آنکھیں سکیڑ کر

دیکھتے ہوئے اچھا کو کھینچ کر کہا۔

”تو پھر کیا وجہ ہے عالیاں بے۔“ اس نے

تپ کر طنزیہ انداز میں عالیاں کو مخاطب کیا،

عالیاں بے اختیار مسکرائی۔

”وجہ محبت ہے، تم سے محبت ہے نوری۔“

اس نے دھیمے لہجے میں مسکرا کر جواب دیا، اس کی

بھوری آنکھیں نوریا کے چہرے پر مرکوز تھیں، وہ

بہت پر اعتماد تھی مگر عالیاں جب بھی یوں اچانک

اپنی محبت کا برجستہ اقرار کرتا تھا، وہ جھینپ جاتی

تھی۔

”یہ تم سے محبت ہے نوری جو تمہاری ہر

بات تمہاری ہر شے، تمہارا ہر کام مجھے خود سے

زیادہ عزیز ہے، ورنہ عالیاں سکندر یوں کسی کے

آگے زیر نہیں ہوتا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں

جھانکتے ہوئے بے نیازی سے جتا گیا، نوریا کے

لبوں پر ایک محفوظ ہوتی مسکان پھیل گئی، اس کی

خاموش نظریں عالیاں کے چہرے کا محاسبہ کئے

ہوئے تھیں۔

”میں کافی بنانے جا رہا تھا، سوچا تم سے بھی

پوچھ لوں، کافی پیو گی ناں میرے ساتھ۔“ عالیاں

کافی کی پیشکش کرتے ہوئے کہا، نوریا نے

ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا، عالیاں نے

اسے مسکرا کر دیکھا اور وہاں سے پلٹ گیا۔

”سنو عالیاں۔“ اس کے پلٹنے پر نوریا نے

پریشان کن انداز میں سلطان کے سامنے اپنی مجبوری، اپنا نقطہ نظر پیش کرنے لگے، سیما اپنے بڑے بھائی کی فکر مند جان کر ہولے سے مسکرا اٹھیں۔

”رحمان بھائی میں آپ کے اندیشے، پریشان و ہم و گمان سب کچھ سمجھتا ہوں اور یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ جیسا شفیق مہربان خلوص و محبت والا انسان انہی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گا، آپ جن مسئلوں پر پریشان ہیں ان باتوں کی باریکیوں کو میں نے بھی گئی بارسو چاہے اور بہت غور و خوص کے بعد میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں۔“ رحمان اختر کی ذہنی پریشانی جان کر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

”کیسا فیصلہ سلطان؟“ رحمان اختر نے چونکتے ہوئے دریافت کیا، خود سیما بھی اسی کیفیت سے دوچار تھیں۔

”میں نے حویلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے، اگر اماں جی نے میری خواہش کا احترام نہیں کیا اور میری شادی سیما سے کروانے پر رضا مند نہیں ہوئیں تو میں حویلی چھوڑ دوں گا، مگر سیما کی محبت سے دستبردار نہیں ہوں گا۔“ سلطان الدین اہل لہجے میں اپنا فیصلہ سنائے، ان کے فیصلے پر رحمان اختر ہی نہیں سیما بھی دنگ سی رہ گئیں۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو سلطان حویلی چھوڑ دو گے؟ اپنا گھر، اپنا خاندان سب کچھ چھوڑ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“ رحمان اختر سنجیدگی سے انہیں سمجھانے لگے۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ آسان نہیں ہے، مگر میں اپنی خوشی سے دستبردار نہیں ہو سکتا، محبت زندگی میں ایک ہی بار ہوتی ہے رحمان بھائی، اپنے حصے کی محبت میں سیما کے نام کر چکا ہوں، دوبارہ نہیں کر سکتا، سیما کو چھوڑ کر میں کسی اور سے

سے گھوم رہا تھا، ایک سردی شام ان کی سیاہ آنکھوں میں چپکے سے آنکھری۔

”رحمان بھائی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سیما کے نام اس کے احترام پر کوئی حرف نہیں آئے گا، سیما کی عزت مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، میں اسے بہت خوش رکھوں گا، اس کی کوئی بھی خواہش ادھوری نہیں چھوڑوں گا۔“ یہی لاؤنج تھا جہاں سلطان الدین ان کے بڑے بھائی کے سامنے بیٹھے اپنی محبت، اپنے جذبوں کی سچائی کا یقین دلا رہے تھے، وہ لاؤنج کی دیوار کا اوٹ لئے ان کی ساری باتیں سن رہی تھیں، رحمان بھائی کا جواب سننے کے لئے ان کا رواں رواں ہمہ تن گوش تھا۔

”سلطان میں جانتا ہوں تم جو بھی وعدے دعوے کر رہے ہو، وہ سب سچ ہے مگر ایک حقیقت اور بھی ہے اور وہ اتنی تلخ ہے کہ میں تمہاری محبت کی سچائی کردار کی پختگی پر یقین کر بھی لوں تو اس سچائی سے نظریں نہیں چرا سکتا۔“ رحمان اختر اتنا کہہ کر لحظہ بھر کو خاموش ہوئے تھے، ان کی بات سن کر سلطان الدین کے چہرے پر اضطراب سا پھیل گیا، وہ سامنے براجمان رحمان کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

”تمہارا شہر، خاندان، رہن بہن ہم لوگوں سے یکسر مختلف ہے، چلو میں تمہاری اور سیما کی خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس واضح فرق کو نظر انداز کر بھی دوں تو اس بات کو کیسے بھلاؤں کہ تمہاری ماں اس رشتے پر راضی نہیں، وہ کسی طور پر بھی سیما کو اپنی حویلی کی بہو کے روپ میں دیکھنا نہیں چاہتیں، تم خود دل پر ماتھ رکھ کر کہو سلطان میں سب کچھ جانتے بوجھتے کیسے اس حویلی میں اپنی ڈالی بہن کو بھیج دوں جہاں اس کا نہ کوئی قدر دان ہو نہ عزت دینے والا ہو۔“ رحمان اختر

میں داخل ہوئیں تھیں، سیما کو یوں سوچوں میں گم بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس چلی آئیں، چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھتے ہوئے وہ نرمی سے بولیں۔

”اوہ کچھ نہیں بھابھی، بس ایسی ہی سوچ رہی تھی کہ وقت کتنی تیزی سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔“ وہ اچانک چونکیں تھیں، سامنے شہیلہ کو پا کر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولیں۔

”وقت تو واقعی بہت تیزی سے گزر رہا ہے، ایک ہمارا دور تھا، جب زندگی ہمارے گرد گھوما کرتی تھی، کتنا خوش رنگ زمانہ تھا، جب میں رحمان سے اور تم سلطان بھائی سے نخرے اٹھوایا کرتے تھے، رحمان تو پھر مدد مزاج تھے مگر سلطان بھائی تو تمہارے نخرے اٹھاتے نہ تھکتے تھے، مجھے آج بھی یاد ہے کہ تم دونوں کے درمیان کتنی خوبصورت ڈہنی ہم آہنگی تھی، میں تو رحمان کو بھی تم لوگوں کی مثالیں دیا کرتی تھی۔“ شہیلہ بیتا وقت یاد کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”واقعی بھابھی بہت کمال کے دن تھے، بس جو وقت گزر گیا وہی خوبصورت ہے۔“ سیما ایک گہری سانس بھرتے ہوئے یاسیت سے بولیں۔

”کیا بات ہے سیما تم اتنی اداس کیوں لگ رہی ہو مجھے، اس بار جب سے آئی ہو بہت خاموش ہو، سب ٹھیک تو ہے ناں؟ سلطان بھائی تو ٹھیک ہیں ناں؟“ شہیلہ فکر مند سیما کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”سب ٹھیک ہے بھابھی، پریشان کیوں ہوں گی بھلا میں؟ بس ایسے ہی کبھی کبھی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے، تو یونہی کچھ بھی بولتی چلی جاتی ہوں۔“ سیما بات بدل کر لہجے میں بشارت بھرتے ہوئے بولیں۔

شادی کر لوں اور اسے محبت نہ دے سکوں تو؟ وہ تعلق پھر رشتہ نہیں منافقت ہوگا، زیادتی ہوگی اور صرف اماں جی کی خوشی کی خاطر میں اپنے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا۔“ سلطان الدین نے قطعیت سے اپنا موقف بیان کر دیا۔

”سلطان آپ کی محبت میری زندگی کا غرور ہے، آپ کا ساتھ میرا فخر ہے۔“ سیما کو اس پل اپنی محبت پر بے پایاں فخر محسوس ہوا تھا۔

”تم جذباتی پن کا شکار ہو رہے ہو سلطان، یہ رشتے نا طے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے، ماں باپ کو اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر تم کیسے خوش رہ سکتے ہو بھلا؟“ رحمان اختر اسے ٹوکتے ہوئے کہنے لگے۔

”تم ان سے بغاوت کر کے شادی کر بھی لو تو کب تک ان سے دور رہو گے، آج نہیں تو کل، کبھی نہ کبھی تو تمہیں اپنے خونی رشتوں کی یاد آئے گی ناں، پھر کیا کرو گے، تم بیٹھی طور پر ان کی جانب لوٹو گے اور تب سیما کا کیا ہوگا؟ تمہارے گھر والے اگر اسے تب بھی قبول نہ کریں پھر؟“ رحمان اختر کو ہزار اندیشے دوسو سے ستانے لگے تھے۔

”میں اپنے وعدے سے پھرنے والا انسان نہیں ہوں رحمان بھائی، اگر ایسا ہوتا تو سیما کے لئے اتنا بڑا قدم نہیں اٹھاتا، میں سیما کے حقوق کی حفاظت خود سے بڑھ کر کروں گا، میرے گھر والے جب تک سیما کو اپنی بہو قبول نہیں کریں گے تب تک میں واپس نہیں لوٹوں گا۔“ سلطان الدین ہر صورت میں اپنی بات پر قائم تھے، اور اس دن سیما کو اپنی محبت پر بے حد ناز ہوا تھا۔

”سیما کن خیالوں میں گم ہو؟ اور چائے بھی نہیں پی اب تک، دیکھو ذرا برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ شہیلہ کچن سے فارغ ہو کر لاؤنج

انہوں نے دن رات ایک کر کے یہ مقام حاصل کیا جو ہم معاشرے میں سر اٹھا کر کھڑے ہونے کے قابل ہوئے، پھر آپ ہماری زندگیوں میں شامل ہوئیں اور ہمارے گھر کو اپنی محبت اور خلوص سے صحیح معنوں میں جنت بنا سکیں، آپ نے کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ آپ ہم سے الگ ہیں، حتیٰ کہ مجھ آپ اور بھیا سے زیادہ اپنا کوئی محسوس ہی نہیں ہوتا۔“

”ارے واہ محسوس کیوں نہیں ہوتا؟ سلطان تم سے محبت نہیں کرتے کیا، بھئی ہمارے بہنوئی صاحب نے تو ڈنکے کی چوٹ پر تم سے محبت کی ہے اور اہم بات تو یہ ہے کہ بھائی بھی خوب ہے، اپنے ہر وعدے ہر دعوے پر کھڑے اترے ہیں سلطان الدین، سچ کہوں تو تم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خوش دیکھ کر تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔“ شہیلہ ہنستے ہوئے سلطان الدین کی تعریف میں رطب اللسان تھیں، ان کی بات پر سیما کا چہرہ چیکا بڑ گیا، دھیمے لہجے میں کہنے لگیں۔

”کہاں بھائی، اب تو وقت بہت بدل چکا ہے، جس محبت کا رنگ بہت گہرا تھا، وہ اب ماند پڑنے لگا ہے، سلطان میں اب پہلے والی بات نہیں رہی۔“ سیما کی بات پر شہیلہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم سیما، پہلے والی بات نہیں رہی؟ محبت کا رنگ چیکا بڑ گیا ہے؟ کیا مطلب ہے ان باتوں کا؟ تم خوش نہیں ہو کیا؟ یا سلطان تمہارا اب خیال نہیں رکھتے۔“ شہیلہ کئی دوسروں میں گھریں سوال در سوال کرتی چلی گئیں۔

”خیال رکھنے نہ رکھنے کی بات نہیں ہے بھابھی، مسئلہ کچھ اور ہے۔“ سیما نے پڑمردگی سے جواب دیا۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے تم کچھ چھپا رہی ہو، اتنی بھئی بھئی سی رہنے لگی ہو اور سلطان بھائی سے بھی اس بار زیادہ بات نہیں ہو رہی، سچ بتاؤ سیما کیا بات ہے آخر؟“ شہیلہ بہت دنوں سے سیما میں در آنے والی تبدیلی نوٹ کر رہی تھیں، آج موقع ملا تھا تو سیما کو کھیر کر بیٹھ گئیں۔

”بھابھی آپ بھی ناں، نہ جانے کیوں میرے معاملے میں اتنی حساس ہیں، ذرا ذرا سی بات پر اتنی فکر مند ہو جاتی ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے میں نند نہیں بیٹی ہوں آپ کی۔“ سیما، شہیلہ کے یوں پریشان ہو جانے پر ہنستے ہوئے کہتی چلی گئیں۔

”تم بھلے نند ہو سیما مگر مجھے بہت عزیز ہو، تم نے ہر مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے، تم جانتی بھی ہو کہ میرا میکہ تو ہے ہی نہیں اور واحد سسرالی رشتہ بھی بس تم ہو اور تم نے بھی مجھے بہن کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، میرے اور رحمان کے درمیان میں اختلاف پیدا ہوا تو تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا، میں تو بہت خوش نصیب ہوں جو تم جیسی پیاری نند مجھے ملی۔“ شہیلہ سیما کا ہاتھ تھام کر اپنے احساسات خوشگواریت سے بیان کرتی چلی گئیں، سیما ان کے خیالات جان کر مسکراتے ہوئے ہولے سے بولیں۔

”بھابھی یہ تو آپ کی محبت اور اعلیٰ ظرفی ہے، میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی بڑی بہن کے روپ میں دیکھا ہے، میں اور رحمان بھائی تو رشتوں کو تر سے ہوئے لوگ ہیں، ہم نے کم عمری میں ہی اپنے والدین کو کھو دیا، رشتے دار مالی پریشانی دیکھ کر ویسے ہی کترانے لگے، یہ تو بھائی کی ہمت تھی، جو کم عمری میں بھی اس خود غرض دنیا سے مقابلے کے لئے کھڑے ہوئے، م

”کیا مسئلہ ہے؟ تم نے ہمیں اب تک بتایا کیوں نہیں؟“ شہیلہ نے فکر مندی سے سوال کیا۔

”کچھ عرصے قبل سلطان کا رابطہ اپنے بڑے بھائی آفاق سے ہوا تھا، تب سے نہ جانے کیا بات ہے سلطان بے حد مضطرب رہنے لگے ہیں اور اب کچھ ماہ سے انہوں نے حویلی واپس لوٹنے کی ضد باندھ لی ہے۔“ سیما آہستہ آہستہ انہیں تفصیل بتانے لگیں۔

”حویلی واپس لوٹنے کی ضد، سلطان کی کیا اپنی والدہ سے بات ہوئی ہے؟ کیونکہ حویلی پر تو ان کی ماں کا ہی رعب ہے، ان کے حکم کے بنا تو ایک پتا بھی نہیں ہلتا“ شہیلہ تعجب سے دریافت کرنے لگیں۔

”نہیں بھابھی سلطان کی اماں ہی تو راضی نہیں ہیں اب بات پر کہ سلطان واپس حویلی میں لوٹیں، اگر وہ راضی ہوتیں تو سلطان کب کا لوٹ جاتے فیض پور۔“ سیما کی بات نے شہیلہ کے چہرے پر بھی نظر کر لکیریں کھینچ ڈالیں۔

”اوہ یہ تو کوئی خوشگوار بات نہیں، حویلی لوٹنے کا فیصلہ میں نہیں جانتی کہ سلطان کے لئے کیسا ثابت ہو، ہاں مگر میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ سیما تمہارے حق میں یہ فیصلہ کسی صورت بھی اچھا ثابت نہیں ہو سکتا۔“ شہیلہ نے پرہیزی تجزیہ کیا۔

”میں جانتی ہوں یہ بات بہت اچھی طرح سے بھابھی، تب ہی تو پریشان ہوں۔“ ان کی بات پر سیما بے بسی سے بولیں۔

”پریشان ہوں؟ ارے تم تو اس طرح سے کہہ رہی ہو کہ جیسے تمہارے بس میں کچھ بھی نہیں، تمہیں پریشان ہونے کے بجائے سلطان الدین سے بات کرنی چاہیے، انہیں سمجھانا چاہیے کہ ان کا حویلی لوٹنے کا فیصلہ تمہارے حق میں برا ثابت

ہو سکتا ہے، چلو اگر تمہاری ساس تمہیں بہو قبول کر لیتیں اور خوش خوشی تم لوگوں کا استقبال کرنے کو تیار ہوتیں تو یہ بات کچھ بھی آتی، سلطان الدین ان کی مرضی کے خلاف ایک بار پھر فیصلہ کریں گے تو نتائج اچھے نہیں ہوں گے، تمہیں یہ بات سمجھنا چاہیے سلطان کو۔“ شہیلہ انہیں سمجھاتے ہوئے مشورہ دینے لگیں۔

”بھابھی آپ کو کیا لگتا ہے میں نے سمجھایا نہیں ہوگا سلطان کو؟ وہ تو بالکل ضد پراڑ گئے ہیں، کوئی بھی بات سمجھنے کے لئے راضی ہی نہیں ہیں اور آپ تو جانتی ہیں کہ جب سلطان ضد پر آتے ہیں تو اپنی نکر کے رہتے ہیں۔“ سیما بے بس لہجے میں کہنے لگیں۔

”ہونہہ..... سمجھ رہی ہوں سیما، آج رحمان کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ رہی ہے۔“ شہیلہ پر سوچ لہجے میں گویا ہوئیں۔

”کون سی بات بھابھی؟“ سیما نے ٹھٹھک کر استفسار کیا۔

”جب سلطان نے حویلی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا تب تم بھی اس سے شادی کے لئے ضد ہو گئیں تھیں، رحمان تب بہت پریشان تھے، وہ یہی کہہ رہے تھے کہ مرد بہت طویل عرصے تک اپنے اصل، اپنے خون سے دور نہیں رہ سکتا، آج سلطان، سیما کی خاطر اپنے گھر والوں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو گیا ہے، سیما اس کی دسٹرس میں چلی گئی تو پھر اسے حویلی کی فکر ستانے لگے گی، تب کیا وہ سیما کے متعلق سوچے گا؟“ شہیلہ نے رحمان اختر کی بات یاد کرتے ہوئے کہا، سیما خاموش نگاہوں سے انہیں دیکھتی چلی گئی۔

”تب بھی تمہارے بھائی کو یہی فکر ستا رہی تھی کہ سلطان الدین کبھی بھی اپنے کپے سے پھرنے والا نہیں، تمہاری محبت کی تڑپ میں اس

سلطان کو مجھے چھوڑنا ہوگا، اسی صورت وہ سلطان کو حویلی آنے کی اجازت دے سکتی ہیں۔“ سیما نے رندھے ہوئے لہجے میں اصل حقیقت بتائی۔

”یا اللہ رحم، یہ خاتون تو اب تک انتقام کی آگ میں جھلس رہی ہیں اور سلطان یہ شرط جان کر بھی حویلی لوٹنا چاہتے ہیں؟“ شہیلہ کے لہجے سے بے یقینی واضح طور پر جھلک رہی تھی۔

”سلطان یہ شرط کسی صورت بھی ماننے کو تیار نہیں، مگر وہ ہر صورت میں حویلی لوٹنے کے لئے بضد ہیں، بھابھی یہ ماں بیٹی کی جنگ میرا دل دہلا رہی ہے، سلطان اس بار پاکستان موو ہونے کی نیت سے آرہے ہیں، ان کا یہاں سے واپس لوٹنے کا اب کوئی ارادہ نہیں۔“ سیما نے تمام تفصیل شہیلہ کے سامنے گوش و گزار کر ڈالی، حقائق جان کر شہیلہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔

”یہ بتاؤ سیما، کیا عالیاں اس ساری صورتحال سے واقف ہے؟“ کچھ دیر کے توقف کے بعد شہیلہ نے سوال پوچھا۔

”نہیں بھابھی اسے کچھ بھی معلوم نہیں، سلطان فی الحال اسے کچھ بھی نہیں بتانا چاہتے، اگر عالیاں حقائق جان لے گا تو فیض پور جانے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوگا، اسی لئے سلطان اس کے علم میں یہ باتیں لانے کے لئے صحیح وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔“ سیما نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ہولے سے جواب دیا۔

”ہونہ، بہر حال تم پریشان نہ ہو سیما، میں رحمان سے اس مسئلے پر بات کروں گی، تم حوصلہ رکھو اور خود کو کمزور مت سمجھو، ہم تمہارے ساتھ ہیں، میں رحمان سے کہوں گی کہ وہ سلطان سے بات کریں اور سمجھائیں۔“ شہیلہ نے سیما کو سمجھاتے ہوئے ہمت بندھائی، شہیلہ کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے سیما کو خود بھی

نے اپنے خونی رشتوں سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا اور کوئی بھی اسے اس کے فیصلے سے ہٹا نہیں سکا، کل یہی فیصلہ جب اپنے گھر والوں کے لئے وہ فیصلہ کرے گا، تو سیما کیسے روکے گی اور آج ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارے بھائی کا خدشہ سچ ثابت ہو گیا ہے۔“ شہیلہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

”بھابھی خون کی کشش کبھی مدہم نہیں ہوتی، سلطان مجھ سے شادی تو کر چکے، بے انتہا محبت کی مجھ سے حد سے زیادہ خیال رکھا، مگر اس کے باوجود کہیں نہ کہیں ان کے دل میں اپنے خاندان کو چھوڑنے کا پچھتاوا موجود تھا، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری پسند ہونے لگ گئے، زبان سے کچھ نہ کہتے مگر میں ان کے دل کا حال جان چکی تھی، بھابھی مجھے پریشانی حویلی واپس لوٹنے سے نہیں ہے، مجھے ان کی اماں کا خوف کھائے جا رہا ہے، وہ بہت سخت گیر عورت ہیں، معاف کرنا ان کی سرشت میں نہیں، آپ نہیں جانتیں کہ سلطان ان سے کتنی بار معافی مانگ چکے ہیں، مگر وہ عورت اتنی سخت دل کی مالک ہیں کہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹ رہیں۔“ سیما کہتے کہتے آبدیدہ سی ہو گئیں۔

”ارے سیما، تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا کہا ہے ایسا سلطان الدین کی ماں نے جو تمہاری آنکھوں میں یوں آنسو آگئے ہیں۔“ شہیلہ پریشانی کے عالم میں سیما کا ہاتھ نرمی سے تھام کر سہلاتے ہوئے بولیں۔

”بھابھی انہوں نے ایک شرط رکھی ہے سلطان کے حویلی لوٹنے کی۔“ سیما نم لہجے میں بولیں۔

”کیسی شرط سیما؟“ شہیلہ ہزار خدشوں میں مبتلا ہوئیں۔

”وہ کہتی ہیں کہ حویلی واپس لوٹنے کے لئے

اطمینان کا احساس ہوا تھا، بھابھی کے حوصلہ دینے پر وہ اثبات میں سر ہلا کر دھیرے سے مسکرائی۔

☆☆☆

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کر دیکھتے ہیں سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں اس نے اپنے جدید انداز میں تراشے سنہری بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور دکان میں بیٹھے سیکلز مین کا دل بری طرح سے دھڑک اٹھا، اس نے اپنے کنبیلے کا جل کر سیاہی سے بھرے بھورے نین سیکلز مین کے حواس باختہ چہرے پر گاڑھ دیئے اور شدید مایوسی کے عالم میں کہا۔
”مجھے لپ اسٹک کا جو شیڈ چاہیے تھا وہ آپ کے پاس تو ہے ہی نہیں۔“

”جی کون سا شیڈ چاہیے تھا، آپ بتائیں تو سہی، یہ بندہ ابھی حاضر کر ڈالے گا۔“ سیکلز مین بے قراری سے بولا۔

”بلڈ ریڈ، یہ شیڈ چاہیے تھا، مگر اتنے سارے شیڈ یہاں ٹرائی کر لئے مگر میرا من پسند شیڈ اب تک نہیں ملا۔“ اس نے سامنے رکھے شیشے کو اٹھا کر اپنے رخ روشن کا سراہتی نگاہوں سے دیدار کیا، لبوں پر لپ اسٹک کا مرجنڈا شیڈ اس کی گوری رنگت پر خوب بیچ رہا تھا۔

”لگتا ہے اب کسی اور کا سٹیکس شاپ پر ڈھونڈنا پڑے گا۔“ اس نے کن اکھیوں سے بوکھلائے ہوئے سیکلز مین کو دیکھا اور جتاتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں میم، بلڈ ریڈ شیڈ بھی ہے میرے پاس، امپرنڈ برانڈ ہے، بس آپ جیسے خاص کسٹمر کے لئے ہے، کہاں گیا، یہ رہا۔“ سیکلز مین سرعت سے اپنے شوکیس میں تلاش کرتے ہوئے بولتا چلا

جا رہا تھا، اس نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا اور سیکلز میں سے نظر بچا کر کئی کا سٹیکس اسٹیم بیگ میں ڈالنے لگی، صرف چند ٹاپے میں وہ کا سٹیکس کے سامان سے اپنا بیگ بھر چکی تھی۔

”یہ دیکھیں میم، آپ کا پسندیدہ لپ اسٹک شیڈ۔“ سیکلز مین نے لپ اسٹک یوں اس کے سامنے پیش کی جیسے کوئی خزانہ ڈھونڈ نکالا ہو۔

”ہائے اللہ، یہ تو واقعی وہی شیڈ ہے جو مجھے چاہیے تھا، ہائے آپ نے ڈھونڈ نکالا آخر، میں نے پوری مارکیٹ چھان لی تھی مگر کہیں نہیں ملا۔“ اس نے خوشی کا والہانہ اظہار کرتے ہوئے کہا اور جھٹ سے لپ اسٹک سیکلز مین کے ہاتھ سے جھپٹ کر شیشے سامنے کر کے ہونٹوں پر لگانے لگی، سیکلز مین وارنٹی کے عالم میں اسے دیکھے چلا گیا۔

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب چلتے ہیں سو ہم بہار پر الزام دھر کر دیکھتے ہیں سنا ہے آئینہ تمثال ہے جہیں اس کی جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کر دیکھتے ہیں ”کیسی لگ رہی ہے مجھ پر لپ اسٹک، ہاں بتاؤ ذرا؟“ اس نے اپنے دونوں ہونٹوں کو آپس میں ملا کر لپ اسٹک ہموار کرتے ہوئے سیکلز مین سے پوچھا۔

”بڑی حسین لگ رہی ہے جی، کہیں نظر نہ لگ جائے۔“ سیکلز مین ثناء کرتے ہوئے بولا۔

”بھلا نظر کس کی لگے گی مجھے؟“ اس نے ترجہی نظروں سے سیکلز مین کو دیکھ کر اک ادا سے ٹوکا۔

”میری ہی نہ لگ جائے کہیں۔“ سیکلز مین نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔

”ہٹ بدمعاش۔“ اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

اب ہمیشہ یاد رہے گا۔“ اس نے ایک ادا سے معنی خیز جواب دیا، سیکڑ مین کی لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھل اٹھی، وہ جانے لگی تو وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

”آپ کا نام کیا ہے، یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں؟“

”مونتا..... مونتا نام ہے میرا۔“ مونتا نے پلٹ کر مسکرا کر جواب دیا۔

☆☆☆

وہ پوری ہمت مجتمع کر کے بڑی مشکل سے اٹھ پائی، شکاری کتوں کی آواز نزدیک تر ہوتی چلی جا رہی تھی، اس نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی، مگر کانٹے کی چھین نے اس کی مجتمع ہمت کو ایک بار پھر توڑ ڈالا۔

”آہ۔“ وہ کراہ اٹھی، مگر تکلیف بھلا کر پھر سے بھاگنے لگی، اس کا دوپٹہ کانٹوں میں الجھ کر پھٹا چلا گیا، مگر وہ ہر شے سے بے نیاز سر پیٹ دوڑتی چلی گئی، دفعتاً اسے اندھیرے میں روشنی کے دو گولے نظر آئے، اس نے لحظہ بھر کو روک کر دیکھا، وہ دو کھیتوں کے درمیان سے گزرتی ایک ذیلی سڑک تھی، جہاں سے وہ گاڑی گزر رہی تھی۔ ”یہ گاڑی، اس سے پہلے کہ یہ گاڑی یہاں سے گزر جائے مجھے اس گاڑی تک کسی بھی طرح سے پہنچنا ہوگا۔“ شمع نے خود کلامی کرتے ہوئے مڑ کر دیکھا، کتوں کے بھونکنے کے ساتھ ساتھ اب کچھ لوگوں کے بھاگتے قدموں کی آواز بھی اب اس کے تعاقب میں تھی، اس نے ایک گہرا سانس اپنے اندر اتار اور سڑک کی سمت بھاگنے لگی۔

”او پکڑو پکڑو اسے، وہ بھاگ رہی ہے۔“ شمع کو اپنے پیچھے شور سانسائی دیا، اس نے بھاگتے ہوئے بے اختیار پلٹ کر دیکھا، وہ شاہ ویز کے سانسی تھے جو اسے فرار ہوتا دیکھ کر اس کے پکڑنے

”سچ میں میم آپ بہت حسین لگ رہی ہیں۔“ سیکڑ مین نے بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ، قیمت بتاؤ اس لپ اسٹک کی۔“ اس نے اپنا بیک کھولتے

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اور دوی آخری کتاب
- ☆ غبار گندم
- ☆ دنیا گول ہے
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں
- ☆ چلتے ہو تو چین کو چلیئے
- ☆ گمری گمری پھر اسافر
- ☆ خطا انشاء کی
- ☆ اس بستی کے اک کوپے میں
- ☆ چاند نگر
- ☆ دل وحش
- ☆ آپ سے کیا پڑا

ڈاکٹر مولوی عبد الحق

- ☆ قوائد اردو
- ☆ انتخاب کلام میر

ڈاکٹر سید عبداللہ

- ☆ طیف نثر
- ☆ طیف غزل
- ☆ طیف اقبال

لاہور اکیڈمی

چوک اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797

ہوئے پوچھا۔

”میم بس دو ہزار کی ہے۔“ سیلز مین نے اس مہ جبین کو میٹھی میٹھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”اچھا بس دو ہزار کی، رکو ذرا ایک منٹ، یا میرے اللہ میرا والٹ۔“ وہ بیگ میں رقم تلاش کرتے کرتے اچانک چیخ پڑی۔

”کیا ہوا میم؟“ سیلز مین گھبرا گیا۔

”میرا واٹ کہیں گر گیا۔“ اس نے مظلومیت کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے سیلز مین کو دیکھا۔

”میں اب یہ لپ اسٹک نہیں لے سکتی، آپ واپس رکھ لیں۔“ اس نے مایوسی سے سیلز مین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے ایسے کیسے، آپ لے جائیں لپ اسٹک میم، بے منٹ پھر آ کر گر جائیے گا۔“ سیلز مین نے اس کی مشکل ہوا میں اڑاتے ہوئے کہا۔

”ہائے تم تو واقعی بڑے اچھے ہو، ایک کام کرو اپنا موبائل نمبر دے دو، میں شام تک تمہیں یہ رقم ایزی پیسہ سے شیئر کر دوں گی۔“ وہ جھٹ راضی ہوتے ہوئے بولی، سیلز مین کی تو من کی مراد بر آئی، وہ بھی جلدی جلدی اپنا نمبر نوٹ کروانے لگا۔

”وقار نام ہے میرا، نام سے نمبر سیو کر لیں۔“ لپ اسٹک کا پیکٹ وہ اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

”سیو کرنے کی کیا ضرورت ہے، یہ نام تو کے لئے بھاگ رہے تھے۔“

”شاہ ویز بس آنے ہی والا ہوگا اور اس کے آنے سے قبل یہ بھاگ گئی تو وہ ہمیں سلامت نہیں چھوڑے گا۔“ کاشف کی گھبرائی ہوئی آواز شمع کی ساعتوں سے ٹکرائی، اس کے قدموں کی

رفتار مزید تیز ہوئی، اس کی سانسیں دھونکی کی مانند تیز چل رہی تھیں، اس وقت اسے اگر کسی بات کی پرواہ تھی تو وہ اس کی عزت تھی اور اپنی حرمت کو بچانے کے لئے وہ اپنی جان سے بھی گزر سکتی تھی، بھاگتے بھاگتے وہ سڑک تک جا پہنچی تھی، وہ گاڑی اس سے ذرا سے ہی فاصلے پر تھی، شمع سڑک کے عین وسط پر جا کھڑی ہوئی، ہاتھ ہلا کر وہ گاڑی کو رکنے کا اشارہ کرنے لگی، شاہ ویز کے ساتھی اسے سڑک پر پہنچتا دیکھ کر وہیں رک گئے۔

”ابے یار یہ تو نفل گئی ہاتھ سے۔“ کاشف نے ہاتھ ملتے ہوئے افسوس سے کہا۔

شمع تیز تیز سانسیں لئے اپنے ہاتھوں کو فضا میں بلند کر کے ہلا رہی تھی، گاڑی قریب آنے پر وہ بلند آواز میں صدا لگانے لگی۔

”مدد کرو میری، خدا را میری مدد کرو۔“ گاڑی کی ہیڈ لائٹس اب ساکے بے حال وجود کا محاط کر رہی تھیں۔

”مدد کرو میری خدا را مجھے بچاؤ ان شیطانوں سے۔“ شمع نے روتے ہوئے صدا لگائی۔

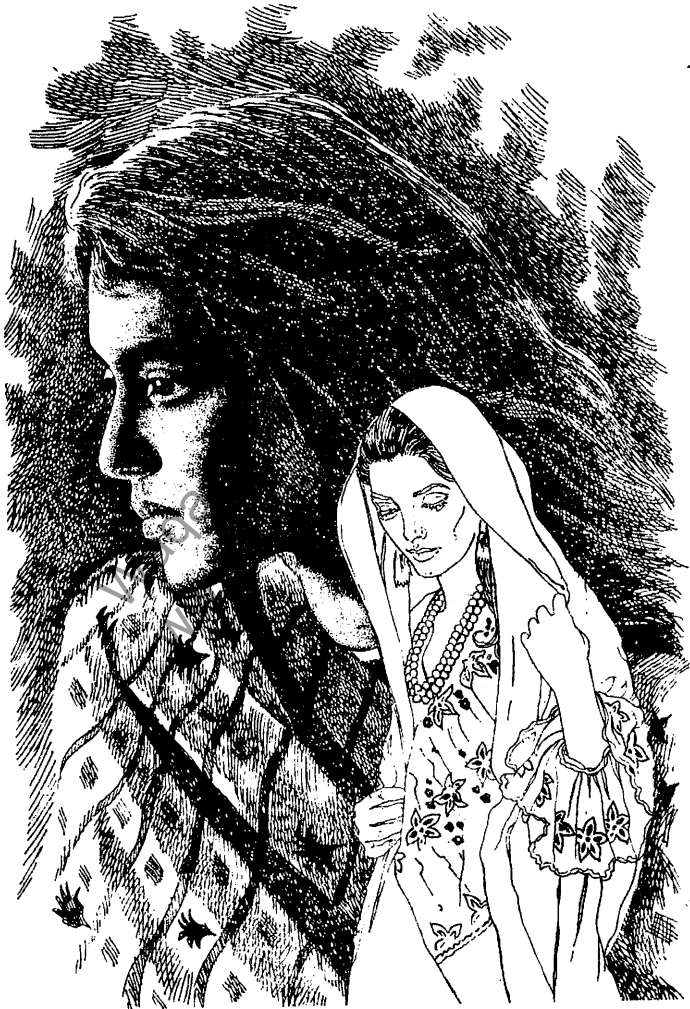
گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی، مگر اس کی ہیڈ لائٹس آن تھیں، شمع گاڑی کو رکتا دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے آگے بڑھی، مگر ٹھوکر کھا کر گر پڑی، گاڑی کا فرنٹ ڈور ایک جھٹکے سے کھلا تھا، شمع نے ہانپتے ہوئے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

وہ دروازہ کھول کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا، شمع کا پورا وجود گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نہایا ہوا تھا، مگر آنے والا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، شمع نے آنکھیں کھلیں مگر اسے دیکھنے کو کوشش کی، وہ دھیرے سے اس پر جھکا، اگلے ہی پل شمع کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

(باقی اگلے ماہ)

الحکیم صلیہ کاسر

عائشہ سکندر



ہم بشر مجوف ہیں، تعجب؟
اسرائیلی متقاضی البتہ مرطوب
بے شمع، بے ضمیر، بے ایمان اور
مفاد پرست معاویہ قلب!
جو پار ہو گئے براہ راست آنکھوں
میں چھ کر، وہ رہ لئے مگر کیسے؟
ہاں گھٹ گھٹ کر، اس کے سردل
بنا پٹ خلا ہے، عکس کا، ایک فرد جو ہے
آشنائے خروٹوں!

واعظ کا وعظ اور فرد ذہن، رعشہ سمجھ
بھینٹ چڑھی ہے بی، شمع پر خاش و ارتعاش
پائے رفتن نامائے ماندن!

گل کائنات کے سربراہ کی باب بن صوت
برداشت بنا پرداخت، پاداش آٹم پاداش
حکمت از حکمت، جیس نہیں بلا آخر
ایک سعی، قافلہ مسلمان کے لئے واضح
من حیث پردہ فاش، حمیت دفاع
ایک عمل کا عملاً، ایک صلہ کا ثمرًا
کچا سزا و جزا؟
محض عملاً ثمرًا!

مغربی طرر کے پر تش لاؤنج کا اندرونی
منظر:-

اندر جاکو تو مشرقی دیوار پر میسونائٹ
اکریلیک آرٹ سے سجے ہوئے نمونوں کے
درمیان لاوارث چالیں رانچ سے تجاوز ایل ای
ڈی نصب تھا، ٹھیک اسی کے سامنے ٹکنوی مرکزی
عرشے میں فراری رنگ صوفہ سیٹ پڑا تھا جس
کے کونوں میں کینڈی اپیل پلنگ پوش پڑے تھے،
مخروطی چھت سے لگتا بارہ سیگا سینک کی مانند
ٹھنڈوں کا فانوس اپنے پروں پر بلبوں کی مالا
سجائے مکمل روشن تھا، اس کا عکس نیچے بالشت بھر
ٹکنوی میز میں کسی طلسم کی طرح تھا، پہلو میں رکھی

تپائی پر پڑی کمرشل گرین ایش ٹرے سگار کی راکھ
سے مکمل بھری ہوئی تھی، آس پاس جس کے جلے
ہوئے سگاروں کے ٹکڑے جا بجا پڑے تھے،
آڑے، ترچھے، دائیں بائیں۔

اس وقت لاؤنج میں آسپی خاموشی کا راج
تھا ماسوائے تین موتی ارتعاش کے اول ایل ای
ڈی پر چلتے خبرناموں کی آواز، دوئم ٹکنوی میز کے
ستون سے اپنا، ”فرز“ رگڑتی سٹیل کی میاؤں
میاؤں اور سوئم باہر مستطیل گیٹ پر بندے
راہٹ کی غوغا، ایک چوٹی آواز اور بھی تھی،
مرکزی صوفے پر براجمان اس ہیولے کی
سانسوں کی مدھم آواز، جو کہیں اندر ڈوب کر ابھر
رہی تھی۔

خدا و خال کچھ یوں تھے۔

جھری زدہ، مرجھایا، زرد سفید نیز نور سے
عاری بیزار چہرہ، پیشانی پر اوپر تلے چند شکن،
پتکے گال، سیاہ پٹڑے ہونٹ جو اس وقت سگار کی
پھونک سے مزید بگڑے ہوئے لگ رہے تھے،
شیطان، طیش، دلولہ، گھمنڈ اور معیار کی سر پرستی
کرتی آنکھیں، رو پہلے بال، کلین شیو، اس وقت
وہ سیاہ پتلون اور سرمئی شرٹ کے اوپر خاکستری
اودر کوٹ پہنے بے حد سرد مہری اور استہزایت سے
سامنے ایل ای ڈی پر چلتی خبرنامے کی سرخ پٹیاں
پڑھ رہا تھا، دائیں ہاتھ میں سگار، سرخ و متورم
آنکھیں۔

نیم خوابی کی خمار!

”جی ہسپتال کے ڈاکٹر انسانی جانوں سے
کھیلنے لگے، گزشتہ روز گردن توڑ بخار کا علاج
کروانے کے لئے آنے والی بدین کی ننھی سلیمہ
ڈاکٹر کی غفلت کی بھینٹ چڑھ گئی، ذرا کچ کے
مطابق ڈھائی سالہ سلیمہ گردن توڑ بخار کے
عارضے میں مبتلا تھی جس کے باعث اسے اسلام

سے ٹیک لگا کر خود کو مکمل پرسکون کیا اور بڑے تجل سے کہا۔

”سیلہ کی خبر تو پڑھی ہی ہوگی، سوچا ذرا ٹاک شو ہو جائے۔“ اس نے جواباً دایاں پاؤں اتار کر بائیں ٹانگ اس پر چڑھائی گویا پہلے وہ مصنوعی لگ رہا تھا اور اب کچھ زیادہ ہی مصنوعی آرٹیفشل۔

”خدا ہدایت دے ایسے خونخوار ڈاکٹروں کو، بیچاری سن کر افسوس ہوا، چیخ چیخ، اللہ جنت عطا کرے، تم بتاؤ ایس پی سنا ہے کوئی پرچہ درچہ بھی کٹوایا ہے لواحقین نے؟“ اس نے دبے الفاظ میں اپنی تسلی کروانی چاہی۔

”جی اور انہی لواحقین نے کسی سلیم وٹھرانامی شخص پر پرچہ کٹوایا ہے۔“ بذات خود تو ایس پی نے چونکا نے والی خبر دی تھی، مگر دوسری طرف سانسوائے ایک زوردار تھقبے کے کوئی جواب ناطا، اس کے اس طرح ہسنے پر بلا جواز ہی ایس پی کلس کر رہ گیا۔

”چھوٹے لوگ ہیں بیچارے، جانتے نہیں ہونگے تا سلیم وٹھرا بے کون۔“ اس نے ناک سے مکھی اڑائی پھر قدرے توقف سے چلتے چلتے کہنے لگا۔

”ایسے لوگوں کو محض پیسہ اور لوگوں کی سستی ہمدردی چاہیے ہوتی ہے لہذا ایس پی صاحب دل پہ نالیں، لوگوں اور ان میڈیا، پولیس والوں کا یہ بچپنا چلتا رہتا ہے، سلیم وٹھرا کا ناکوئی کچھ برا کر سکا ہے اور نا کچھ برا کر سکے گا، آئی دل بھی آلویز فائن۔“ تکبرانہ انداز میں کہتا وہ ایل ای ڈی کے مقابل رکھے بیٹر اسٹینڈ تک آیا، واٹن گلاس میں نکال کر سیپ لیا۔

”پولیس جب پانچواں مذہب (ٹارچر سیل) دکھاتی ہے نا تو وٹھرا صاحب، بال ہی تو

آباد لایا گیا جہاں وہ غلط انجکشن لگنے سے دم توڑ گئی، وحشی ڈاکٹر فرار، مقدمہ درج کر لیا گیا، اطلاعات کے مطابق سیلہ کو آپریٹ کرنے والا ڈاکٹر.....“ اس نے جھنجھلا کر ایل ای ڈی بند کر دیا، رنگین اسکرین پر سرسری رنگ ایک فلیش سے چھا گیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا ذرا آگے ہوا، سرگارا کا جلا حصہ ایش ٹرے میں جھلکا، پھر اس کا جلا حصہ مسل کر اسے بجھا دیا، ایک نظر اٹھا کر سامنے کوارٹر کی چکور گھڑی کو دیکھا جس کی سوئیاں ہندوسوں کی بجائے سفید جھیلے پیروں سے لگ کر رات کے ساڑھے تین بج رہی تھیں۔

بے رحمی سے کن پٹی مسلی، ابھی گفتوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ دفعتاً اس کا موبائل بجا، میز پر جھک کر فون اٹھایا، کال کرنے والے کا نام پڑھ کر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی، آرام سے کال انیڈ کی اور صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گیا۔

”جی کہیے بختاور صاحب، رات کے اس پہر کیسے یاد کیا؟“ استہزائیہ انداز میں پوچھتا وہ ٹانگ جھلانے لگا، چہرے پر ہنوز کمینی مسکراہٹ تھی، کال کی وجہ وہ خوب جانتا تھا۔

دوسری طرف ایس پی بختیاور خان نے سامنے دھری فائل کا سرسری سا جائزہ لیا پھر سامنے ہولڈر سے پین نکال کر سائن کرتے ہوئے بے حد سردمہری سے کہنے لگا۔

”مجرم اور پولیس ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں سلیم وٹھرا صاحب، جہاں جہاں مجرم، وہاں وہاں پولیس پھر چاہے سہ پہر کے چار بج رہے ہوں یا رات کے، وردی والوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے فائل سامنے مودب کھڑے سپاہی کو پکڑائی پھر کرسی کی پشت

بھگا نہیں ہوتا، باقی مجرم میں کچھ خاص بچتا نہیں، خیر آپ سے گلہ نہیں، آپ نے ابھی تک پانچواں مذہب دیکھا ہی کہاں ہے۔“ ایس پی نے مسخرانہ شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

”سنو ایس پی!“ وائن گلاس ہاتھ میں پکڑے وہ قدم قدم چلتا صوفے تک آیا، سنجیدگی سے آگے ہو کر بیٹھ گیا۔

”میں ہوں پاکستان فارمیسی کے دیو پلمنٹ اور مارکیننگ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ، کون ہوں میں؟ ہیڈ اور ہیڈ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ لہجے میں غرور آیا، میز کے نیچے سے سٹیلا کو اٹھا کر گود میں بٹھایا اور اس کے فریج پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے تحمل سے کہنے لگا۔

”اور جہاں ہیڈ ہوتا ہے نا، وہاں باڈی کی نہیں چلتی۔“

”سلیم وقرا صاحب۔“ ایس پی نے موبائل پکڑے بائیں ہاتھ کی کلائی میں پہنی گھڑی گھمائی۔

”ہیڈ تو چاہیے باقی دھڑ کا ہم نے کرنا بھی کیا ہے اور جب وہ ہیڈ نہیں رہے گا نا، تو یہ یعنی میں اپنے دیپارٹمنٹ کا ہیڈ بن جاؤں گا اور جانتے ہیں ہیڈ کیا ہوتا ہے؟ ہیڈ ہوتا ہے ویری ایرنشل اور ویری ایپورنٹ اور ہیڈ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ ایس پی نے جبا کر اس کے الفاظ اس کو سود سمیت لوٹائے۔

”ایس پی جوان ہو، گرم خون ہے، خود کو ٹھنڈا رکھو، پولیس مجھے ہاتھ بھی نہیں.....“

”کس نے کہا ہے پولیس ہاتھ لگاتی ہے وقرا صاحب، الحمد للہ حکومت نے بید کی نئی چھڑیاں لاؤنج کر دی ہیں۔“ ایس پی زیر لب ہنسا۔

دوسری طرف اس نے شدت ضبط سے

دانت چبا ڈالے، اس کے غصے کو سٹیلا کی نرم و گرم فرنی بھی اپنے اوپر محسوس کیا۔

”مجھے ہلکا مت لو۔“ انگلی اٹھا کر شعلہ بار آنکھوں سے جیسے تینبی کی۔

”ابھی تک پیار سے سمجھاتا آیا ہوں، آئندہ پیار سے نہیں وار سے سمجھاؤں گا۔“

”سمجھنے، سمجھانے کا وقت نکل چکا وقرا صاحب۔“ اس نے مکمل طور پر ہلکا لیا۔

”اب ایگرام کا وقت ہے، عدالت ریڈلٹ بتائے گی اور میں ریگرام کس دوں گا۔“

”ایس پی تمہاری دس سالہ بیٹی بڑی خوبصورت ہے۔“ لہجے میں کمینگی در آئی۔

”کیا نام تھا، ہاں عیسا، ناس نیم۔“ الفاظ سے الٹی میٹم دیتا ہوا، وہ چپ ہوا۔

”پسند ہیں مجھے پیارے لوگ۔“

”مجھے خوشی لوگ پسند ہیں۔“ مٹھیاں فرط جذبات سے بھینجیں مگر اس وقت اسے خود کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔

”پہلے اس لئے تم پہ ہاتھ نہیں ڈالا کہ میرے پاس میری فیملی تھی اور ثبوت نہیں تھے مگر اس بار۔“ وہ قدرے رکا، ایک سانس اندر اتاری۔

”اس بار میں پوری تیاری کے ساتھ آنے والا ہوں، پھر تم دیکھو گی ایس پی، بختاوہ ہے کون سمجھے تم۔“ آخری الفاظ شدید جی سے ادا کرتے ہوئے اس نے فون کھٹ سے بند کر دیا، مضطرب حالت میں چلتا ہوا اپنے کمرے سے باہر آیا، باہر بیٹھے پولیس اہلکار چوکنا ہو گئے۔

Morning raid on
withra,s house, arrange
staff 5am in the

”صبح پانچ بجے وقرا ہاؤس پہ چھاپ، شاف

تیار کرو۔“ حکم صادر کر کے وہ بنا رکے پولیس اسٹیشن سے نکل کر ڈرائیوے تک آیا، باہر گہری نیلا ہٹ چھائی ہوئی تھی، یہ اوائل سرما کی رات تھی، ٹھنڈی سرد رات۔

”میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔“

”تمہاری دس سالہ بیٹی بہت خوبصورت

ہے۔“

”گرم خون ہے خود کو ٹھنڈا کرو۔“

”بیچاری، سن کر افسوس ہوا، اللہ جنت

نصیب کرے۔“

”میں ہیڈ ہوں اور ہیڈ.....“

”Damn it“ ایک پتھر کو زوردار ٹھوکر

مارتے ہوئے کہا، پتھر دور اڑتا ہوا جا گرا۔

گردن کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر خود کو

کمپوز کیا، غصے اور نفرت سے اس کی رگیں تن گئیں

کچھ اس طرح کہ کوئی اسے ذرا سا بھی ہاتھ لگا تا تو

ٹن سے بچ جاتا۔

سیاہ شرٹ اور خاکستری پتلون میں ملبوس وہ

الباکار کافی وجہہ اور پرکشش تھا، چھوٹی مگر گہری

اخروئی آنکھیں، تنی آبرو، سیدھی کھڑی ایرانی

مردوں جیسی ستواں ناک، سیاہ بال جن کو جیل

سے پیچھے کیا ہوا تھا، سردی کے باوجود بھی اس کی

شرٹ کے کف مزے ہوئے تھے، بائیں کلائی

میں سیاہ گول گھڑی جسے وہ عادتاً گھماتا تھا چہرے

پر سنجیدگی اور تفکر اور ارادوں میں فرض شناسی اور

وفاداری۔

اب خیالات ہواؤں کے دوش پہ اڑتے

ہوئے، پولیس اسٹیشن کے ڈرائیوے سے نکل کر

باہر آئے، اونچے اڑتے ہوئے، سپاہی سے

گھماتے، سڑکوں پر گرتے، سنہیلے، ایک دوسرے

سے خود کو بچتے بچاتے، دیواروں سے سر پیختے

ایف ایلیون سیلٹر میں ذرا اونچائی پر بنے اس بنگلے

تک آئے، جہاں سفید مستطیل گیٹ کے ساتھ

بنی چوکی کی عقیقہ دیوار سے لگی کھوٹی سے رابرٹ

بندھا تھا، سیاہ اور خاک کی بڑے بالوں والا رابرٹ،

اس سے خود کو بچاتے، چھپتے چھپاتے اس پر نقش

لاؤنج میں داخل ہوئے جہاں ایس پی کے کال

کاٹنے پر سلیم دھرانے موبائل کان سے ہٹایا۔

کچھ دیر کے لئے موبائل کی بھی سرنی

اسکرین کو اچنبھے سے دیکھا، تشویش کی ایک لہر

اس کے خون میں سرایت کر گئی، حیرت اور تفکر

نے اس کے ماتھے کا احاطہ کرتے ہوئے بھنوں کو

حکم دیا کہ وہ تن جائیں اور خون کی رفتار چہرے

کی اور بڑھا کر اسے سرخ کر ڈالا، دانتوں تک آ

کر انہیں حکم دیا کہ ایک دوسرے سے لگ کر بچنے

لگیں، آنکھوں کو اطلاع موصول ہوئی کہ وہ فرط

جذبات سے کچھ لمحے کے لئے بند ہو جائیں،

ہاتھوں کو آڈر ہوا کہ موبائل کو مٹھیوں میں دیوچ

لیں، ٹانگوں کو فون ہوا کہ پیر کے پنجے تلواروں کی

طرف سختی سے مڑ جائیں، اس طرح

Sympatheth نروس سسٹم نے جسم کو غصے

کے اور ریکشن سے محفوظ کر لیا، چند پل سر کے چند

لمحے لئے۔

کچھ دیر گزری اور اعصاب بحال ہوئے،

آنکھیں کھل گئیں، بھنوں سیدھیں ہوئیں، دانت

رک گئے، چہرہ سفید پڑا، پیروں کے پنجے غیر مرئی

دباؤ سے آزاد ہو گئے، مٹھیاں کھل گئیں

Oasasympathethe نروس سسٹم جسم کو

اپنے ابتدائی حال میں واپس لے آیا۔

اس نے کچھ گہری سانسوں سے پھیپھڑوں

کو پھلایا، پھر ہاتھ میں پکڑے فون سے کٹ کٹ

کسی کا نمبر ملانے لگا، تیسری تیل پہ فون اٹھا لیا

گیا۔

”سنو احمد! سیلہ کے کیس کا کیا چکر ہے؟“

بغیر رسی علیک سلیک کے سیدھا مدے پہ آیا، پھر قدرے جواب کے انتظار میں کچھ دیر رکا۔

”کیا..... کیا کہہ رہے ہو؟“ اسے جیسے اس جواب کی امید نہیں تھی، سٹیلا کو جھٹک کر گود سے اتار، پھر ذرا گھبراتے ہوئے خود کے پیچھے لاؤنج کے بیرونی وال کو دیکھا۔

”نہیں، گھر میں ہوں۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”کیا؟ نہیں ابھی گھر میں ہی ہوں، نہیں نکلا۔“

”لیکن اس نے تو ابھی پانچ منٹ پہلے مجھ سے بات کی ہے۔“ اس نے جیسے ایس پی سے کی گئی بات کے بارے میں بتانا چاہا۔

”مگر.....“ وہ جیسے کچھ سوچنے لگا، اعصاب تیزی سے کام کرنے لگے۔

”احمد بات سنو میری، میں نکل رہا ہوں، جواد کو فون کر کے میری رہائش کا بندوبست کرواؤ۔“ پھر توقف کے لئے رکا۔

”بس پانچ منٹ میں جا رہا ہوں، اچھا سنو، ایس پی کی بیٹی عیسا مجھے کل میرے پنڈی والے گیراج میں چاہیے، تم نے۔“ وہ قدم قدم چلتا راہداری میں آیا۔

”اسے اغواء کرنا ہے آئی بات۔“ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر رکا، چونکا دینے والی خبر اسے احمد کے اگلے جملے میں ملی۔

”کیا..... امریکہ..... کب؟“ وہ غصے سے تڑپ اٹھا۔

”Damn it“۔“ حدت جذبات سے سامنے ٹیبل پر پڑا گلدان اٹھایا اور پوری قوت سے راہداری کے چھت بوس شیشے پہ دے مارا، ٹھاہ کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے شیشے کی کرچیاں ہوا کی لہروں پر فضا میں اڑنے لگیں، اس نے

پوری قوت سے چلانا چاہا، مگر وہ وقت ناراضگی یا غصے کے اظہار کا نہیں تھا۔

شیشے کے ٹوٹنے کی آواز سن کر باہر گیٹ پہ کھڑا چوکیدار فوراً اندر آیا، اپنے مالک کو مضطرب حالت میں دیکھ کر کچھ ٹاپے کے لئے وہ خود بھی بوکھلا گیا، پھر قدرے متذبذب سا پوچھا۔

”سر..... آپ ٹھیک ہیں؟“ موبائل پہ کسی کا نمبر ملاتے سلیم وٹھرانے سر اٹھا کر دیکھا، بے شک چوکیدار نے اس کی گھبرائی ہوئی حالت جانچ لی تھی اور یہ اندازہ لگانے میں اسے چند سیکنڈز لگے کہ اس کے مالک کی ہوائیاں کیوں اڑی ہوئی ہیں۔

”گیٹ دا ہیمل آؤٹ آف ہیئر، جا کر گیٹ پہ کھڑے ہو اور پولیس آئے تو کہنا میں گھر پہ نہیں ہوں۔“ وہ کھڑے کھڑے بے حدی سے چیخا، گارڈ بوقت اپنا اعتماد ہار گیا۔

”پ..... پ..... پولیس سر؟“ الفاظ گارڈ کے حلق میں کچھ ایسے اٹکنے کے وہ بامشکل لفظ ادا کر پایا۔

”ہاں پولیس، اور یہ، یہ ایما (گھر کی میڈ) کیاں ہے؟“ اس نے ارد گرد دیکھتے ہوئے مشتعل سا پوچھا، انداز بوکھلانے اور ہڑبڑانے والا تھا۔

”سر وہ..... وہ اپنے کواٹر میں ہے۔“ گارڈ نے بتایا، چہرہ اس کا بھی سفید پڑ چکا تھا۔

”واٹ؟ جاؤ بلاؤ اسے میرا سامان پیک کرے۔“ وہ درشتی سے کہتا ہوا سیڑھیوں کی جانب بڑھا، گارڈ نے حکم کی تکمیل کی، لیکن باہر نکلتے ہوئے اس کی چال آرام دہ اور مطمئن تھی نسبت سلیم وٹھرانے۔

سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے وہ مسلسل موبائل پہ کسی کا نمبر ملا رہا تھا، ہمیشہ میٹرھیاں

چڑھتے ہوئے وہ ساتھ لگی لوہے کی گرل تھام کر چڑھتا، مگر اس وقت شاید اسے خیال ہی نہ آیا، جبھی پہلی سیڑھی، دوسری، تیسری، چوتھی..... پھر گیارہویں، بارہویں اور چودھویں پھر تھا، دماغ میں کچھ چھٹا، کچھ ٹوکلیا؟

موبائل دیکھنے کی وجہ سے دھیان بھٹکا اور سٹیپ پر پاؤں نا جم سکا، تو زان برفراز رہنے کے باعث پاؤں پھسلا اور وہ اونڈے منہ لڑکھڑاتے، قلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے جا گرا، آخری سٹیپ کے کنارے پوری قوت سے اس کے سر کے پچھلے حصے یعنی کون، شیش برین میں پوسٹ ہو گیا، روپلہ بال سرخی میں نہا گئے، خون ابل ابل کر اس کے سر سے نکل رہا تھا، پانی سے گاڑھا، دھاری کی شکل میں ایک طرف جا رہا تھا۔

وہ ٹھکست خوردہ آواز میں گارڈ کو، ایما کو بلانا چاہتا تھا مگر آواز حلق کے کوے میں انگ گئی، وہ راہداری کے شیشوں کے پار غویں غویں کرتے رابرٹ کو آواز، راہداری سے گزرتی، سردی سے ٹھڑھڑاتی سنلیا کی میاؤں میاؤں، دور کہیں بجتے اپنے فون کی آواز سننا چاہتا تھا مگر کان جیسے قوت سمیعی سے محروم ہو گئے، وہ دیکھنا چاہتا تھا مگر آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی، ہلتی جھلتی، دائیں بائیں جھومتی چیزیں مساوی اور واجب و لاوامیزاں نہیں ہو رہی تھیں، اسی بل روپلہ سنہری دھند سیاہی میں بدل گئی، آنکھوں کی اوپر بھاری پلکیں نیچے پیپوٹے کی ہر چیز پلکوں سے جا ملیں، آنکھیں بند ہو گئیں، سنلیا، رابرٹ، گول سیڑھیاں، جھکتے ٹائلز کا فرش، متلی جھت، فرنچیز، راہداری کی کھڑکیوں کے پار کا منظر، سبزا اور ڈرائیورے، اس کی رولر اس، لان میں نصب فوارہ، مستطیل گیٹ، سب ایک آن میں مٹ

گئے۔

آنکھیں ایک بار موندیں اور سب غائب، سب ختم، سبز، سرخ، سفید، تصویریں ایک دم سیاہ ہو گئیں، آدھا دھڑ سیڑھیوں اور آدھا فرش پہ پڑے اس انسان کے اعصاب اور وہ خود کچھ دیر کے لئے قرب المرگ تجربے (Near death experience) میں چلے گئے۔

دوسرا منظر:-

سردی میں منجمد ہونے کے لئے بختاؤر پولیس اسٹیشن کے اندر آیا، شب خوانی کے باعث نیم خوابیدہ اہلکاروں کے چہرے جاگ گئے، وہ ہراساں لگا ہوں سے اپنے باس کو دیکھنے لگے، جو کن پٹی مسلماً اندر آیا تھا، اس کے چہرے پر ناگواری اور فکر کی ایک لہر بہہ رہی تھی، وہ کچھ سوچتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا، پھر جیسے کسی احساس کے تحت پلٹا، سامنے اہلکار اسی طرح چونکا کھڑے اسے دیکھ رہے تھے، یا شاید اس کے حسیہ تاثرات کو؟

ایک جانچتی نگاہ پوری پولیس اسٹیشن پہ ڈالتا ہوا قدم قدم چلا مرکزی عرشہ تک آیا جیسے دائیں بائیں کھڑے اہلکاروں کے چہرے پڑ رہا ہو، ایک طائرانہ نگاہ سے گھورتے ہوئے اس نے درستی سے کہا۔

”ریڈو تھراپاؤس ناؤ۔“ پھر بتا کر سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، پیچھے کھڑے اہلکار ساکت نظروں سے اس کی پیٹھ کو دیکھے گئے، وہ ہکا بکا رہ گئے، پانچ منٹ پہلے پانچ بجے ریڈ اور پانچ منٹ بعد ابھی؟ وہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، پھر جیسے پوری طرح چوک گئے، پھر پٹی سے ادھر ادھر ہونے لگے، ڈرائیور اہلکار باہر بھاگے، حوالداری بڑی توندوں کی ڈھیلی پٹیلیں گھسیٹتے ہوئے جارحانہ وار حکم کی تکمیل کرنے

لگے، سپاہیوں نے اسلحہ چننا، ایس ایچ او کٹ کٹ فون کرنے لگے، پورے پولیس اسٹیشن میں ایک افراتفری مچ گئی، جبکہ دوسری طرف وہ آرام سے اپنے کمرے میں آیا، ٹیبل کے بائیں جانب پاکستانی جھنڈے کے ساتھ رکھی اپنی ٹوپی اٹھائی، قدرے فخر سے سر پر رکھی، آگے سے ہک کھینچا، پیچھے سے نیچے کھینچ کر مساوی کی، پھر گھوم کر اپنی کرسی تک آیا، ذرا سا جھک کر دراز کھولی جس میں اس کی گلاک 17 گن فائبر رکھی تھی، اسے اٹھا کر اپنی ناف پٹی میں رکھا پھر ہلکی مسکراہٹ سے کلائی پر بندھی گھڑی گھا کر کلائی کی پشت پر سیدھی کی اور وقت دیکھا، یہی تو وہ اصل وقت تھا، اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ در آئی، خاموشی سے موبائل پہ کسی کا نمبر ملاتا ہوا باہر آیا۔

”ہاں ظفر، ٹھیک ہے، کوشش کرو وہ ادھر ہی رہے، ہاں بس کچھ دیر میں۔“ پھر تقریباً بھاگتے ہوئے اپنی پولیس موبائل کی طرف آیا جو چونکا اہلکاروں سے بھری ہوئی تھی، درشتی سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا، اس کی آنکھیں فتح کے گیت گا رہی تھیں، پولیس موبائل ان سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

بڑھریوں کے پاس پڑے وجود سے ایک سفید، نیلی، روشنی سے بنا ہوا ٹرانسپیرنٹ ہیولا باہر نکلا، جیسے کیمرے کا ٹیکسٹو ایچ امپریشن آن ہوا ہو، وہ ہیولا ہوا کی لہروں پر اوپر اڑنے لگا، بالکل ہلکا، لائٹ سا۔

اڑتا ہوا سرخ مخروطی چھت سے ٹکرایا، پھر بنا کسی توقف کے چھت کے پار غائب ہو گیا، جیسے ”ہیری پوٹر“ میں گومٹ کسی بھی چیز میں سے گزر کر غائب ہو جاتے تھے۔

تاریک آسمان پر پورے چاند کی رات کے آخر پہر تھے، ٹھنڈے ستارے، چمکتے کہکشاں، روشن جھرمٹ، جیسے سیاہ لباس پر سفید آٹے کے ذرے، جیسے سیاہ بالوں میں روپہلی چاندنی، مگر وہاں ایک مرنی اور عقلی دلیل کا تقاضا نہ کرنے والی شے بھی موجود تھی، وہاں وہ ہلکا، سفید اور ٹرانسپیرنٹ ہیولا اکیلا نہیں تھا، بلکہ اس کے جیسے لاکھوں، کروڑوں، اربوں ہیولے تھے چھوٹے، بڑے، نسوانی غیر نسوانی سب تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ زمین سے بہت اوپر اور آسمان سے بہت نیچے کہیں درمیان میں معلق ہیں، وہ سب اسے اپنے پاس بلا رہے تھے، کچھ اسے دیکھ کر منہ موڑ رہے تھے، کچھ مسکرا رہے تھے، کچھ لعنت بھیج رہے تھے کچھ مطمئن انداز میں سرخم کرتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے، کوئی خوش آمدید کہہ رہا تھا، کوئی نخواست بھری نگاہ ڈال رہا تھا، وہ ہیولا کچھ گڈمڈ تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، یہ سب کون ہیں؟ وہ خود کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے۔

پھر دفعتاً کسی نے اس کا نام لے کر زور سے پکارا، ہیولا کرنت کھا کر پلٹا، وہاں ایک چھوٹی بچی کی روح تھی، سفید شفاف، کھول اور ٹرانسپیرنٹ روح جو اسے دیکھ کر شدید مضطرب تھی، غصے سے کھولتی ہوئی، لب پختی ہوئی، دانت پیستی ہوئی، شعلہ بار آنکھوں سے گھورتی ہوئی، اس چھوٹی روح کے تاثرات دیکھ کر، وہ بدک کر پیچھے ہٹا، پھر جیسے کسی نے اسے جکڑ لیا، اس نے دائیں بائیں دیکھا، تو تین چار ہیولے اس کے سر پر کھڑے تھے، وہ بے حد گھبراہٹ سے انہیں دیکھے گیا، یہاں تک کہ وہ آگے لڑھکنے لگا اور باقی تمام غیر انسانی مخلوق معا وراوح پیچھے رہ گئیں، وہ اڑتا ہوا، ہوا کے دوش پہ آہستہ مگر مسلسل نیچے آنے لگا یہاں تک کہ وہ اسی مخروطی چھت سے جا لگا

”48 laws of power“ نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک تیر سے دو شکار بھلے نا ہوں مگر ایک تدبیر سے ہزاروں جانیں جاسکتی ہیں، یہاں تک کہ ماؤں کے کوک میں پلتے بچے بھی مر سکتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں درد اُٹ آیا۔

”سو جب درخت ختم کرنا ہوتا تو اس کے تنے کو نہیں جڑ کو کاٹا جاتا ہے اس جگہ کو کاٹا جاتا ہے جہاں سے وہ نشوونما پا رہا ہے جہاں سے اسے خوراک مل رہی ہے، کیونکہ اگر ہم شائیں کاٹیں گے تو جڑ سے ملنے والی خوراک اس جیسی اور بہت سی شاخیں اگا دے گی، سلیم و تھرا وہی جڑ ہے اور باقی سب شاخیں، ایک بار وہ کٹ جائے تو باقی کو شاخیں بھی کاٹ دوں گا۔“ اس نے سیاٹ لہجے میں کہا، دوسری طرف سیاہی نے بامشغل تھوک نکلا، اس کے چہرے پہ نئی رنگ آئے اور گزر گئے، وہ بامشغل سانس لیتا ہوا خود کو پرسکون کرنے لگا۔

”آپ کی بھانجی سر..... اس کا..... مجرم تو فرار ہے، اسے کیسے پکڑیں گے؟“ سپاہی نے مشکل سے الفاظ ادا کیے، بختاورد نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نظردوڑائی، وہاں بے چینی تھی، تشویش تھی، شاید جس اور گھبراہٹ بھی، بے ساختہ اس کے چہرے پر ہلکی مگر گہری مسکراہٹ دوڑی، اس نے ہاتھوں کا پیالا بنا کر سر کے پیچھے رکھ کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”کس نے کہا ہے میں ڈاکٹر شہروز کو پکڑوں گا؟“ اس نے جواب دیئے بنا الٹا سپاہی سے سوال کر دیا۔

”مطلب سر؟“

”مطلب یہی، کہ میں اسے گرفتار نہیں کروں گا۔“

”مگر سر ایف آئی آر تو اس کے خلاف کئی

جس سے وہ باہر نکلا تھا، چھت سے اندر جھانکا تو ایک سفید یونیفارم میں ملبوس اہلکار فون پر کسی سے بات کر رہا تھا، سنہرے بالوں والی لڑکی کو نے میں مضطرب و ہراساں بے حد گہرائی ہوئی کھڑی تھی، وہ انگلیاں آنکھوں سے سانے پڑے اپنے باس کے غیر حرکت وجود کو دیکھ رہی تھی، جبکہ باورچی شب خوابی کا لباس پہنے اس وجود کے سر پہ کپڑا رکھے اس کا خون روکنے اور اسے جگانے کی سعی کر رہا تھا، وہ ہیولا چپکے سے آیا اور اس بے جان وجود پر جھک کر اس کے اندر سما گیا۔

☆☆☆

پولیس موبائلیں اپنی چھتوں پر سرخ بتی جلائے، مخصوص سائرن بجاتے ہوئے مجرم کے گھر کے درپے کو شاں تھیں، باہر اب ملگجا اندھیرا رواں تھا باقی سیاہی رات اپنے پہلو میں سجا کر لے جا چکی تھی۔

”سر، آر یوشیور کہ ان سب کے پیچھے سلیم و تھرا کا ہاتھ ہے؟“ ڈراؤنگ سیٹ پر بیٹھے سیاہی نے جاچتی نگاہوں سے اپنے باس کو دیکھ کر پوچھا، جو پچھلی کئی ساعتوں سے موبائل میں مصروف تھا، بختاورد نے اس کے سوال پر گردن گھما کر دیکھا۔

”شیور کیا مطلب؟ میں کوئی بے وقوف ہوں جو اس وقت بنا کسی اشورس کے ایک افسر کے گھر ریڈ کرنے جا رہا ہوں یا پھر مجھے پولیس ڈیوٹیز کی پہچان نہیں ہے؟“ وہ جیسے برہم ہوا، سپاہی کا چہرہ لٹنے کی طرح سفید پڑ گیا۔

”سوری سر میرا وہ مطلب نہیں تھا، سر ایف آئی آر تو آپ کے بھائی نے ایم بی بی ایس، شہروز کے خلاف کنوائی تھی ناں تو پھر سلیم، سلیم و تھرا کے گھر چھاپا؟“ سپاہی نے رک رک کر پوچھا بادادہ لٹے دماغ کا آدمی بھرتا جائے۔

ہے ناں؟“ سپاہی نے جیسے یاد دلایا۔

”کس نے کہا ہے؟“ اس نے بھنویں اچکا ئیں۔

”کیا تم نے ایف آئی آر میں اس کا نام دیکھا؟“

”ن.....ن..... نہیں سر۔“ سپاہی نے فوراً نفی کی، ایف آئی آر کا ثنا اس کا عہدہ نہیں تھا۔

”تو پھر سر؟ آپ شہروز کا کیا کریں گے؟“

”چھوڑ دوں گا۔“

”کیوں سر؟“

”کیونکہ میں مجرم گرفتار کرتا ہوں ملزم نہیں۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے جھٹکے،

سپاہی نے گردن گھما کر اسے ہراساں نگاہوں سے دیکھا، وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

”میری بھانجی کو شہروز نے غلط انجکشن نہیں لگایا تھا۔“

”کیا سر؟ ن.....ن..... نہیں سر، ایسا نہیں ہو سکتا، وہ انجکشن غلط تھا اور شہروز نے ہی لگایا تھا۔“

”غلط نہیں تھا صحیح لگایا تھا۔“ وہ آرام سے کہہ رہا تھا، چہرے پر سوائے فاتحانہ مسکراہٹ کے اور کچھ نہیں تھا، وہ سپاہی کو یوں بوکھلاتے ہوئے دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا، بلاشبہ یہی تو وہ چاہتا تھا، اقرار زبان عام۔

”میں نے سر خود وہ انجکشن دیکھا تھا، وہ غلط ہی تھا۔“ سپاہی اپنی بات یہ ڈٹا رہا۔

”میں نے کہا کہ انجکشن غلط نہیں تھا، بالکل ٹھیک تھا۔“ اس نے اپنی بات برزور دیا۔

”سر میرا یقین کریں وہ انجکشن غلط.....“

”وہ انجکشن غلط نہیں تھا، کاؤنٹر فیت تھا مطلب جعلی۔“ اس نے حتمی انداز میں چلا کر کہا،

مگر اگلے ہی لمحے وہ آگے لڑھک گیا بالمشکل اس

نے ڈش بورڈ تھاما، فضا میں پولیس موبائل کے ٹائر چرچرائے اور اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے موبائل کو بریک لگی، پیچھے بٹھے سپاہی اسلحے سمت اپنے دائیں بائیں لڑھک گئے، وہ مشتعل نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، جیسے سمجھ نا آ رہا ہو کہ کیا ہوا ہے۔

بختاور خود اور اپنے اعصاب کو سنبھالتا ہوا طیش سے سپاہی کی طرف بڑھا، ایک جھٹکے سے اسے کالر سے پھینچا۔

”غلط وہ ہوتا ہے جو پریکٹس نہیں کیا گیا ہوتا، یعنی دل کے مریض کو شوگر کی دوائی دینا،

بیماری کچھ اور ہوا اور دوائی کچھ اور مگر جعلی وہ ہوتا ہے جو صحیح ہو مگر اجزاء کی عدم موجودگی یا اضافی موجودگی سے مضر صحت بن چکا ہو، یعنی دو نمبر،

فیک ہو، ہوتی وہی چیز ہے مگر خالص نہیں ہوتی، ملاوٹی ہوتی ہے خام ہوتی ہے اور میری بھانجی کو لگنے والا انجکشن غلط نہیں جعلی تھا، دو نمبر تھا سمجھے۔“

وہ سانس لینے کو روکا پھر اگلے ہی لمحے سپاہی کو کالر سے پیچھے کمرزید اپنے چہرے کے قریب کیا۔

”تم ڈاکٹر نہیں ہو اور نا میں تمہارا جونیئر؟“ آئندہ تمیز سے بات کرنا اور ہاں اب یہ گاڑی

سلیم وٹھرا کے ڈرائیوے کی بجائے کہیں اور رکی تو تم بھی چلنے کے لائق نہیں رہو گے سمجھ گئے یا دھراؤں؟“

”س.....س۔“ سپاہی لڑکھڑاتی آواز میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔

”بندر کو اپنی سی سی، گاڑی چلاؤ، ہم ریڈ پہ جا رہے ہیں پکنک پہ نہیں۔“ اس نے شعلہ بار آنکھوں سے دیکھا۔

سپاہی نے آؤ دیکھنا تاؤ، ایکسلیٹر پر پاؤں رکھا، موبائل زن سے آگے بڑھ گئی۔

بختاور نے ڈش بورڈ سے پانی کی بوتل

اٹھائی اور غٹا غٹا گھونٹ بھرنے لگا، پانی کے ٹھنڈک بھی اس کے اندر لگی آگ ٹھنڈی نہیں کر پا رہی تھی، اس نے لمبی سانس لے کر خود کو پرسکون کیا، ابھی بوتل کا ڈھکن بند کر کے اسے ڈس بورڈ پر رکھا ہی تھا، کہ دفعتاً اس کے موبائل کی گھنٹی بجی، موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا، پھر ایک نظر گاڑی چلاتے ڈرائیور سپاہی پہ ڈالی جس کے ماتھے پہ اوائل دسمبر میں بھی پسینے کی بوندیں نظر آرہی تھیں، پھر قدرے سر جھٹکتے ہوئے فون اٹینڈ کیا۔
 ”ہاں ظفر بولو۔“ پھر توقف کے لئے رکھا، اس کے چہرے پہ کئی رنگ آگے گزر گئے۔
 ”کیا؟“

”کب؟“ وہ جیسے یقین نہیں کر پا رہا تھا۔
 ”اچھا ایسولینس منگواؤ ہم پہنچ رہے ہیں۔“
 ”گھبراؤ نہیں ایسولینس منگواؤ، اور سنو ظفر۔“ اس نے جیسے تنبیہ کرنے کی کوشش کی۔
 ”وہ مرنا نہیں چاہیے سمجھ۔“ آخری لفظ تقریباً چیختے ہوئے کہا، پھر کھٹ سے موبائل بند کر دیا، ہاتھ کا مکا بنا کر سائیڈ مرر پہ دے مارا۔
 ”Damn it۔“ پھر درشتی سے ڈرائیور کی طرف مڑا۔

”جلدی چلاؤ، سلیم وٹھرا سیرھیوں سے گر کر زخمی ہو گیا ہے۔“ اس کی بات سن کر سپاہی کے دل میں ایک سکون سرایت کر گیا، کچھ دیر پہلے کا پہچان جو اس کے چہرے پر نظر آرہا تھا اب بالکل غائب ہو گیا تھا یا شاید بالکل تھا ہی نہیں، قسمت اس پہ مہربان تھی، اس کے سکون زدہ چہرے کے تاثرات بخنار سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔
 بلاشبہ وہ جانتا تھا کہ یہ چھی سلیم وٹھرا کی کوئی چال ہوگی مگر ظفر جھوٹ کیوں بولے گا؟ کیا پتہ یہ لٹناک حادثہ ہی ہو؟

☆☆☆

وہ اپنی سربراہی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ایک سے ایک فائل نکالے بڑی توجہی سے پڑھ رہا تھا، جبکہ اپنی پشت پہ سیلوٹ سے چونکا، رخ موڑ کر دیکھا تو ایس ایچ او امانت مبین ہاتھ میں فائل پکڑے چوک کھڑا تھا۔
 ”کیا خبر ہے مبین؟“ اس نے سرسری سا پوچھا پھر اسی تندہی سے اپنی فائل میں منہمک ہو گیا جیسے کچھ دیر پہلے تھا، وہی سپاٹ و بے نیاز وہی اسرو سوخ، وہی شاہانہ رویہ والا ایٹی ٹیوڈ، چہرے پر ڈھیروں تفکر اور پیزاری جبکہ حوصلوں میں وہی اڑان اور مظنہ۔

”سر آپ کا شک سو فیصد درست ثابت ہوا ہے کاؤنٹر فٹ ادویات بنانے والی بیشتر کمپنیاں سلیم وٹھرا کی ہیں۔“ مبین نے بے تاثر سا کہا جیسے یہ اس کے روز کا کام ہو، البتہ اس دفعہ اس کے لہجے میں جوش آیا تھا۔

”چانے کیوں؟ سر یہ ساری کمپنیاں شمال مغربی علاقوں میں پائی گئیں، ایک بڑی فیکٹری جو پی ٹی سی نے مشترکہ فیصلے سے ضبط کر کے اسے سیل کیا تھا پشاور کے نواحی علاقے میں دوبارہ غیر اندراجی طور پر اپنے اڑلی کاروبار کی طرف لوٹی ہے، علاقائی ملکیٹوں کے مطابق سیل ہونے کے چند ماہ بعد یہ فیکٹری دوبارہ سے چلنے لگی۔

”اور سر حیرت کی بات ہے کہ یہ فیکٹری پاکستان فارمیسی کے ڈیولپمنٹ اور مارکیٹنگ ہیڈ سلیم وٹھرا کے لئے کام کر رہی ہے۔“

اس کے فائل کے اوراق بدلتے ہاتھ چند ٹاپے کے لئے تھے، اس نے سر اٹھا کر مبین کو دیکھا، پھر فائل بند کر کے ایک دراز میں ٹھونی اور اپنی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، ایک سنجیدہ نگاہ مبین پہ اور ایک فاتحانہ نگاہ فائل پہ ڈالتا وہ قدرے جوش سے فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔

(Pakistan) سے منظور شدہ ہے، ایپ سٹور اور پلے سٹور میں مکمل تحفظات کے ساتھ موجود ہے کوئی بھی ڈاؤن لوڈ کر کے، کسی بھی دوائی کے پیک پے بنے بارکوڈ کو سکین کر کے اس کے اصلی یا نقلی ہونے کی پڑتال کر سکتا ہے۔
”ہوں اور کچھ؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا تم لوگوں نے ساری ادویات ضائع کر دیں؟“
”نہیں سر، ابھی نہیں، ادویات ہم نے پاکستان فارمیسی کوالٹی کنٹرولر ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دیں، اب آگے فیصلہ ڈراپ اور پی سی کریں گے۔“

”ہوں، ان ادویات کو آرگنائز کرنے والا عملہ کہاں ہے۔“
”سر وہ آر سٹڈ ہے۔“
”کہاں؟“
”سر پشاور میں۔“

”ہوں، کیا کہتے ہیں وہ لوگ، بیان لیا ان کا؟“
”جی سر، ڈاکٹرز، فارماسٹ اور آرگنائزنگ سٹاف، سب سلیم وٹھرا کا نام لے رہے ہیں، اس فیکٹری کے سینئر ڈاکٹر اشرف کاردار نے سلیم وٹھرا کے مکمل ملوث ہونے کا اعتراف کیا ہے سر۔“

”سلیم وٹھرا کو معلوم ہے اس بارے میں؟“
”جی سر!،“ مبین نے اثبات میں سر ہلایا۔
وہ ذرا آگے ہوا، فائل ایک طرف رکھی، بے رحمی سے کن پٹی مسلی۔
”پھر تو وہ بھاگنے کی کوشش ضرور کرے گا۔“

اس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔
”سر وہ نہیں بھاگ سکتا۔“ مبین نے پر

”سراسی فیکٹری کے گودام میں جو خفیہ طور پر تہہ خانے میں تھا بڑی تعداد میں ذخیرہ کردہ ادویات برآمد ہوئی ہیں اور یہ جان کر آپ کو بے حد دکھ ہوگا کہ ساری کی ساری ادویات سمگل شدہ اور جعلی ہیں، کاشن پر لگے ہارکوڈز، مینوفیکچر، ایکسپائری ڈیٹ سب جعلی اور دو نمبر ہے۔“ سیاہی نے حیران کن انکشاف کیا، اس نے فائل میں لگی چند تصویروں کو دیکھا، جو تہہ خانے کی عکاسی کر رہی تھیں وہاں اوپر تے رکھے، ایک کے بعد بند کارٹن نظر آ رہے تھے۔

”تم لوگوں کو مکمل یقین ہے کہ وہ سب جعلی تھے؟“ اس نے باقاعدہ تفتیش کا آغاز کیا، کسی بھی رپورٹ کی مہارت کے لئے وہ اپنے بندوں کی بھی آڑے ہاتھوں لیتا، ایگزیمینٹ ان کر اس کر کے، جانچ پڑتال کر کے، خوب کرید کر دائیں بائیں سے نچوڑ کر جو مٹھی بھر سچائی نکلتی، بس اسے مہرہ بنا کر وہ خود کو اور اپنے کسی بھی کس کو پایہ تکمیل تک پہنچتا۔

”سر سو فیصد یقین ہے کہ یہ سب جعلی ہیں۔“ اپنی بات پر زور دے کر مبین نے یقین دہانی کروائی چاہی، وہ اپنے باس کی اس چھٹی خصلت سے بخوبی واقف تھا، لہذا بے دریغ اور پورے اطمینان سے جواب دینے لگا۔
”کیسے یقین ہے؟“ اس نے بھنویں اچکا کر اچنبھے سے پوچھا۔

”سر کیونکہ ہم نے ڈراپ سکیئر سے ہر کاشن کے کوڈز سکین کیے ہیں، ان کے اندر موجود ادویات بھی سکین کیے، سب کی سب جعلی ہیں سر۔“ اس نے پہلا ثبوت دیا۔

(ڈراپ سکیئر موبائل فون میں موجود ایک ایپ ہے جو کہ ڈراپ سے (Drvg Regulatory Authority of

سکون انداز میں کہا۔
”کیوں؟“ اس نے حیرت سے دیکھا۔
”نام ای سی ایل میں ڈال دیا گیا ہے سر،

این آر او نہیں ملے گا، پاسپورٹ منسوخ ہو گیا،
آپ کے کہنے پہ یہ تمام محل میں پہلے ہی کر چکا
ہوں۔“ مبین نے ذرا خراہ انداز میں کندھے
جھٹکے، بختاور بدقت مسکرایا۔

”ہم اسے گرفتار نہیں کر سکتے، یہ سب پی پی
سی فیصلہ کرے گی۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔
”سر پی پی سی آج شام تک یقیناً اس کی
گرفتاری کے آرڈر جاری کر دے گی، کیونکہ آج
شام چھ بجے پی پی سی کا اجلاس ہے۔“ مبین نے
قدرے یقین سے کہا۔
”اس اجلاس کے بارے میں اسے ضرور

معلوم ہوگا؟“
”جی سر، مگر وہ اب کچھ نہیں کر سکتا، سوائے
اس کے کہ وہ ملک میں کہیں چھپ جائے۔“
مبین نے تسخراہ انداز میں کہا۔

”اور سر آج رات تک میڈیا کو بھی انفارم کر
دیا جائے گا، پھر وہ چاہ کر بھی کہیں نہیں چھپ
پائے گا۔“

”غدار۔“ اس نے نفرت سے کہا۔
”اس جیسے ناسوروں کی وجہ سے ہمارا ملک
بدنام ہے، انسانیت کی پرواہ کسی کو نہیں، بس پیسہ
ملنا چاہیے، بیمار پہلے ہی موت و حیات کی کشمکش
میں ہوتے ہیں اوپر سے خالص دوائیاں دینے کی
 بجائے جعلی ادویات دے کر ان کو وقت سے پہلے
لقمہ اجل بنادیتے ہیں۔“ اس نے افسوس کیا۔
”اب سر بے ایمانی اور غداری کا کوئی علاج
نہیں، علاج صرف ظاہری خرابیوں کا ہوتا ہے
باطنی کم ظرفیاں انسان کو خود ہی چھوڑنی ہوتی ہیں،
شمال مغربی علاقوں، فانا، پانا، وغیرہ میں یہ جعلی

ادویات فیکٹریاں پھیل رہی ہیں سر۔“ اس نے
لہجہ کو نرم اور آواز دھیمی کر دی۔

”ہم ان کی روک تھام کیسے کریں گے؟“
اس کے الفاظ سے ظاہر تھا وہ ہتھیار پھینکنے لگا ہے۔

”مبین!“ اس نے سپاٹ لہجہ اپنایا۔
”پولیس والے محض گرفتار کر سکتے ہیں

سزائیں دے سکتے ہیں مگر کب کون سی دوائی جعلی
ہے اس کا جائزہ پی پی سی کو لینا چاہیے، ہمیں

صرف ان کے حکم کی تعمیل کرنی ہوتی ہے، اینٹ
کو اگر کہیں جعلی ادویات و منشیات کا خطرہ ہے تو وہ

پی پی سی کی مدد لے، شمال مغربی علاقوں میں یہ
دوائیاں چلتی رہیں گی، جس دن ان کی جڑ کٹ

گئی، یہ لوگ خود بخود ادویات لینا بند کر دیں
گے۔“

”مگر سر ان علاقوں کے مقامی باشندوں کا
کہنا ہے پی پی سی کی اپنی ادویات کافی مہنگی ہیں عام

لوگ کیسے خریدیں؟“
”سارے سو، لوہار کی ایک، اگر وہ جعلی

ادویات ہزار بھی خریدیں گے تو آرام درکنار،
کجا وہ ایک خریدیں مگر جلد صحت یاب ہوں۔“

اس نے ٹھیک کہا تھا۔
”سر بالکل درست کہا، مجھے آئی جی صاحب

کے بھتیجے کا گیس دیکھنا ہے، اجازت چاہوں گا۔“
مبین نے اپنی ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اسی کام کے لئے رہ گئی پولیس۔“ اس
نے نخوت سے سر جھکا۔

”تم جاؤ، آئی جی صاحب کا بھتیجا ہے وہ
آفر آں۔“

”جی سر۔“ اس نے سپاٹ انداز میں
سیلوٹ کیا اور بنار کے وہاں سے باہر نکل گیا۔

بختاور نے سامنے رکھی فائل پھر سے اٹھائی،
ایک نظر دیکھا پھر ناگواری سے بند کر دی۔

”کیا؟، ہم..... اچھا..... تمہیں یقین ہے..... ٹھیک..... ہاں ابھی؟“ اس نے سامنے لگی گھڑی میں وقت دیکھا۔

”ہاں ٹھیک ہے چلو آ جاؤ، نہیں نہیں فارغ ہوں اوکے۔“ اس نے رسی سلیک کے بعد موبائل بند کر دیا اور بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گیا، ہاتھوں کو معافی کی شکل میں جوڑ کر ہونٹوں سے لگایا، وہ گہری سوچ میں ڈوبا تھا، اس کا شک درست تھا، سلیم دھرا کی موت قدرتی ضرورت تھی مگر مکافات عمل تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ مبین کو لے کر لاؤنج میں آیا، یہ سیاہ پتلون اور آدھی آستنیوں والی سیاہ لی شرٹ میں ملبوس تھا، جبکہ اس کے برعکس مبین ہاف وائٹ پینٹ اور بلیو شرٹ پہنے ہوئے تھا، جیل سے بال پیچھے کو موڑے صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اتوار کی شام کسی خاص کے ہاں منا کر آیا ہے۔

بختاور نے لاؤنج سے ملحقہ کچن سے دو سافٹ ڈرنکس کے کین نکالے اور قدم قدم چلتا لاؤنج میں آیا، ایک کین مبین کی طرف اچھالا جو صوفے کے کنارے فرط ادب سے کھڑا تھا اس نے پیچ کیا۔

”بیٹھو کھڑے کیوں ہو۔“ اس نے دوستانہ انداز میں کہا پھر اپنے کین کو منہ سے لگایا۔ مبین صوفے پر الٹ ہو کر آگے بیٹھ گیا اور کین سامنے میز پر دھر دیا، وہ اسے پی نہیں سکتا تھا، کیونکہ آج کل وہ ”السر“ کا مریض تھا۔

”سر پاداش، آٹم۔“ (گناہگار کا بدلہ) پر آپ یقین تو رکھتے ہی ہونگے؟“ مبین نے انداز پوچھا، جواب میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے ریلیکس بیٹھے بختاور نے اثبات میں سرخم کیا۔

یہ رات گیارہ بجے کا وقت تھا جب اس نے فریج کا دروازہ کھولا، فریج کی لائٹ کی روشنی پڑی تو اس کا چہرہ واضح ہوا، خمار آلود آنکھیں، مہجھایا چہرہ اور خفیف سنجیدگی، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، وہ یقیناً نیند سے جاگا تھا، اس نے فریج سے بوتل نکالی اور غٹا غٹا گھونٹ بھرنے لگا۔

اس کے چہرے پر تفکر کی ایک لہر دوڑی، آنکھوں کے سامنے سلیم دھرا کا بے جان چہرہ لہرایا، سفید کپڑا، اس کی ڈھکی میت، اس کی ٹھنڈی موت، بخ..... بے جان..... ساکن۔

آپریشن کے چار گھنٹے بعد کہ جب سلیم دھرا کو ہوش آنے والا تھا اور ڈاکٹرز کے مطابق وہ خطرے سے باہر تھا کہ اس کی حالت خراب ہوئی اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

وہ منظر تکلیف دہ نہیں تھا، مگر اندر چھ رہا تھا، کیونکہ وہ خود سلیم دھرا کو اپنی ہاتھوں لینا چاہتا تھا، اس کی اس قدر آسان موت کی توقع وہ ہرگز نہیں رکھتا تھا۔

جس شخص کی ناقص ادویات ساری عمر معصوم لوگوں کی جان لیتی رہی ہوں وہ محض سیڑھیوں سے گر کر مرے، پیچ پیچ بہت آسان موت۔

اس نے بانیں ہاتھ کی انگلیوں سے کن پٹی مسلی جب اس کا فون بجا، اس نے گردن موڑ کر دیکھا، آواز کمرے سے آ رہی تھی، بوتل کا ڈھکن بند کر کے کاؤنٹر پہ رکھی اور تیز تیز ڈگ بھرتا کمرے میں آیا، بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل جگمگا رہا تھا، اس نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا۔

”ہاں مبین۔“ اس نے رندھی آواز میں کہا، نیند کا غماز ابھی باقی تھا۔

نے ہلکی آواز میں ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔
 ”یقین کے قابل ذات کے یقین پر یقین رکھتا ہوں۔“ اس نے خوبصورتی سے کہا۔

”ویل..... سر..... میں..... وہ.....“ اس نے
 پینٹ کی جیب سے دوائی نکالنے کی سعی کے
 درمیان کہا۔

”دوائی میرے پاس ہے، جس نے سلیم
 وٹھرا کی جان لی۔“

اس نے سفید شیشی جس کے اندر زرد محلول
 کے چند قطرے تھے بختاور کے سامنے میز پر رکھی،
 بختاور نے آگے بڑھ کر وہ شیشی اٹھائی اور الٹ
 پلٹ کرنے لگا۔

”سر آپ چیک کر لیں۔“ اس نے مشورہ
 دیا۔

”ہاں؟“ جواب میں بختاور نے نا سمجھی سے
 دیکھا۔

”مطلب..... سر..... ڈراپ سکیں؟“ اس
 نے کچھ بتانے والے انداز میں کہا۔

بختاور نے اوہ اچھا والے انداز میں شانے
 اچکائیں اور سائڈ ٹیبل پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا،
 ڈراپ سکیں ایپ آن کی اور وہ سفید شیشی جس پر
 لگے کاغذ پر ایک ڈاکس والا ڈبہ تھا، لہرائی۔

موبائل کے اسکرین پر سرخ پٹی ابھری،
 ریڈ..... سرخ..... کر اس..... ڈیبنجر..... خطرہ۔

اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی،
 اس نے نظر گھما کر سامنے بیٹھے مبین کو دیکھا، پھر

موبائل اسکرین کو اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔
 ”Countesfeit (جعلی)۔“

☆☆☆

”سر ڈاکٹر واجد واسطی کے مطابق ان کی
 حالت بالکل ٹھیک تھی وہ آپریشن کے بعد خطرے
 سے باہر تھے مگر انڈر ابراہر ویشن ان کی حالت بگڑ
 گئی، وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے، واجد کو
 کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اپنے تئیں تو
 اس نے بچانے کوشش کی مگر وہ جان کی بازی ہار
 گئے۔“ اس نے رسان سے بتایا۔

وہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے، کین سے
 گھونٹ بھرتا، توجہ سے سن رہا تھا۔

”اور سر پوسٹ مارٹم رپورٹ کے
 مطابق.....“ مبین خاموش ہوا، نظریں جھک
 گئیں۔

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق؟“ اس
 نے کین میز پر رکھ کر عجیبی سے پوچھا، گویا یاد
 دلایا کر اسے آگے بھی کچھ بولنا ہے۔

”یہی سر کہ ان کی موت غلط انجکشن سے
 ہوئی ہے۔“ مبین نے دبی آواز میں کہا۔
 ”غلط یا جعلی؟“

”س..... سر..... ج..... جعلی۔“ اس نے
 سرگوشی کے انداز میں کہا۔

بختاور انگڑائی لے کر ہنسا، اس کے سنجیدہ
 چہرے نے معصوم بچے کے چہرے کا روپ دھار
 لیا۔

مبین حیرت سے دیکھے گیا، وہ حیران تھا اور
 خوش بھی۔

”تمہیں پتہ ہے۔“ وہ ہنسی کے درمیان
 سے بولا۔

”ایک مثل مشہور ہے کہ انسان کو موت اس
 کے پسندیدہ کام دیتے ہیں، آج..... آج وہ

کہاوت درست ثابت ہوئی، آج مکافات عمل پر
 یقین آ گیا۔“ اس نے سانس خارج کی۔

”سر آپ یقین پر یقین رکھتے ہیں۔“ مبین



محبوبہ عروسی

سباس گل

”خبردار، اگر میرے بیٹے کو کوئی نقصان پہنچایا وہ تمہارا داماد بھی ہے تم اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو۔“ عائشہ رضانے لرزتی آواز میں پریشانی سے کہا۔

”داماد تو مجھے اور بھی مل جائے گا اتنی دولت ہے میرے پاس کے اپنی بیٹی کی شادی کسی بڑے بزنس مین کے بیٹے کے ساتھ کروا سکتا ہوں لیکن اگر تمہارا بیٹا چلا گیا تا تو دوبارہ نہیں آئے گا لہذا

”خبردار، اگر میرے بیٹے کو کوئی نقصان پہنچایا وہ تمہارا داماد بھی ہے تم اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو۔“ عائشہ رضانے لرزتی آواز میں پریشانی سے کہا۔

”داماد تو مجھے اور بھی مل جائے گا اتنی دولت ہے میرے پاس کے اپنی بیٹی کی شادی کسی بڑے بزنس مین کے بیٹے کے ساتھ کروا سکتا ہوں لیکن اگر تمہارا بیٹا چلا گیا تا تو دوبارہ نہیں آئے گا لہذا

☆☆☆

حمدان کو گئے ہوئے آج چار دن ہو گئے تھے، عائشہ رضانے خود کو کمرے تک محدود کر رکھا

ناولٹ

تھا اور مزہ کو ان کی اس خاموشی کے پیچھے کسی طوفان کی آمد محسوس ہو رہی تھی، وہ بہت چوٹی اور محتاط ہو گئی تھی، عشاء کی نماز کے بعد وہ واک کی غرض سے باہر لان میں آ گئی تھی اور اپنے بیڈ پر تکیے رکھ کر اوپر چادر پھیلا کر لائٹ آف کر کے باہر آئی تھی، عائشہ رضانے کی حرکات اسے کچھ مشکوک دیکھائی دے رہی تھیں، اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی لہذا اسے اپنی حفاظت خود ہی کرنا تھی وہ دعا کر رہی تھی کہ حمدان یوسف جلدی واپس آ جائے اور اس کے آنے تک حالات سازگار رہیں مگر ایسا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ واک کرنے کے بعد وہیں لان میں بیٹھ گئی تھی کرسی سے ٹیک لگائے ٹائلیں میز پر رکھے درود پاک اور آیت الکرسی پڑھتے ہوئے کب اس کی آنکھ لگ گئی اسے خبر ہی نہ ہوئی، وہ تو شور کی آواز پر فائر آلام پر چونک کر اٹھی تھی، نگاہ



کرمروں گی آنٹی!“
 ”تم..... تم زندہ ہو۔“ عائشہ رضا اسے صحیح سلامت دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔

”الحمد للہ! میں زندہ ہوں کیونکہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے بہت بڑا ہے میرا اللہ۔“ مزمنہ ان کے بوکھلائے ہوئے سراپے پر نگاہ ڈال کر اعتماد سے بولی۔

”چلو شکرانے کے نفل ادا کرو کے تم بچ گئیں۔“

”وہ تو میں ادا کروں گی ہی، آپ کیا کریں گی؟“

”کیا مطلب؟“ عائشہ رضا کی آواز ہی نہیں ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

”مطلب یہ کہ کوئی نئی سازش تیار کریں گی مجھے مارنے کے لئے یا اسی کی ناکامی پر غصہ کر کے صبر کر لیں گی۔“

”تم..... تم مجھ پہ اتنا گھٹیا الزام لگا رہی ہو۔“ عائشہ رضا غصے میں آتے ہوئے بولیں تو

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ یہ الزام نہیں ہے سچ ہے۔“

”تم الزام لگا رہی ہو، جھوٹ بول رہی ہو۔“

”جھوٹ، سچ کا فیصلہ پولیس کرے گی،

نسرین بی، سب سے کہہ دیں کہ کمرے کی کسی

چیز کو ہاتھ نہ لگائیں جو چیز جہاں ہے وہیں رہنے

دیں، پولیس آکر خود تحقیق کرے گی کہ یہ آگ

کس نے لگائی تھی اور کیوں لگائی تھی؟“ مزمنہ نے

عائشہ رضا کو ان کی بات کا جواب دے کر نسرین

سے کہا تو وہ ”جی دلہن بی بی“ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

”ذرا سی آگ لگی تھی بھج چکی ہے اس کے

دائیں جانب گھر کے اندرونی حصے کی جانب ابھی تو اسے اپنے کمرے سے آگ کے شعلے نکلتے دکھائی دیئے۔

”او مائی گاڈ، اف، اتنی نفرت، اتنا انتقام،

بدلے کی آگ میں وہ مجھے جلا کر مارنا چاہتی تھیں،

مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔“ اس نے زیر

لب کہا اور اٹھ کر اندر کی جانب دوڑی۔

آگ گھر کے ملازموں نے پانی ڈال کر بجھا

دی تھی، مزمنہ کا بیڈ جزوی طور پر جل چکا تھا،

کھڑکیاں پر دے بھی جل گئے تھے، صاف ظاہر

ہو رہا تھا کہ مزمنہ کو مارنے کے لئے اس کے بیڈ پر

آگ لگائی گئی تھی، کھڑکیوں پر بھی آگ لگانے کا

مقصد یہی تھا کہ باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے اور مجرم

نے بوکھلاہٹ میں ایک غلطی پھر بھی کر دی تھی کہ

دروازے کو لاک لگانا بھول گیا تھا، دروازے

سے ہی اندر داخل ہو کر ملازموں نے آگ پر قابو

پایا تھا۔

فائر الارم بند کرنا عائشہ رضا بھول گئی تھیں

بلکہ حقیقت تو یہ بھی انہیں یاد ہی نہیں تھا کہ ان کے

گھر میں فائر الارم بھی لگا ہوا ہے بس اسی لئے

آگ پورے کمرے میں نہ پھیل سکی، بلکہ جہاں

جہاں پیڑول چھڑک کر آگ لگائی گئی تھی صرف

وہی جگہ جل پائی تھی، مزمنہ کا بیڈ صرف وہاں سے

جلا تھا جہاں وہ سویا کرتی تھی یہ دیکھ کر ملازموں کو

بھی سمجھو آ رہا تھا کہ مزمنہ کو ختم کرنے کی گہری

سازش تھی یہ جو ناکام ہو گئی تھی، سب کا شک

عائشہ رضا پر تھا۔

”ارے مزمنہ کا بیڈ جل گیا ہے مزمنہ بھی جل

کر مر گئی دیکھو تو اس کی لاش وہیں ہو گی۔“ عائشہ

رضا ملازمہ سے کہہ رہی تھیں، اسی وقت انہیں

اپنے پیچھے سے مزمنہ کی آواز سنائی دی۔

”جل کر مر میں میرے دشمن میں کیوں جل

جسے سن کر صابرہ اپنا ہاتھ مٹا کر صوفے پر ڈھے گئیں۔

”امی!..... امی! آنکھیں کھولیں۔“ مزہ پریشانی کے عالم میں انہیں پکار رہی تھی، فواد راشد اور راشد بیگ حیران، پریشان یہ سب سن اور دیکھ رہے تھے، جب فیصل وہاں پہنچ گیا اور صابرہ کو ہسپتال لے جانے کا کہا، نسرین اور مزہ مل کر صابرہ کو اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”ابا جی! آپ گاڑی اشارت کری ہم صابرہ کو لے کر آتے ہیں۔“ فواد راشد نے راشد بیگ کی طرف گاڑی کی چابی بڑھاتے ہوئے کہا مگر وہ بت بنے کھڑے رہے۔

”ابا جی! میں آپ سے کہہ رہا ہوں، ابا جی!“ فواد راشد نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر انہوں نے آگے بڑھ کر ان کا بازو پکڑا تو وہ ریت کی طرح ان کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے کارپٹ پر جا گرے۔

”ابا جی!“ فواد راشد چیخے۔

”دادا جی!“ مزہ بھی خوف اور شاک سے چلائی۔

ایک منٹ میں صورتحال پہلے سے کہیں زیادہ گھبر ہو گئی تھی، ایسے میں فیصل نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے ایمبولینس کو کال کی، صابرہ کو وہ مزہ کے ساتھ اپنی گاڑی میں ہسپتال لے کر روانہ ہو گیا تھا۔

آج کیا جانے کیا ہے ہونے کو جی بہت چاہتا ہے رونے کو مزہ بھیگی آنکھیں، زخمی دل لئے فواد راشد اور فیصل کے ہمراہ ایمرجنسی کے باہر کھڑی تھی، دل اپنی ماں کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا، ایک طرف صابرہ بھی تو دوسری طرف راشد بیگ، کافی دیر معائنے کے بعد ڈاکٹر فضل

لئے گھر میں پولیس کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟“ عائشہ رضوانے پریشان لہجے میں کہا۔

”یہ ذرا سی آگ نہیں تھی آئی! یہ مجھے جلا کر مارنے کی سازش تھی اگر یہ آگ ذرا سی ہوتی تو اس طرح سے میرے بیڈ روم تک نہیں پہنچتی۔“ مزہ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے سیٹ لہجے میں کہا اور فیصل کا موبائل نمبر ملانے لگی جو حمدان یوسف نے جاتے وقت مزہ کے موبائل پر سینڈ کر دیا تھا۔

آگ لگنے کی خبر پھیلی تھی، فواد راشد، راشد بیگ حتیٰ کہ صابرہ بھی رات کے ڈیڑھ بجے ”حمدان ولا“ پہنچ گئیں تھیں۔

”یہ سب کیسے ہوا؟ تم ٹھیک تو ہونا؟“ صابرہ نے مزہ کو گلے لگایا پھر اس کے چہرے کو ہاتھوں کو ایسے چھو کر محسوس کر رہی تھیں جیسے اس کی تکلیف ڈھونڈ رہی ہوں، عائشہ رضا تو بری طرح گھبرائی ہوئی تھیں اور اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں امی، کچھ نہیں ہوا مجھے میرے ساتھ آپ کی دعائیں جو ہیں۔“ مزہ نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلایا۔

”میں جب سے یہاں سے گئی ہوں میرا دل بہت پریشان تھا تمہارے لئے پتا نہیں کیوں دل میں عجیب عجیب خیال آرہے تھے۔“ صابرہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو نسرین کہنے لگی۔

”آپ کا دل ٹھیک ہی پریشان تھا اپنی بیٹی کے لئے آپ کے جانے کے بعد بیگم صاحبہ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی انہیں مارنے، تکلیف دینے میں تو آپ کی بیٹی بہت صابرہ اور برداشت والی ہے کہ سب کچھ برداشت کرتی رہے اور آج یہ آگ والا واقعہ دیکھ لیں اللہ نے جان بچائی مزہ بیٹی کی.....“ نسرین نے تو ساری کٹھا کہہ سنائی،

نے آکر بتایا کہ۔

”انشاء اللہ“ وہ بھیتی آواز میں بولی۔

فیصل کو پہلی بار مرنہ سے اس طرح ملنا پڑ رہا تھا اور اسے چند گھنٹوں میں ہی احساس ہو گیا تھا کہ مرنہ کے بارے میں حمدان یوسف نے جو بھی بتایا تھا وہ سچ تھا وہ اپنے باپ کے مزاج کے برعکس تھی۔

حساس، کینرنگ اور نفیس شخصیت کی مالک! فیصل کے دل میں مرنہ کے لئے عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ بھائی بن کر ان مشکل حالات میں اس کا ساتھ دینے کے لئے پر عزم تھا، حمدان یوسف سے گہری دوستی کے ناطے یہ اس کا فرض بھی تھا۔

☆☆☆

وقت کی طنائوں کو
کون کھینچ پایا ہے
وقت نے سکھایا ہے
جو بھی کچھ ہے دنیا میں
مال و زر یہ دھن، دولت
سب مٹی ہے، سب مایا ہے
جس و جاں کے سب رشتے
تب تلک ہی جیتے ہیں
جب تلک ان رشتوں میں
بے ریا کسی چاہت ہو
پر خلوص الفت ہو
بے غرض احساس ہو
تب تلک ہی جیتے ہیں
جسم و جاں کے سب رشتے
یہ نہ ہوں تو پھر سن لو!

مال و زر سے جڑنے پر
کسی نے کچھ نہیں پایا
اپنا آپ کھویا ہے
اپنا آپ کھوایا ہے

”آپ کے پشٹ کو فالج کا ایک ہوا ہے اور ان کا دایاں حصہ پیرالائز ہو گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے کی طرح بول بھی نہ سکیں فی الحال کچھ بھی کہنا مشکل از وقت ہے، ہم اپنی پوری توجہ سے علاج کر رہے ہیں آپ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ، ان کی مشکل آسان کریں، اس عمر میں دل پاور کم ہو جاتی ہے۔“ نوادر اشد اپنے باپ کی کنڈیفین کے بارے میں جان کر صدے اور بے بسی کے احساس کے ساتھ دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر ڈھے گئے، کیا انہیں مرنہ کی حالت جان کر شاک لگا تھا؟ یہ سوال نوادر اشد کے دماغ میں ابھرا تھا۔

”تم باپ ہو نوادر اشد کیا تمہیں، اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا جان کر دکھ نہیں ہوا، دل نہیں تڑپا تمہارا؟“ یہ ان کے ضمیر کی آواز تھی، وہ بے کل ہو کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”ڈاکٹر صاحب! میری امی کیسی ہیں؟ ٹھیک تو ہو جا میں گی نا وہ؟ کیا ہوا ہے انہیں؟“ مرنہ نے ایمر جنسی روم سے باہر آتے ڈاکٹر محمود اسلم کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

”آپ کی والدہ کسی گہرے صدے میں ہیں انہیں ہارٹ ایک ہوا ہے اگلے چوبیس گھنٹے ان کے لئے بہت اہم ہیں آپ ان کے لئے دعا کیجئے، ہم انہیں آئی سی یو میں شفٹ کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر محمود اسلم نے اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بتایا، اسے یہی ڈر تھا جو سچ ثابت ہو گیا تھا۔

”جی!“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”مرنہ بھابھی! آپ پریشان مت ہوں انشاء اللہ! انہی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ فیصل نے اسے دیکھتے ہوئے تسلی دی۔

یہ مال وزر، یہ دھن دولت
سب مایا ہے
سب مایا ہے

”ابو! آپ کہتے تھے ناکہ دولت پاس ہو تو
ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔“ مزمنہ پھر سے فواد
راشد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

”تو جا میں جا کر اپنے باپ اور بیوی کے
لئے صحت خرید کر لائیں اور گردیں انہیں پہلے کی
طرح صحت مند، کر سکتے ہیں آپ ایسا؟ یہ جو
دولت آپ نے دھوکے سے حاصل کی ہے کیا یہ
دولت میری ماں کے بیمار دل کو صحت بخش سکتی

ہے؟ کیا آپ کی یہ دولت دادا جی کے بے جان
اور مفلوج بدن میں جان ڈال سکتی ہے؟ لائیں
اپنی دولت، اپنا پیسہ لا کر رہیں دادا جی کے مفلوج
بدن پر پھر کر دیکھیں وہ پہلے کی طرح اٹھ کھڑے
ہوں گے چلنے پھرنے لگیں گے ناں؟ نہیں خرید
سکتے تھے نا آپ ان کے لئے صحت؟ دولت سے،

روپے پیسے سے صرف چیزیں خریدی جاتی ہیں
ابو، جد بے اور رشتے نہیں خریدے جا سکتے، امی کو
ہارٹ اٹک ہوا میرا دکھ اور تکلیف محسوس کر کے،
دادا کو فوج ہوا اپنی پوتی پر ہونے والے ظلم کا سن
کر، جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ یہ ہے رشتوں کی
حقیقت، یہ ہے خون کی کشش اور اپنا ہونے کا

احساس، دادا جی لاکھ مجھ سے دور رہتے تھے لیکن
میں ان کی پوتی ہوں، ان کی اولاد کی اولاد وہ
میرے دکھ پر دھی نہ ہوتے ایسا ہو ہی نہیں سکتا
تھا، انہوں نے آپ کو صحیح غلط کی تمیز نہیں سیکھائی،
حرام حلال، جائز ناجائز کام کر کے دولت حاصل
کر کے عیش کرنے سے نہیں روکا، بہت غلط کیا،
لیکن وہ کبھی بھی آپ کو تکلیف میں نہیں دیکھنا
چاہتے تھے، دادا جی کو اور امی کو اس حال تک
پہنچانے والے آپ ہیں ابو! جانتے ہیں عائشہ
آنٹی نے میرے ساتھ برابر تائی کیوں کیا؟ آپ
کی وجہ سے کیونکہ وہ جان چکی تھیں کہ ان کے
مرحوم شوہر کے ساتھ آپ نے دھوکہ کیا فراڈ سے

راشد بیگ اور صابرہ کو ابھی تک ہوش نہیں
آیا تھا، صبح ہونے والی تھی، مزمنہ فجر نماز ادا کر کے
آئی تو فواد راشد اور فیصل کو دیکھتے ہوئے سامنے
صوفے پر بیٹھ گئی، وہ دونوں ویننگ روم میں آ کر
بیٹھ گئے تھے۔

”ابو! آپ کچھ کرتے کیوں نہیں ہیں؟“
مزمنہ نے فواد راشد کو دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے
میں سوال کیا، ان کے ساتھ ساتھ فیصل نے بھی
اسے چونک کر دیکھا تھا۔
”میں کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ بے تاثر لہجے
میں بولے۔

”کیوں نہیں کر سکتے کچھ؟ آپ کے پاس تو
بہت دولت ہے، پیسہ ہے، صاحب حیثیت ہیں
ناں آپ تو اب پھر کیوں نہیں اپنی بیوی اور باپ
کو ہوش میں لا رہے؟“
”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ فواد
راشد گرجے۔

”میرا دماغ تو خراب نہیں ہوا، آپ کی
نیت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے آج امی اور
دادا جی ہسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔“ مزمنہ
نے فیصل کی موجودگی کا خیال کیے بغیر کھری
کھری سنا دیں۔
”خاموش بدتمیز۔“ فواد راشد غصے سے
بولے۔

”بھابھی! پلیز یہ وقت ان باتوں کا نہیں
ہے۔“ فیصل نے بھی نرمی سے اسے کہا تو وہ
بولی۔
”فیصل بھائی! یہی تو وقت ہے ان باتوں کو
کرنے کا۔“

نہیں ہوگی انہوں نے بھی کم دکھ نہیں دیئے امی کو،
ابو! ابھی بھی وقت ہے سنبھل جائیں، سدھر
جائیں، ایسا نہ ہو کہ مہلت ختم ہو جائے اور توبہ
کے دروازے آپ پر بند ہو جائیں، زندگی میں
ہی قصومعاف کروا لینے چاہیں ورنہ آخرت میں
کوئی معافی نہیں ملتی۔“ مزمنہ یہ کہہ اٹھ کھڑی ہوئی
تو وہ اسے دیکھ کر بے چینی سے پوچھنے لگے۔
”کہاں جا رہی ہو؟“

”باہر جا رہی ہوں سورج نکل آیا ہے پتا
نہیں صبح کب ہوگی؟“ مزمنہ نے انہیں دیکھتے
ہوئے معنی خیز جواب دیا اور وہاں سے باہر چلی
گئی، فیصل بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔
”مزمنہ بھابھی! ایک بات پوچھوں آپ
سے؟“

”پوچھیں۔“
”جب آپ ساری سچائی جانتی تھیں تو آپ
بھی جانتی ہوں گی کہ حمدان آپ سے بے حد
محبت کرتا ہے۔“
”جی جانتی ہوں۔“ وہ گہرا سانس لے کر
بولی۔

”پھر بھی آپ نے حمدان کے ساتھ برا،
بدتمیزانہ رویہ اپنانے رکھا، کیوں؟“ فیصل نے
اس کے ساتھ چلتے ہوئے سوال کیا۔

”کیونکہ میں جانتی تھی کہ حمدان تنگ آکر
مجھے چھوڑ دیں، میں ایک دھوکے باز انسان کی بیٹی
کی حیثیت سے ساری زندگی حمدان کے سامنے
نظریں جھکا کر نہیں جی سکتی۔“ اس نے جج بجا
دیا۔

”لیکن آپ کے روڈی بیویئر کے باوجود
آپ کے اندر کی سچائی، اچھائی اور خوبصورتی کو
جانتا ہے، پہچانتا ہے، اسے یقین ہے کہ قدرت
نے آپ کی صورت میں اسے ”کہ کوہ نور“ عطا کیا

پاور آف انارنی حاصل کی، آپ کے ظلم کا بدلہ
انہوں نے آپ کی بیٹی پر ظلم کر کے لینا شروع کر
دیا یہاں تک کہ اسے جلا کر مارنے کی کوشش بھی
کی، صرف اور صرف آپ کی وجہ سے ابو!“

”خاموش ہو جاؤ، اس کے سامنے بولے جا
رہی ہو۔“ فواد راشد شپٹا کر بولے تو اس نے
فیصل پر ایک نگاہ ڈالی وہ جو اس کی باتیں سن کر
حیرت میں ڈوبا ہوا تھا، نگاہیں چرا گیا۔

”فیصل بھائی سے مت ڈریں کیونکہ یہ
سب کچھ جانتے ہیں، اللہ جی سے ڈریں ابو!
کیونکہ وہ بھی سب کچھ جانتے ہیں، ہم سب
جانتے ہیں کہ آپ نے کس طرح اور کس کے
ذریعے یہ پراپرٹی حاصل کی ہے، لیکن آپ پراگر
ابھی تک ہاتھ نہیں ڈالا گیا تو اس کی وجہ حمدان
یوسف کی اعلیٰ ظرفی ہے، اسے محبت ہے مجھ سے،
عزت کرتا ہے وہ میری ماں کی اسی لئے ان
رشتوں کی محبت اور احترام میں اس نے آپ کو
ابھی تک قانون کے حوالے نہیں کیا حالانکہ اس
کے پاس ثبوت بھی موجود ہیں۔“ مزمنہ نے انہیں
شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ان کے تو
پسینے چھوٹ گئے، ان کی چوری پکڑی گئی ہے یہ
خیال انہیں پریشان کر رہا تھا وہ اپنا آپ قید میں
جیل کی سلاخوں کے پیچھے محسوس کرتے ہوئے
بے بسی سے چیخنے۔

”بکواس بند کرو، میں نے کوئی فراڈ نہیں کیا
سمجھیں تم۔“

”میں تو سمجھ گئی ہوں، کاش آپ بھی اب
سمجھ جائیں اور بیٹھے کیوں ہیں پلیز جائیں جا کر
نوٹوں کی گڈیاں لائیں اور دادا جی کے بے جان
وجود پر رھیں شاید ان میں جان پڑ جائے، اور دعا
کریں کہ امی جلدی ہوش میں آجائیں اور دادا
جی کو معاف کر دیں ورنہ دادا جی کی مشکل آسان

لائے تاکہ دادا جی کو اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھا سکیں۔“ مزمنہ نے فیصل کی طرف دیکھ کر تیزی سے کہا وہ اس کی سمجھداری اور قوت فیصلہ پر حیران رہ گیا۔

”کیا کر رہی ہو تم اباجی کی حالت خراب ہے اور تم انہیں مزید مشکل میں ڈال رہی ہو۔“ فواد راشد تیزی سے بولے لہجے میں غصہ تھا لیکن مزمنہ ان کی بات کو بے اثر کرتے ہوئے بولی۔

”میں ان کی مشکل کم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور پلیز مجھے یہ کام کرنے دیں ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے۔“ فیصل اس کی بات سمجھ گیا اسی لئے فوراً گیا اور وارڈ بوائے وہیل چیئر کے ساتھ لے آیا ساتھ ہی ڈاکٹر سے اجازت بھی لے آیا تھا راشد بیگ کو صابرہ سے ملوانے کے لئے اور وہ انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر صابرہ کے پاس لے گئے۔

”اباجی!“ صابرہ انہیں وہیل چیئر پر ایسی معذوری کی حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”بہو..... معاف..... ف کر..... دے۔“ راشد بیگ نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں صابرہ سے معافی مانگتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ معافی کی غرض سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

”اباجی! یہ..... کیا کر رہے ہیں آپ؟“ صابرہ بمشکل بول پائیں، مزمنہ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی! دادا جی معاف مانگ رہے ہیں انہوں نے آپ کے ساتھ آج تک جو بھی مٹھی روپیہ رکھا اس کے لئے انہیں معاف کر دیں تاکہ ان کی تکلیف کم ہو سکے۔“

”آپ کو..... میں نے ہمیشہ اپنے باپ کی جگہ..... سمجھا ہے اباجی! مجھ سے معاف مانگ کر..... گناہ گار مت کریں مجھے..... پھر بھی اگر

ہے اور وہ اس ہیرے کو گنوانے کی حماقت کبھی نہیں کرے گا۔“ فیصل نے پر یقین لہجے میں کہا تو وہ بنا کوئی جواب دیئے آئی سی یو کی جانب بڑھ گئی، فیصل نے مزمنہ کو فواد راشد سے کبھی ہوئی ساری باتیں اپنے موبائل فون میں ریکارڈ کر لی تھیں وہ اس نے حمدان یوسف کو سینڈ کر دیں اور اسے فون کر کے ساری صورتحال سے آگاہ بھی کر دیا۔

☆☆☆

صابرہ کو ہوش آ گیا تھا پورے بیس گھنٹے بعد انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں، مزمنہ سجدہ شکر بجا لائی تھی، راشد بیگ بھی ہوش میں آ گئے تھے لیکن ٹھیک سے بات نہیں کر پا رہے تھے، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، مزمنہ اور فواد راشد دکھ اور بے بسی سے انہیں دیکھ رہے تھے، فیصل بھی۔

”ص..... صا..... برہ۔“ راشد بیگ نے بمشکل صابرہ کا نام لیا تو مزمنہ نے انہیں بتایا۔

”امی کو ہارٹ ایٹک ہوا تھا الحمد للہ، اب ہوش میں آ گئی ہیں، ابھی آئی سی یو میں ہیں وہ۔“ ”شکر۔“ راشد بیگ کی زبان سے نکلا۔

”دادا جی! آپ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں امی سے تو کہہ دیں میں ان تک آپ کا پیغام پہنچا دوں گی۔“ مزمنہ ان کی حالت کو سمجھتے ہوئے سنجیدہ مگر نرم لہجے میں بولی۔

”دل..... لے چلو..... ص..... صا..... برہ کے..... پاس۔“ راشد بیگ نے ایک ایک کر کے بمشکل اپنی بات کہی۔

”اباجی! آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ بستر سے اٹھ سکیں۔“ فواد راشد نے انہیں دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”فیصل بھائی! آپ وارڈ بوائے سے کہیے وہ وہیل چیئر لے کر آئے ساتھ کسی اور ساتھی کو بھی

اسی شام مغرب اور عشاء کے درمیان راشد بیک کا انتقال ہو گیا، وہ جو سانس اٹکی تھی تب تک معافی اور توبہ نے وہ سانس نکلنے میں آسانی پیدا کر دی تھی، اگلی صبح دس بجے راشد بیک کی نماز جنازہ ادا کر دی گئی، صابرہ کو فی الحال ان کے انتقال کی خبر نہیں دی گئی تھی ان کی، مرنے کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی، مسلسل دکھ، صدمے اور نیند کی کمی نے اسے ادھ موا کر دیا تھا، عائشہ رضا کو ساری خبریں مل رہی تھیں، فواد راشد اور فیصل نے پہلے ہی ملازموں کو عائشہ رضا کا خیال اور کم ان پر نظر رکھنے کا کہا ہوا تھا اور حمدان کے آنے سے پہلے انہیں گھر سے باہر جانے کی اجازت بھی نہیں دی تھی، عائشہ رضائے گھر پر اپنے وکیل کو بلوایا تھا جو ان کے کہنے کے مطابق طلاق کے کاغذات تیار کر کے انہیں دے گیا تھا، عائشہ رضائے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ حمدان یوسف کے واپس آتے ہی اس سے طلاق کے ان پیپرز پر سائن کروا کر طلاق نامہ مرنے کے ہاتھ میں دیں گی اور اپنے گھر سے باہر نکال دیں گی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

ادھر فلائیٹ کینسل ہو جانے کے باعث حمدان یوسف کو واپسی پر دوہنی میں مزید دو دن لگ گئے، وہ فیصل سے پل پل کی رپورٹ لے رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑا کر وہ مرنے کے پاس پہنچ جاتا، اسے احساس تھا کہ ان حالات میں اسے مرنے کے پاس ہونا چاہیے تھا مرنے کو اس کی بہت ضرورت تھی اس وقت، مگر وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھا فلائیٹ نہ ملنا بھی ایک مسئلہ تھا۔

”مرنہ بیٹی! تم نے جو کہا صحیح کہا، مجھے احساس دلا دیا ہے تم نے کے میں غلط تھا ہمیشہ سے غلط تھا، میں نے بھی بھی رشتوں کو اہمیت ہی نہیں دی وہ رشتے جو میں نے اللہ اور اس کے

آپ کو سکون ملتا ہے تو..... میں نے آپ کو دل سے معاف کیا۔“ صابرہ نے تھکے تھکے کمرور لہجے میں رک رک کر کہا تو راشد بیک نے روتے ہوئے آنسوؤں کے ذریعے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کے سر پر اپنا بایاں ہاتھ شفقت سے رکھ دیا، صابرہ کو آج پہلی ان کا دست شفقت اپنے سر پر محسوس ہوا تھا فرط جذبات سے ان کے بھی آنسو بہنے لگے تھے، فواد راشد باہر کھڑے بہ منظر دیکھ رہے تھے، صابرہ کی حالت میں انہیں اپنی زیادتیوں کی پوری فلم چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور راشد بیک میں انہیں اپنا مستقبل قریب دکھائی دے رہا تھا، عجیب طرح کی بے قراری، احساس زیاں اور شرمندگی کا احساس انہیں بری طرح سے چوکے لگا رہا تھا، بے چینی احساس جرم انہیں ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر کے کوڑے مار رہا تھا۔

گیا عمر بھر کا غرور بھی
گئی زندگی کی بساط بھی
نہ وہ سب ملا جو تھا

تیری چاہ
نہ تو سنگ اپنے لے کہ جاسکا
وہ جو مال و زر تھا
پڑا رہا
وہ جو حیثیت کا غرور تھا

سب دھرا رہا
گیا ہاتھ خالی تو اس طرح
کے موت ہنس کر امر ہوئی
تیرے قول و فعل میں جو زہر تھا
تیری گورتک میں اتر گیا
تیری موت کب کی تھی ہو چکی
کہا کس نے اب یہ
کہ تو مر گیا؟

بھیگتے لہجے میں جواب دیا۔

”یا اللہ! ابا جی چلے گئے، مجھے کیوں نہیں بتایا کسی نے؟“ صابرہ نے ہمیشہ راشد بیک کو اپنے باپ کا درجہ دیا تھا، ان کے انتقال کی خبر سے انہیں شک لگا تھا۔

”امی! ڈاکٹر نے منع کیا تھا آپ کی کنڈیشن ایسی نہیں تھی کہ آپ کے دادا جی کی موت کی خبر دی جاتی، اللہ کی یہی مرضی تھی امی، آپ خود کو سنہالیں اور شکر ادا کریں کہ آپ نے انہیں معاف کر کے ان کا آخری سفر آسان کر دیا۔“ مرنے والے کا ہاتھ تھام کر نرمی سے بولی صابرہ رو رہی تھیں۔

”میں نے ہمیشہ ابا جی کو اپنا باپ سمجھا کبھی ان کے سامنے زبان نہیں کھولی۔“ صابرہ نے روتے ہوئے دھکی لہجے میں کہا تو فواد راشد بولے۔

”میں جانتا ہوں صابرہ! بس ہم نے جاننے، ماننے اور پہچاننے میں بہت دیر کر دی، تمہاری عمر کے سنہری سال تمہیں دکھ دیتے گزار دیئے، تمہاری خوشیوں کے لمحوں کو غموں کی جلتی دوپہر میں بدل دیا، تمہاری ہنسی کو آنسوؤں میں تبدیل کر دیا، تمہاری مسکراہٹ نوچ کر پھینک دی، بہت ظلم کیا ہم نے خاص کر میں نے، تمہارا شوہر ہونے کا حق فرض ادا نہیں کر سکا، مجھے معاف کر دو صابرہ، خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔“ فواد راشد ندامت آمیز لہجے میں بولتے ہوئے رو پڑے، صابرہ بیگم بہت دکھ اور تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ۔

”یہ وہ شخص ہے جو ساری زندگی فرعون بنا رہا اور آج ایک بھکاری بنا کھڑا ہے میرے سامنے معافی کی بھیک مانگ رہا ہے، میرے پھیلے

رسول صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گواہ بنا کر قائم کیا اس کی کبھی دل سے عزت نہیں کی، میں تمہیں تمہاری ماں کو ہمیشہ بوجھ سمجھا، فرض اور ذمے داری کو بوجھ اور مصیبت سمجھتا رہا اور تم دونوں پر خرچ کر کے احسان جتا تا رہا، جبکہ یہ میرا فرض تھا کہ میں اپنی بیوی اور بیٹی کی کفالت کروں، میں نے تمہاری محبت اور تمہاری ماں کی محبت و خدمت کو جوتے کی نوک پر رکھا ہمیشہ، اللہ مغفرت کرے ابا جی کی، انہوں نے بھی مجھے کبھی تم دونوں کے ساتھ نا انصافی کرنے پر نہیں ٹوکا، کیونکہ وہ تو خود اپنی بیوی اور میری ماں کے ساتھ ساری زندگی یہ نا انصافی کرتے چلے آئے تھے، میں بھی یہی سب دیکھ کر پروان چڑھا تھا، میں نے بھی عورت کی عزت نہیں کی اپنے باپ کی طرح، لیکن میں نہیں چاہتا کہ میں بھی ابا جی کی طرح مروں، اس لئے اپنی زندگی میں پورے ہوش و حواس میں اپنی زیادتیوں، غلطیوں، نا انصافیوں کی معافی مانگنا چاہتا ہوں تم سے بھی اور تمہاری ماں سے بھی، تم دونوں مجھے معاف کر دو، میں بہت نادم ہوں اپنے کیے پر۔“ مرنے ہو سہل میں صابرہ کے پاس بیٹھی تھی وہ کافی بہتر محسوس کر رہی تھیں، آج انہیں ایک دن پہلے روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا، فواد راشد نے ان دونوں کے سامنے آ کر اپنی شرمندگی کا اظہار اور اعتراف جرم کرتے ہوئے معافی کے لئے ان کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے، وہ دونوں حیرت زدہ تھیں۔

”ابا جی! کیا ہوا ابا جی کو؟“ صابرہ کی سماعتوں میں فواد راشد کا جملہ گونج رہا تھا۔

”اللہ مغفرت کرے ابا جی کی۔“

”ابا جی کا انتقال ہو گیا صابرہ، وہ تم سے معافی مانگنے کے چند گھنٹوں بعد رخصت ہو گئے اس دنیا سے کل ابا جی کا سوگم تھا۔“ فواد راشد نے

جانب آ کر دراز کھولی تھی اپنی ڈائری نکالنے کے لئے مگر ڈائری وہاں موجود نہ تھی، مزمنہ نے تمام دراز کھول کر اچھی طرح چیک کر لئے مگر ڈائری نہ ملتی تھی سو نہ ملی۔

”کیا تلاش کر رہی ہیں دلہن بی بی!“
نسرین اس کے لئے جوس لے کر آئی تھی، اسے یوں کچھ ڈھونڈتے دیکھ کر پوچھ لیا۔
”میری ڈائری رکھی تھی یہاں میں اب مل نہیں رہی۔“

”اچھا، کمرے میں اس دن کے بعد سے کوئی بھی نہیں آیا تھا رات میں آپ کے ابو آئے تھے وہ بھی اس رات ہی جب کمرے میں آگ لگی تھی۔“ نسرین نے جوس کا گلاس اس کی جانب بڑھا کر جواب دیا۔

”کہیں ابو نے تو نہیں ڈائری نکال کر پڑھ لی، اوہ شیٹ۔“ مزمنہ نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”آپ ساتھ والے کمرے میں جا کر آرام کر لیں یہاں تو آرام نہیں ہو سکے گا، آپ کہیں تو میں آپ کا سامان ساتھ والے کمرے میں رکھ دوں؟“ نسرین کو اس سے دلی ہمدردی تھی اس لئے احساس کرتے ہوئے پوچھا تو کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ہوں، نہیں آپ ایسا کریں ڈریننگ روم میں سے میرا بیگ اور سوٹ کیس اٹھا لائیں اور میرے کپڑے جوتے اس میں پیک کر دیں۔“
”تو کیا آپ سچ سچ یہاں سے جا رہی ہیں؟“

”جانا تو ہوگا اور ابھی امی کو میری ضرورت ہے میں ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں باقی میری ساس نے تو مجھے طلاق دلوانے کا منصوبہ تیار کر ہی لیا ہے، پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں؟ طلاق نامہ

ہوئے ہاتھوں پر آج خدا کو ترس آ ہی گیا جیسی تو مجھ پر ظلم کرنے والا ہاتھ جوڑے کھڑا ہے میرے سامنے۔“

”صابرہ!“ فواد راشد کی آواز پر وہ اپنی سوچوں کے گرداب سے باہر نکل آئیں۔
”میں نے آپ کو اپنے اللہ کی رضا کے لئے معاف کیا، اللہ بھی آپ کو معاف کرے۔“

”شکریہ صابرہ! بہت بہت شکریہ، دیکھنا اب میں سب ٹھیک کر دوں گا بہت عزت سے نبھاؤں گا یہ رشتہ عزت سے اور محبت سے۔“ فواد راشد نے متشکر لہجے میں کہا اور مزمنہ کے سر پر پہلی بار محبت و شفقت سے دست شفقت رکھا تو صابرہ کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہہ نکلے۔

”آج یہ یقین اور بھی مضبوط ہو گیا کے سجدے اور آنسو بھی رائیگاں نہیں جاتے۔“ صابرہ نے دل میں کہا اور سکون سے آنکھیں موند لیں۔
صابرہ اور فواد راشد نے مزمنہ کو آرام کرنے کی غرض سے گھر بھیج دیا تھا، عائشہ رضا اسے دیکھنے ہی آگ بولہ ہو گئیں۔

”یہاں کیا لینے آئی ہو؟“
”لینے نہیں آئی بلکہ کچھ دینے آئی ہوں لیکن حمدان کے آنے پر ہی دوں گی۔“ مزمنہ نے بہت سکون سے جواب دیا۔

”حمدان بھی آنے پر تمہیں کچھ دے گا۔“

”کیا؟“
”طلاق۔“
”اچھا!“ وہ ہنس پڑی۔

”تو شوق سے دے طلاق اس کے ساتھ رہنا کون چاہتا ہے۔“ انہیں حیرت مزمنہ اپنے ادھ جلع کمرے میں چلی آئی جہاں سب ویسے ہی پڑا تھا جیسا وہ چھوڑ گئی تھی، اس نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور پھر سائیڈ ٹیبل کی

تو میرے میکے بھی بھجوا یا جاسکتا ہے۔“ وہ جوس کا سیپ لے کر خالی پن سے بولی۔

”اللہ نہ کرے دلہن لی بی کے آپ کو طلاق ہو مجھے یقین ہے حمدان بابا بھی آپ کو طلاق نہیں دیں گے۔“ نسرین نے بے چین ہو کر کہا۔

”یہ یقین تو مجھے بھی ہے لیکن، خیر چھوڑیں آپ میرا سوٹ کیس اور بیگ تیار کر دیں میں جوس ختم کر کے شادریوں کی پھر کچھ دیر سوؤں گی اگر نیند مہربان ہوگئی تو۔“ مزمنہ نے تھکے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا اور جوس ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

مزمنہ خود کو ہر طرح کی صورت حال کے لئے تیار کر چکی تھی، وہ سب کچھ جانتی تھی کہ اس کے باپ نے فراڈ کیا تھا یوسف رضا کے ساتھ عائشہ رضا کا بدلنا اسے برداشت کرنا ہی تھا کیونکہ اس سب میں انہوں نے اپنا شوہر کھویا تھا ان کا غصہ ان کا انتقام بجا تھا، وہ مردوں سے نفرت کرتی تھی یہ بھی سچ تھا لیکن اب اسے حمدان یوسف جیسے مہذب مرد سے محبت ہوگئی تھی یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت تھی، وہ ان سارے حقائق کو جانتے، مانتے اور سمجھتے ہوئے آج تک اپنے جذبات و احساسات کو اپنے اندر ہی دبائے رکھنے پر مجبور رہی تھی یا اپنی ڈائری کے سینے میں کچھ درد بھرے حقائق کو رگم کر کے اپنے اندر کی گھٹن کچھ کم کر لیا کرتی تھی، کسی سے بات کر، بات کہنا اس کے اختیار میں تھا ہی کہا تھا، وہ ان سب حالات کے ساتھ اب اپنی پاں کی بیماری، دادا کی وفات سے بھی بری طرح بکھر چکی تھی خود کو سنبھالے ہوئے تھے، مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔

کیونکہ ابھی تو ایک معرکہ سر ہوا تھا دادا اور باپ کو اپنے رویوں کی بد صورتی کا احساس ہو گیا

تھا، انہوں نے معافی مانگ لی تھی، دوسرا معرکہ سر کرنا ابھی باقی تھا اور وہ تھا حمدان یوسف سے علیحدگی اختیار کرنے کا، اسے اس کی امانت واپس لوٹا کر وہ خود بھی اس کی زندگی سے واپس لوٹ جانا چاہتی تھی، گو کہ اس کھیل میں دل کا زیاں تھا بہت، مگر اسے اس احساس زیا کے ساتھ جینا تھا، وہ ہر پہلو پر سوچ رہی تھی، نیند تھی کے پلکوں کے کناروں پہ قدم دھرنے کو بھی تیار نہ تھی، وہ ایک اعصاب شکن صورتحال سے دوچار تھی، سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، آنکھیں جاگنے رونے سے سرخ، سوجی ہوئی تو تھیں ہی، جلن بھی محسوس کر رہی تھیں، بہت دیر کروٹیں بدلنے کے بعد بھی جب نیند نہ آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، دوپین لکر کھائیں پانی پیا اور باہر لان میں چلی آئی جہاں ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی فضا میں ہلکی سی پیش بھی مگر ہوا کا مزاج ٹھنڈا تھا مزمنہ کو قدرے آرام محسوس ہوا وہاں آپ کر سیاہ شلوار، ڈارک براؤن، سیاہ دھاگے کے کام قمیض اور سیاہ دوپٹے میں سلکی سیاہ بالوں کو ہیر پینڈ میں مقید کیے وہ اداسی اور دکھ کا مجسمہ دکھائی دے رہی تھی۔

حمدان یوسف چند منٹ پہلے ہی گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا اور پہلی نظر لان میں کھڑی مزمنہ پر ہی پڑی تھی جسے دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا، اسے یاد آ رہا تھا جب اس نے پہلی بار مزمنہ کو اپنے گھر میں دیکھا تھا تو تب وہ بھی لان میں اسی جگہ کھڑی تھی لیکن تب میں اور اب میں بہت فرق تھا، تب وہ بہت تر و تازہ، دلکش، معصوم پھول کی طرح مسکرا رہی تھی زندگی سے بھرپور دکھائی دے رہی تھی اور آج، آج وہ کھڑی تو اسی جگہ تھی مگر زندگی کے دیئے دکھوں سے آزرده، غمزدہ اور تنہا دکھائی دے رہی تھی، فیصل کی زبانی حمدان یوسف کو یہاں ہونے والے ہر معاملے کی خبر ملتی رہی

تھی وہ پل پل کی خبر سے واقف تھا اور مزہ کی ہمت، جو صلے اور تحمداری کا دل معترف ہو گیا اور اس کے عشق میں پور پور ڈوب چکا تھا اور عاکشہ رضا کے عمل نے اسے گہرے دکھ و ندامت سے بھی دوچار کیا تھا۔

”مزہ!“ حمدان یوسف نے اس کے قریب پہنچ کر پکارا۔
”آپ..... آ گئے۔“ مزہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

”ہاں..... کاش! میں گیا ہی نہ ہوتا۔“
”جب جب جو جو ہونا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔“ مزہ نے مدھم لہجے میں کہا۔
”دادا جی کی وفات کا بہت دکھ ہے مجھے۔“ وہ دل سے بولا۔

”مجھے بھی۔“
”لیکن اچھی بات یہ ہے کہ وہ معافی مانگ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔“ حمدان یوسف نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہوں، انسان کو اپنی زندگی میں ہی معافی مانگ لینی چاہیے ورنہ قضا کے بعد بخشش مشکل ہو جاتی ہے، بچھتاؤے کی موت جہنم کی طرف لے جانی ہے، اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی مجھے میری زندگی میں ہی معاف کر دیں۔“ مزہ نے دھیمے مگر نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔

”مزہ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“
”ٹھیک کہہ رہی ہوں، میں نے بہت دکھ دیئے ہیں آپ کو، بہت روڈ لی بی جو کیا ہے آپ کے ساتھ، آپ کو وہ عزت، وہ اپنائیت و محبت نہیں دی جو ایک بیوی ہونے کے ناطے مجھ پر فرض تھی، وہ غرور، غصہ، کدو فر، بد تمیزی سب اس

لئے نہیں تھا کے میں خود کو آپ کی پراپرٹی کی مالک سمجھتی تھی یہ سب کل بھی آپ کا تھا اور آج بھی آپ ہی کا ہے وہ سب کسی اور وجہ سے تھا، بہر حال اب وہ وجہ بھی نہیں رہی، آپ ایک اچھے انسان ہیں اس لئے امید رکھتی ہوں کہ آپ اعلیٰ ظہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے معاف کر دیں گے۔“ مزہ نے بڑے حوصلے سے اپنی بات مکمل کی تھی، اس کی آنکھوں کی نمی، لہجے کی بے بسی، آواز کی لرزش حمدان یوسف کے دل کے کانوں نے سنی اور محسوس کی تھی، اس کا دل چاہا کہ وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمو کر اپنے محبت بھرے سینے میں چھپالے۔

”اور اگر میں معاف نہ کروں تو؟“
”تو آپ کی مرضی، حق ہے آپ کا لیکن آپ میرے والد کی طرح کے مرد تو نہیں ہیں نا، تو معاف کر دیجئے گا مجھے میری زندگی میں ہی، آپ کو بھی بعد میں بچھتاؤا نہیں ہوگا۔“ مزہ نے گہرا سانس لے کر خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”واٹ ڈو یو مین بعد میں؟ مجھے تمہارے بعد نہیں تمہارے ساتھ جینا ہے سنا تم نے، خبردار، جو دوبارہ ایسی بات کی ہو۔“ حمدان یوسف نے اسے شانوں سے پکڑ کر اس کے چہرے کو محبت اور بے قراری سے دیکھتے ہوئے تڑپ کر کہا۔
”اوکے لیکن۔“ مزہ نے کچھ بولنا چاہا حمدان یوسف نے اس کے لبوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ دی۔

”تم چاہتی ہو کہ میں مرجاؤں؟“
”اللہ نہ کرے۔“ اس نے بے اختیاری میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے قرار لہجے میں کہا تو حمدان یوسف کو اپنے لئے اس کی محبت روح کی گہرائی تک اترتی محسوس ہوئی تھی۔

کرنے کا آرڈر بھی دے دیا۔

عائشہ رضا سوری تھیں، جب نیند سے بیدار ہو کر لاؤنچ میں آئیں تو حمدان یوسف کو وہاں بیٹھا دیکھ کر چوٹیں وہ چائے پی رہا تھا اور شاید کہیں جانے کے لئے بھی تیار تھا۔

”حمدان!“ عائشہ رضا نے اسے مخاطب

کیا۔

”السلام علیکم می! کیسی ہیں آپ؟“ حمدان

یوسف نے انہیں دیکھتے ہوئے وہیں بیٹھے بیٹھے سلام کیا تھا، ہمیشہ کی طرح ان کے پاس جا کر نہیں ملا اور یہ بات عائشہ رضا نے فوراً محسوس کی تھی، جیسی فوراً پوچھا۔

”وعلیکم السلام! تم ماں سے ملو گے نہیں؟“

”نہیں، کیونکہ میری ماں نے مجھے خود سے

نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ وہ چائے کا

کپ میز پر رکھ کر گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے

جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

”حمدان! تم ہوش میں تو ہو، کچھ اندازہ بھی

ہے تمہیں کے کیا کہہ رہے ہو؟“ عائشہ رضا غصیلے

لہجے میں بولیں۔

”میں تو ہوش میں ہوں می، لیکن آپ نے

ہوش و خرد کی ساری حدیں پار کر لیں، میں سوچ

بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس حد تک جا سکتی ہیں

آپ نے مزہ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے نا، اس

نے میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے، مزہ سے نظریں

ملانے کے لائق نہیں رہا میں۔“ حمدان یوسف

نے دھکی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا اور

سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

”کہاں جا رہے ہو تم؟“ عائشہ رضا نے تیز

آواز میں پوچھا۔

”مزہ کو دیکھنے جا رہا ہوں اگر وہ جاگ گئی

ہیں تو انہیں اپنے ساتھ ہسپتال لے کر جاؤں گا

تیرے ہونے سے سانس چلتی ہے بس مجھے اتنا پیار ہے تجھ سے حمدان یوسف نے اس کے نشیمنی رخساروں پر آنکھوں کی کان سے گرتے بہرے جیسی اشک اپنے ہاتھوں کی پوروں سے چنتے ہوئے یہ شعر بہت جذب سے پڑھا۔

اسی وقت عصر کی اذان شروع ہو گئی تو حمدان

یوسف اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ اذان بھی میرے جذبوں اور تمہارے

آنسوؤں کی سچائی کی گواہی دے رہی ہے، محبت

سے فرار، محبت سے انکار بھی کفرانِ نعمت ہے اور

محبت بھری نعمتوں کو اعزاز کی طرح حاصل کیا جاتا

ہے یہ بات تم سے بہتر اور کون جان سکتا ہے؟“

حمدان یوسف نے بہت محبت سے اس کے آنسو

صاف کیے اس کی جھکی ہوئی بھیگی پلکوں کو چوما اور

اسے حیرت میں ڈوبا دیکھتے ہوئے خوشدلی سے

مسکرا دیا اور اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو جمائل

کر کے محبت سے بولا۔

”آؤ اندر چلیں، کب سے سوئیں ناں تم؟

اب میں آ گیا ہوں تم بے فکر ہو کر سونا میں سب

کام دیکھ لوں گا ڈونٹ وری، میں ہوں ناں۔“

”جی!“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

حمدان یوسف کی اتنی محبت، مہربانی اور

احساس پر فطر مسرت و تشکر سے اس کی آنکھیں

بار بار موتی لٹانے لگتیں، حمدان یوسف اسے

دوسرے کمرے میں لے گیا تھا، ملازم نے اس کا

سامان بھی اسی بیڈ روم میں پہنچا دیا تھا، وہ مزہ کو

بیڈ پر لٹا کر آرام کرنے کا کہہ کر خود فریض ہونے

چلا گیا، واپس آ کر نسرین کی زبانی ساری

صورتحال سے آگہی حاصل کی، اپنے اور مزہ کے

اس بیڈ روم کا جائزہ لیا جہاں عائشہ رضا نے آگ

لگائی اور کمر اہلے کی طرح بالکل نئے جیسا تیار

صابرہ آنٹی کے پاس۔“ اس نے رک کر جواب دیا تو وہ فوراً بولیں۔

”تمہیں کیا ضرورت ہے مزہ کو ہوسٹل لے کر جانے کی اسے تم اس کے میکے بھیجو، فارغ کرو اسے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے؟“ وہ واپس پلٹا۔

”میں نے طلاق کے پیپرز بنوا لئے تھے تم ان پیپرز پر دستخط کرو اور اس لڑکی کے منہ پر مارو، نکالو اسے اس گھر سے میں اسے اپنی بہو کے روپ میں مزید برداشت نہیں کر سکتی سنا تم نے حمدان!“ عائشہ رضوانے تیز اور زہریلے لہجے میں کہا۔

”تو آپ بھی سن لیں می! کے میں مزہ کو ہی اپنی شریک حیات کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں ہمیشہ میں اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، آپ یہ بات بھول جائیں کے میں بھی مزہ کو طلاق دوں گا۔“ حمدان یوسف نے فیصلہ کن اور اٹل لہجے میں جواب دیا۔

”وہ خود بھی تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔“

”آپ اس کی فکر مت کریں میں اسے منا لوں گا، راضی کر لوں گا۔“ حمدان یوسف نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اپنی ماں کو ناراض کر کے تم ایسا کرو گے یاد رکھنا حمدان! ماں کی نافرمانی اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔“

”آپ بھی یہ بات مت بھولیں می کے طلاق اللہ کا سب سے ناپسندیدہ فعل ہے، دل آزادی، جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے، اللہ اپنے حقوق تو معاف کر دے گا لیکن اپنے بندوں کے ساتھ کی گئی زیادتیاں اور ظلم معاف نہیں کرے گا،

اس لئے بہتر یہی ہوگا کے آپ بھی اپنی غلطی تسلیم کر لیں اور مزہ سے معافی مانگ لیں۔“ حمدان یوسف نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے انہیں مشورہ دیا، وہ نخوت سے سر جھٹک کر بولیں۔

”ہونہہ، میں اس لڑکی سے معافی مانگوں گی، مائی فٹ، تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں نے کہا ہے۔“

”سوری می، میں کسی غلط کام میں آپ کا کہا نہیں مانوں گا آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

”ماں کا کہا اب غلط ہو گیا، ماں کا ساتھ دینا مشکل لگنے لگا ہے اسے میں بھی دیکھتی ہوں کے کیسے میری بات نہیں مانتا؟“ عائشہ رضا غصے سے بڑبڑاتی ہوئی طلاق کے تیار شدہ پیپرز لینے کے لئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

حمدان یوسف کمرے میں داخل ہوا تو اس کی نظر جائے نماز پر پیٹھی مزہ پر پڑی وہ تسبیح پڑھ رہی تھی، اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دعا مانگتے ہوئے خوب روئی ہے، حمدان یوسف اسے دیکھتے ہوئے وہیں بیٹھ کے کنارے پر بیٹھ گیا اور اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا، جو بھی وہ فارغ ہوئی اور جائے نماز تہہ لگانے لگی تو حمدان یوسف بولا۔

”سوئی نہیں آپ؟“

”ایسے حالات میں نیند کہاں آتی ہے؟“ مزہ نے جائے نماز ایک طرف اسٹول پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں، یہ بھی ہے لیکن آپ سوئیں گی نہیں تو آپ کی طبیعت بھی خراب ہو جائے گی اور میں آپ کا بیمار ہونا فوراً نہیں کر سکتا۔“ حمدان یوسف کا دل جب اس کے لئے بے حد عزت و محبت سے بھرا ہوتا تب وہ اسے آپ کہہ کر مخاطب کرتا

تھا اور تم اس وقت کہتا جب وہ اپنے جذبوں کے اظہار میں بے اختیار ہو جاتا تھا۔
”کیوں؟“ مزمنہ نے اسے دیکھتے ہوئے

دئے، حمدان یوسف بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔
عائشہ رضا ہاتھ میں طلاق کے کاغذات لئے
ان کے کمرے کے باہر موجود تھیں۔

”حمدان! یہ لڑکی کیا کر رہی ہے اس گھر میں
اس نے تمہاری ماں کو جلا کر مارنے کی کوشش کی
تھی مجھے اپنے کمرے میں یہ کہہ کر بلایا کے اکیلے
میں ڈر لگتا ہے آپ میرے کمرے میں سو جائیں
اور مجھے سلا کر خود یہاں چلی گئی آگ لگا کر وہ تو
میری آنکھ کھل گئی جو میں بیڈ پر آگ دیکھ کر کمرے
سے باہر نکل گئی ورنہ اس لڑکی نے تو مجھے مارنے
میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ عائشہ رضا نے
مزمنہ کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے من گھڑت
کہانی سنا ڈالی، مزمنہ حیرت، دکھ اور تاسف زدہ
نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، حمدان یوسف کو
مزمنہ کے چہرے کے تاثرات اس کے دلی
جذبات و کیفیت کا حال بتا رہے تھے۔

”ممی! آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی
ہیں؟“ حمدان یوسف نے افسوس بھری نظروں
سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہٹ دھرمی سے
بولیں۔

”میں وہی کہہ رہی ہوں جو سچ ہے تم اس
لڑکی سے پوچھتے کیوں نہیں ہو؟ آگ کیوں لگائی
تھی اس نے؟“

”ممی! سچ کیا ہے یہ آپ بھی جانتی ہیں یوں
چیخ چلا کر آواز بلند کرنے سے بات میں وزن پیدا
نہیں ہوتا بلکہ آپ کی ذات کا وزن ہلکا ہو جاتا
ہے آپ کی اوقات کا پتا چل جاتا ہے۔“ حمدان
یوسف نے بہت سنجیدہ لہجے میں مدہم آواز میں کہا
تو وہ مزید بھاؤ کھانے لگیں۔

”حمدان! تم اپنی ماں سے اس طرح کی
باتیں کر رہے ہو وہ بھی اس دو نکلے کی لڑکی کی وجہ
سے نکالو اسے میرے گھر سے، ابھی طلاق دو

یونی پوچھ لیا۔
کیونکہ مجھے عشق ہے، تیری ذات سے
تیری بات سے، تیرے ساتھ سے
حمدان یوسف نے اس کے روبرو دکھڑے ہو
کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا،
مزمنہ اس کی اس بات پر ان حالات میں خوش بھی
نہ ہو سکی تھی اور خوش ہوتی بھی کیسے وہ جانتی تھی کہ
حمدان یوسف کے ساتھ زندگی بسر کرنا محض ایک
خواب ہے وہ اپنے باپ کی غلطی کی وجہ سے اور
حمدان یوسف کی ماں کی وجہ سے یہ شادی ختم
کرنے پر مجبور تھی، یہ بات ان کے لئے انتہائی
تکلیف دہ اور دکھ کا باعث تھی اور اسے یہ دکھ جھیلنا
ہی تھا اب۔

”فضول باتیں ہیں یہ سب جائے اپنی می
کی بات سنئے وہ آپ کو آواز دے رہی ہیں۔“
مزمنہ کے کانوں میں عائشہ رضا کی آواز آئی تو اس
نے اپنے لہجے کو جان بوجھ کر سپاٹ بنا کر کہا۔

”ممی کی بات نہیں سنوں گا میں اور آپ کو
میری بات ماننا ہی ہوگی، ایک بات یاد رکھیے گا
مزمنہ، آپ حمدان یوسف کی زندگی ہیں، اگر آپ کو
کچھ ہوا تو حمدان بھی زندہ نہیں رہے گا مجھے چھوڑ
کر جانے کا سوچے گا بھی نہیں۔“ حمدان یوسف
نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دل سے کہا
وہ نگاہ چرا گئی، دل کی دھڑکنوں میں طامطم بپا تھا
اسے کیسے سنبھالتی؟

”حمدان باہر آؤ اور اس لڑکی کو بھی باہر
لاؤ۔“ عائشہ رضا کی آواز ان دونوں کے کانوں
میں پڑی تو مزمنہ نے ایک لمبا سانس لیا خود کو
مضبوط کیا اور دروازے کی جانب قدم بڑھا

میں جواب دیا اور حمدان یوسف کو ایک شاگ لگا کر چلی گئی۔

”سنا تم نے وہ بھی تم سے طلاق چاہتی ہے اب کرو سائن۔“ عائشہ رضانے حمدان یوسف کو دیکھتے ہوئے کہا اور طلاق کے پیپر ز اس کی طرف بڑھائے۔

”وہ ایسا صرف آپ کی وجہ سے کہہ رہی ہے۔“

”ہاں تو اچھا ہے نا، وہ عقلمندی کا مظاہرہ کر رہی ہے تو تم کیوں اس کے عشق میں پاگل ہوئے جارہے ہو؟“

”کیونکہ وہ ایسی ہے کہ اس کے عشق میں پاگل ہوا جائے۔“ حمدان یوسف نے دل سے کہا اسی وقت مزمنہ ہاتھوں میں چند فالنگز اٹھائے وہاں آگئی اور وہ فالنگز حمدان یوسف کی جانب بڑھا کر بولی۔

”یہ لیجئے، آپ کی امانت آپ کو لوٹا رہی ہوں، میں نے آپ سے کہا تھا نا یہ میرا نصیب نہیں ہے، یہ آپ کا نصیب ہے سب کچھ کل بھی آپ کا تھا اور آج بھی آپ کا ہے، ابوائے کیے پر نام ہیں آپ جب کہیں گے وہ خود کو قانون کے حوالے کر دیں گے اور اعتراف جرم کر کے اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔“

”اگر ایسا ہی ہے تو تمہارے باپ نے ابھی گرفتاری کیوں نہیں دے دی؟“ عائشہ رضانے طنز کیا۔

”امی ہو سہیلا رُڈ ہیں اس لئے نہیں دی۔“

”ہونہہ، میرے شوہر کو مارا ہے تمہارے باپ نے اسے تو میں پھانسی لگواؤں گی۔“ عائشہ رضانے انتقامی لہجے میں کہا تو حمدان یوسف نے فالنگز سائیڈ پر رکھے میز پر پھینک دیں۔

”اگر میرے باپ نے آپ کے شوہر کو مارا

اسے، دستخط کروان پیپر پر ابھی۔“ عائشہ رضانے غصیلے، تیز اور ساٹ لہجے میں کہا، نیچے نسرین سمیت گھر کے دیگر ملازمین بھی کھڑے ان کی بات سن رہے تھے انہیں لگا ہیں بلند کیے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے، نسرین کو بہت دکھ ہو رہا تھا مزمنہ کے عائشہ رضا کے منفی رویے سے۔

”واٹ؟ آپ نے طلاق کے پیپر بھی تیار کر وار کھے ہیں۔“ حمدان یوسف نے شاگ میں آتے ہوئے کہا وہ اسی لہجے میں بولیں۔

”ہاں جب حقیقت کھل گئی ہے کہ اس کا باپ فراڈ تھا تو ہم اس آدمی کی بیٹی کو اپنے گھر کیوں رکھیں، میں اسے اپنی بہو نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”لیکن میں اسے اپنی بیوی دیکھنا چاہتا ہوں ہمیشہ۔“

”حمدان! تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں چاہتی ہوں۔“ عائشہ رضا کے غصے کے ساتھ ان کی آواز بھی بلند ہوتی جا رہی تھی، مزمنہ کو ان پر ترس آ رہا تھا۔

”ممی! میں آپ کی بے جا خواہش اور ضد پر اپنی چاہت قربان نہیں کر سکتا اس لئے پلیز تماشامت بنائیں ہمیں۔“ حمدان یوسف نے نرمی سے جواب دیا۔

”تماشا تو اب بنے گا مزمنہ بیگم کا تم طلاق دو گے اسے۔“ عائشہ رضا اسے جلال میں بولی تو مزمنہ کو کچھ یاد آ گیا وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو عائشہ رضا دھاڑیں۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“

”آئی ہوں ابھی، آپ کی ایک امانت لا کر

دینی ہے آپ کو آپ طلاق کے پیپر پر سائن کروائیں میں آپ کی پراپرٹی کے پیپر ز لانی ہوں۔“ مزمنہ نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے

ہے تا تو یاد رکھیے کے اقدام قتل آپ نے بھی کیا ہے جس کا ثبوت ہے میرے پاس، میرے ساتھ کی گئی آپ کی زیادتیوں کا اثر میرے گھر والوں پر پڑا، میں بھی کہہ سکتی ہوں کے آپ کی وجہ سے میرے دادا جی کی ڈیڑھ تھ ہوئی، آپ کی وجہ سے میری امی کو ہارٹ ایک ہوا اور وہ مرتے مرتے بچی ہیں پھانسی لگوانے کے جواز اور ثبوت میں بھی رکھتی ہوں مسز یوسف رضا، لیکن میرا ماننا ہے کہ ضمیر کی سزا سب سے بڑی سزا ہوتی ہے اگر ضمیر جاگ جائے تو گناہ گار اور مجرم کو مرتے دم تک سونے نہیں دیتا، دعا کیجئے کے آپ کا ضمیر سو یا رہے ورنہ آپ نہیں سو پائیں گی۔“ مزمنہ نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدہ سپاٹ اور پر اعتماد لہجے میں جواب دیتے ہوئے حمدان یوسف کو حیرت میں ڈال دیا تھا، وہ اس کے اعتماد سمیت حوصلے اور بہادری کا قائل ہو گیا تھا، عشق کے سوتے دل کے کونے کونے سے پھوٹ پڑے تھے اس کے لئے۔

”شٹ اپ، بکو اس بند کرو اپنی۔“ عائشہ رضانے غصے سے چلائیں۔
 ”ممی! پلیز کول ڈاؤن۔“ حمدان یوسف ان کے رویے پر مزمنہ کے سامنے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے کول ڈاؤن کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم مزمنہ کو طلاق دو ابھی۔“
 ”میں نے کہا نا آپ سے میں مزمنہ کو کبھی طلاق نہیں دوں گا یہ بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟“ حمدان یوسف نے مزمنہ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے دونوں کیلچے میں جواب دیا، مزمنہ کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی، وہ حمدان یوسف سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی مگر اس کی ممی کی اتنی نفرت اور بے عزتی بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی

ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے۔
 ”کیونکہ میں سمجھنا نہیں چاہتی تم اس طلاق نامے پر دستخط کر رہے ہو یا نہیں؟“ عائشہ رضا کا لہجہ خاصا جارحانہ تھا۔

”نہیں۔“ حمدان یوسف نے صاف جواب دے دیا۔

”میرا سامان پیک رکھا ہے میں وہ اٹھا لاؤں پھر چلی جاؤں گی یہاں سے۔“ مزمنہ نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا اور حمدان یوسف کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔

”صرف اپنا سامان نہیں ساتھ طلاق نامہ بھی لے کر جاؤ گی یہاں سے۔“ عائشہ رضا طنز و تذلیل بھرے لہجے میں بولیں۔

”ابھی آپ کا بیٹا مان نہیں رہا جب مان جائے تو طلاق نامہ گھر بھجوا دیجئے گا، میرے گھر کا بیٹا جانتے ہیں یہ۔“ مزمنہ نے جواب دیا اور جانے لگی مگر حمدان یوسف نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا، عائشہ رضایہ دیکھ کر بولیں۔

”حمدان! چھوڑو اس کا ہاتھ۔“
 ”نہیں چھوڑوں گا۔“ حمدان یوسف نے طلاق نامہ پھاڑ دیا۔
 ”ٹھیک ہے ہمیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں ممی!“ وہ عاجز آتے ہوئے بولا۔

وہ کمرے میں گئیں اور فروٹ اٹھا کر لے آئیں، کانٹے والی چھری۔

”اب بتاؤ مزمنہ کو طلاق دو گے کہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں؟“ عائشہ رضانے پھل کانٹے والی چھری اپنی کلائی پر رکھ کر کہا تو مزمنہ نے بے اختیاری میں اپنے ہاتھ کی گرفت حمدان یوسف کے ہاتھ پر مضبوط کی تھی اور حمدان یوسف کو اپنے

دے دیا، فضا میں مزہ کی چیخ بلند ہوئی اور وہ سیڑھیوں سے لڑکتی گرتی ہوئی نیچے فرش پر آ گری۔

”مزہ!“ حمدان یوسف چیختا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اترتا، مزہ کے سر کے پاس کافی خون پڑا تھا، اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہو رہی تھیں، نسرین بھی دوڑی چلی آئی تھی۔

”مزہ! کچھ نہیں ہوگا آپ کو آپ جئیں گی میرے لئے، میرے ساتھ جینا ہوگا آپ کو۔“ حمدان یوسف نے مزہ کا سراپا اپنی ہاتھوں میں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بے قراری سے کہا۔

”غفور گاڑی نکال، حمدان بابا! دلہن بی بی کو ہسپتال لے کے چلیں جلدی۔“ نسرین نے ڈرائیور کو آواز دے کر کہا اور پھر حمدان یوسف سے گویا ہوئی، وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر تیزی سے باہر بھاگا، مزہ غی آنکھوں میں اندھیرا اتر رہا تھا، درد کی شدید لہریں اس کے روم روم میں ٹکھڑ رہی تھیں، اسے موت اپنے قریب آئی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

”مزہ نہیں آئی آج دوبارہ کہہ رہی تھی رات میں ملنے آئے گی۔“ صابرہ نے فواد راشد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جاگ جاگ کر سر میں درد کر لیا تھا اس نے دوا کھا کر سو گئی ہوگی، حمدان واپس آ گیا ہے وہ آئے گا تم سے ملنے تمہاری عیادت کو آئے گا یہاں فون آیا تھا اس کا ابھی۔“ فواد راشد نے جواب دیا اور سب کاٹ کر پلیٹ ان کے سامنے رکھ دی۔

”پتا نہیں کیوں میرا دل ڈوب رہا ہے مزہ کی طرف سے بہت بے چینی سی ہے دل کو وہ ”حمدان ولا“ کیوں چلی گئی؟ اپنے گھر جانی نا اس

ہاتھ پر اس کے کول سے ہاتھ کی گرفت محسوس ہوئی تو اس نے ایک پل کے لئے آنکھیں موند لیں، مزہ کے ہاتھ کی گرفت اس کے دل کی بات اس تک پہنچا رہی تھی وہ کچھ نہ کہہ کر بھی اسے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتی، اس احساس نے حمدان یوسف کو اس کے ارادے کو مزید تقویت بخشی، اس نے ایک نگاہ اپنے ساتھ کھڑی اپنی محبت پر ڈالی اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ممی! آپ بات کو غلط رنگ کیوں دے رہی ہیں میں یہ نہیں کہہ رہا تھا جو آپ سمجھ رہی ہیں۔“ وہ زچ ہو گیا۔

”اچھا! تو پھر چھوڑو اس کا ہاتھ۔“ عائشہ رضا جارحانہ انداز میں آگے بڑھیں اور حمدان یوسف کے ہاتھ سے مزہ کا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگیں، مزہ کو شدید درد ہونے لگا تھا، اس نے اپنا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا تھا مگر حمدان یوسف نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

”فارگا ڈسک ممی! کیا ہو گیا ہے آپ کو پلیز بس کر دیں۔“ حمدان یوسف نے انہیں یوں پاگلوں کی طرح بے ہوش کرتے دیکھ کر بے بسی سے، بچی لہجے میں کہا۔

”تم چھوڑ دو اس کا ہاتھ میں ابھی بس کر دیتی ہوں۔“ عائشہ رضا نے پوری قوت سے مزہ کا ہاتھ حمدان یوسف کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، حمدان یوسف نے مزہ کے چہرے کو دیکھا جہاں تکلیف کے آثار نمایاں تھے، اس نے اس خیال سے کہ مزہ کو مزید درد، تکلیف نہ ہو اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”دفعہ ہو جاؤ میرے گھر سے۔“ عائشہ رضا نے حمدان یوسف کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ آزاد ہونے پر غصے سے کہتے ہوئے بہت زور سے دھکا

کی ساس نے اگر پھر تکلیف دی اسے تو۔“ صابرہ نے مدہم، نقاہت بھری آواز میں دل کی کیفیت اور ڈر بیان کرتے ہوئے کہا۔

”انشاء اللہ تعالیٰ! اب ایسا نہیں ہوگا، حمدان واپس آ گیا ہے اور وہ بہت اچھا لڑکا ہے بہت خیال رکھتا ہے مزمنہ کا مزاج میں بالکل اپنے مرحوم باپ کا پر تو ہے، اللہ اس کے دل میں ہماری بیٹی کی محبت پیدا کر دے وہ میرے کیے کی سزا میری بیٹی کو نہ دے بس۔“ فواد راشد سنجیدگی سے بولے۔

”وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ وہ مزمنہ کو بہت چاہتا ہے وہ بھی مزمنہ کے ساتھ زیادتی، ظلم نہیں کرے گا، ماشاء اللہ حمدان بہت سلجھا ہوا اور نیک لڑکا ہے۔“ صابرہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولے۔

”ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔“
”مجھے چھٹی کب ملے گی ہسپتال سے؟“
”کل مل جائے گی انشاء اللہ!“ فواد راشد نے پایا۔

”شکر ہے۔“ وہ اطمینان بھرا سانس لے کر بولیں۔

فواد راشد سوچ رہے تھے کہ وہ حمدان یوسف کا سامنا کیسے کریں گے اور ادھر ایمر جنسی روم کے باہر پریشانی کے عالم میں ٹھٹھکا حمدان یوسف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مزمنہ کے ماں باپ کا سامنا کیسے کرے گا؟ انہیں کیسے بتائے گا کہ ان کی بیٹی کا یہ حال اس کی ماں نے کیا ہے؟ اور وہ خود مزمنہ سے کیسے نظریں ملا پائے گا؟ وہ تو بے جرم سزاوار ٹھہرا دی گئی، خدا نخواستہ اگر مزمنہ کو کچھ ہو گیا تو وہ کیسے جی پائے گا؟ یہ سوال اس کے رونہٹے کھڑے کر دیتا دھڑکنیں ساکت اور روح بے کل کیسے دے رہا تھا۔

فیصل کو اس نے فون کر کے بلا لیا تھا، وہ بھی ساری صورتحال جان کر دنگ رہ گیا، عایشہ رضا سے اسے اتنے ظالمانہ سلوک کی توقع نہ تھی، وہ حمدان یوسف کو تسلی دے رہا تھا کہ اس کی مزمنہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی، حمدان یوسف کا روم روم مزمنہ کے لئے سراپا دعا تھا، آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں وہ بہت ضبط کے مراحل میں تھا، اپنی اذیت اور دکھ کو چھپا کر اسے مزمنہ کے لئے لڑنا تھا، حوصلہ کرنا تھا اور وہ یہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

فواد راشد کسی کام سے صابرہ کے کمرے سے باہر نکلے تھے فیصل، نسرین اور حمدان یوسف کو ایمر جنسی کے باہر دیکھ کر ٹھٹھے اور فوراً وہاں آ کر پوچھنے لگے۔

”کک..... کیا ہوا؟ آپ سب یہاں کیوں جمع ہیں؟ میری بیٹی تو ٹھیک ہے نا؟“
”دعا کریں فواد صاحب کے آپ کی بیٹی ٹھیک ہو جائے۔“ فیصل نے انہیں دیکھتے ہوئے جواب دیا تو وہ پریشان ہو کر بولے۔

”کیا مطلب؟ کیا ہوا میری بیٹی کو؟“
”میرے گھر پر گہری چوٹ لگی ہے مزمنہ کو، ہم دونوں یہاں آ رہے تھے صابرہ آٹنی سے ملنے، سیرھیوں سے مزمنہ کا پاؤں پھسل گیا اور..... وہ گر گئیں۔“ حمدان یوسف نے بات بناتے ہوئے کہانی الحال وہ اصل وجہ بتا کر مزید کوئی مسئلہ نہیں چاہتا جی جھوٹ بولا۔

”گر گئی یا گرا دی گئی؟“ فواد راشد نے حمدان یوسف کو شکی نظروں سے دیکھا۔

”انکل، فی الحال یہ بات زیادہ اہم ہے کہ آپ کی بیٹی اس وقت خطرے میں ہے اور اسے ہم سب کی دعاؤں کی شد ضرورت ہے اس لئے پلیز مزمنہ کے لئے دعا کیجئے، باقی باتیں ہم بعد

بولتے چلے گئے، حمدان یوسف کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، نسرین پر نم آنکھوں سے مزہ غی صحت سلامتی کے لئے دعا یا لگ رہی تھی، فیصل نے ان کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دے کر حوصلے سے کام لینے کا اشارہ دیا تھا۔

زندگی تجھے جینے کی خاطر میں نے اتنے ستم بھیل لئے ہیں کہ اب

سانسیں ہیں گھائل میری

مزہ کا خون کافی بہہ گیا تھا، اسے خون کی بوتل لگائی گئی تھی اور مزید خون کا انتظام کرنے کے لئے کہا گیا تو فواد راشد فوراً بولے۔

”میں خون دوں گا اپنی بیٹی کو میرا بلند گرد پ اوٹیکو ہے۔“

”لیکن آپ کی عمر“ ڈاکٹر سہیل نے کچھ کہا جابا، مگر فواد راشد ان کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

”آپ میری عمر پر نہ جائیں اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہوں کے اپنی بیٹی کو ایک بوتل خون نہ دے سکوں آپ چلیں مجھے اپنی بیٹی کے لئے اپنے جسم سے خون کا قطرہ بھی دینا پڑا تو دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، ٹرس آپ انہیں لے جائیں اور ٹیسٹ کروائیں فوراً۔“ ڈاکٹر سہیل نے اپنے برابر میں کھڑی ہدایت دی اور واپس آریشن تھیٹر میں چلے گئے جہاں مزہ کو ایمر جنسی سے مشغل کر دیا گیا تھا، مزہ مسلسل بے ہوش تھی، اس کے جسم پر کئی جگہ گرنے کی وجہ سے چوٹیں آئی تھیں، اس کی ایک پسلی میں فریکچر ہوا تھا، دایاں ہاتھ پھیل گیا تھا، پاؤں کا انگوٹھا زخمی تھا، سر پھٹ جانے کی وجہ سے بہت خون ضائع ہو گیا تھا، حمدان یوسف کے بس میں ہوتا تو وہ یہ سارے زخم، ساری چوٹ اپنے بدن پر سہہ لیتا، اس کا دل رورہا تھا، دکھ

میں بھی کر سکتے ہیں۔“ حمدان یوسف نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

فواد راشد کو اس نے پہلی بار ”انکل“ کہہ کر مخاطب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ انہیں معاف کر چکا ہے اور ان کی بیٹی کو دل سے قبول کر چکا ہے اسے چاہتا ہے، انہیں صابرہ کی کہی ہوئی باتوں پر یقین آنے لگا اور ان کی بے چینی پر یقین آ گیا کہ وہ ایسے ہی نہیں تھی بے چین نہیں تھیں مزہ کے لئے آخر ماں تھیں بیٹی کی تکلیف پر دل کا بے چین ہونا تو یقینی تھا۔

”صابرہ ٹھیک ہی پریشان ہو رہی تھی مزہ کے لئے کہہ رہی تھی وہ کسی تکلیف میں نہ ہو اسے حمدان ولا نہیں جانا چاہیے تھا، اس کا خوف سہی نکلا۔“ فواد راشد نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تو فیصل بولا۔

”آپ ابھی انہیں مزہ بھا بھی کے بارے میں مت بتائیے گا ان کی اپنی حالت اچھی نہیں ہے۔“

”کب تک چھپاؤں گا؟ صبح تو پوچھے گی نا کہ مزہ کیوں نہیں آئے اسے ملنے؟ دل کا دورہ پڑا تھا اسے کوئی معمولی مرض نہیں ہے یہ کہ میں جا کے اسے بتا دوں کے اس کی بیٹی کی زندگی خطرے میں ہے، یہ سب میرے اعمالوں کی سزا ہے، میں نے جو غلط کیا، اس کا خمیازہ میری بیوی اور بیٹی کو بھگتنا پڑ رہا ہے، خاص کر میری اکلوتی بیٹی کو، ساری زندگی بیوی، بیٹی کی پروا نہیں کی، اب جب ان کی محبت نے دل میں قدم رکھا ہے، پروا ہونے لگی ہے تو وہ دونوں ہی مجھے امتحان میں ڈال کر ہسپتال آ رہی ہیں، یہ میرا امتحان ہی ہے، شاید قدرت مجھے ابھی اور سبق سیکھانا چاہتی ہے، میرا ظرف، میرا صبر آزمانا چاہتی ہے اسی لئے تو یہ سب ہو رہا ہے۔“ فواد راشد وہ بیٹخ پر بیٹھے

آنسو بن کر حلق میں پھنس گیا تھا، اس نے اپنے موبائل پر عائشہ خان کو کال ملائی کافی دیر تیل بجنے کے بعد انہوں نے کال رسیو کی۔

”ہیلو کہاں ہو تم؟“ عائشہ رضا کی آواز حمدان یوسف کے کان میں آئی۔

”آپ کو نہیں معلوم کہاں ہوں میں؟ آپ نے مزنہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا می! اگر مزنہ مر گئی نا تو زندہ آپ کا بیٹا بھی نہیں رہے گا، یاد رکھئے گا می، مزنہ میری زندگی، خوشی اور میرا عشق ہے اگر اسے کچھ ہوا نا، تو جو کچھ آپ نے آج تک مزنہ کے ساتھ کیا ہے نا، اس کی سزا میں خود آپ کو قانون کے ہاتھ دلوادوں گا، پیسہ جھمن جانا اتنی بڑی غلطی ای اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ اس کے بدلے میں کسی کی جان لینے کی کوشش اور سازش کی جائے، آپ نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے اور مزنہ کو گرا کر آپ نے مجھے سولی پر لٹکا دیا ہے، دعا کریں کہ مزنہ کو کچھ نہ ہو ورنہ آپ کو کچھ نہیں ملے گا نہ معافی اور نہ آپ کا بیٹا۔“ حمدان یوسف نے اپنی بات کہہ کر کال منقطع کر دی، فیصل اس کے قریب کھڑا تھا اس نے حمدان یوسف کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی، حمدان یوسف کے ضبط کے بندھن ٹوٹ رہے تھے۔

”ساری غلطی میری ہے، میری وجہ سے، مزنہ اس حال کو پہنچی ہے۔“ حمدان یوسف بھکتی آواز میں بولا۔

”ایسا کیوں کہہ رہا ہے تو؟“

”ایسا ہی ہے میں ہوں مزنہ کی اس حالت

کا ذمے دار نہ میں اس کا ہاتھ چھوڑتا نہ وہ یوں ٹوٹتی، بکھرتی، می کی زور آزمائی میں، بہت تکلیف ہو رہی تھی اسے میں نے اسے تکلیف سے بچانے کی خاطر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا، اور وہ می کی بے رحمی

کا شکار ہو گئی، مجھے اگر خبر ہوتی کہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر میں اسے بہت بڑی تکلیف کی طرف دھکیل رہا ہوں، تو میں ہرگز اس کا ہاتھ نہ چھوڑتا، بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے۔“ حمدان یوسف نے روتے ہوئے کہا تو فیصل نے دھکی ہو کر اسے اپنے گلے سے لگالیا اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

”حوصلہ کر یار، تیرا کوئی قصور نہیں ہے خود کو بلیم (الزام) مت دے، انشاء اللہ تعالیٰ، مزنہ بھابھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی، ہم سب کی دعائیں اور محبتیں انہیں زندگی کی طرف ضرور لے آئیں گی، میں نے مزنہ کو بھابھی نہیں دل سے بہن مانا ہے اور میں اپنی بہن کے لئے کتنی شدت سے دعا مانگ رہا ہوں یہ میرا دل جانتا ہے یا میرا رب، مزنہ کو ہم سب کے لئے جینا ہوگا، اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں اور ہمارے آنسوؤں کی لاج ضرور رکھیں گے تو دیکھنا تو اپنی مزنہ کا ہاتھ تھام کر اسے یہاں سے لے کر جائے گا، ہنستا مسکراتا ہوا۔“

”انشاء اللہ۔“ حمدان یوسف نے دل سے کہا اور اس سے الگ ہو کر اپنے آنسو صاف کر لئے۔

ادھر عائشہ رضا کو حمدان یوسف کی فون کال نے کٹہرے میں لاکھڑا کیا تھا جہاں ضمیر جرح کر رہا تھا، وہی آئینہ دکھا رہا تھا اور دماغ شرمندہ سا دلیلیں پیش کر رہا تھا۔

”مزنہ کے باپ نے جو ہمارے ساتھ کیا میں نے اس کے ردمل میں مزنہ کو بزدلی ہے۔“

”تم کون ہوتی ہو باپ کے کیے کی سزا اس کی بیٹی کو دینے والی؟ فواد راشد نے ہمیں اور تمہارے بیٹے کو بے گھر نہیں کیا، تم دونوں کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا پھر تم نے اس کی بیٹی کو جان سے مار دینے کا کیسے سوچ لیا؟ مزنہ کو طرح طرح سے تار چر کیا، جبکہ اس کا باپ بے حس تھا اسے کوئی

کے لئے تیار ہو کیونکہ تمہارا بیٹا خود تمہیں سزا دلوائے گا وہ یہ بات کہہ چکا ہے، اب سوچ لو، تم ایک خود غرض، بے رحم اور سفاک عورت ہو تمہاری اصلیت حالات کے ذرا کروٹ بدلنے پر سامنے آگئی، آج تک عیش و عشرت اور دولت و آسائش نے تمہارا اصل چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور اصل چہرہ کتنا بھیانک اور مکروہ ہے تم خود دیکھ لو اپنے ضمیر کے آئینے میں۔“ ضمیر نے آخری میل ان کے تابوت میں ٹھونگی اور انہیں بے کل بے چین اور شرمسار کر گیا۔

☆☆☆

”السلام علیکم آنٹی! کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ فیصل، نسرین بی کے ساتھ صابرہ کے کمرے میں داخل ہوا اور انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

”علیکم السلام، میں ٹھیک ہوں بیٹا، تم کیسے ہو؟“ صابرہ نے اسے پہچان لیا تھا مسکرا کر جواب دیتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی۔

”میں بھی ٹھیک ہوں آپ بتائیں ہو سٹل والوں کی مہمانداری سے دل بھرا کے نہیں؟“

”ہو سٹل میں بھی بھلا کسی کا دل لگا ہے کیا؟ انشاء اللہ کل گھر چلی جاؤں گی۔“ صابرہ نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

”یہ تو بہت خوشی کی بات ہے بیگم صاحبہ!“

نسرین نے کہا۔

”ہاں شکر ہے اللہ کا میری وجہ سے مزہ بھی بہت پریشان اور بے آرام رہی ہے وہ تمہارے ساتھ نہیں آئی، فون آیا تھا کہہ رہی تھی نماز پڑھ کر آؤں گی اب تو کافی دیر ہو گئی آئی ہی نہیں اور اس کے ابو بھی پتا نہیں کہاں رہ گئے؟ دس منٹ کا کہہ کر گئے تھے گھنٹہ ہونے کو آیا ہے کوئی خبر ہی نہیں ہے ان کی۔“ صابرہ نے ان دونوں کو دیکھتے

فرق نہیں پڑتا تھا کہ تم اس کی بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہو، لیکن اسے بھی ایک باریہ احساس ہو گیا تھا کہ جرم اس نے کیا تھا اور سزا اس کی بیٹی کو دی جا رہی ہے، تمہارا تو ایک ہی بیٹا ہے نا، اگر فواد راشد اسے ٹھکانے لگا دیتا یا اب ایسا کر دے تو کیا کرو گی تم؟ کس کے سہارے جیو گی؟ تم نے اپنے بیٹے کو نا صرف مایوس کیا ہے بلکہ اس سے اس کی خوشی اور محبت کو چھیننے کی کوشش بھی کی ہے، تم اتنی سفاک اور بے رحم ہو گئیں کہ مزہ کو جلا کر مارنے کی کوشش بھی کر ڈالی، مگر دیکھ لو عانتہ بیگم مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔“ یہ ان کے ضمیر کی آواز تھی۔

”حمدان اگر میری بات پہلی بار ہی کہنے پر مان جاتا تو میں غصے میں نہ آئی اور نہ یہ سب ہوتا۔“ عانتہ رضا با آواز بولیں جیسے ضمیر سن رہا ہو۔

”تم نے اپنی ضد اور انا میں، بدلے اور انتقام میں اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی داؤ پر لگا دی، اس کی محبت کو اس سے دور کرنے کی کوشش کی، اس سے اس کی زندگی کو دور کرنا چاہا پھر بھلا وہ کیسے تمہاری بات مان لیتا تم اسے خودکشی پر مجبور کر رہی تھیں، حرام کام کا انجام جانتی ہونا کیا ہے؟ اب کیا کرو گی؟ تمہارا بیٹا سے سے ناراض ہے، اس کی بیوی کو اگر کچھ ہو گیا تو تم اپنے اکلوتے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی، پھر اکیلی اس حمدان ولا پر راج کرنا، اس دولت کے لئے تم نے ایک انسان کی زندگی دکھوں سے بھر دی یہ دولت تمہاری زندگی ہی نہیں تمہاری آخرت کو بھی جہنم بنا دے گی، ابھی وقت ہے سنبھل جاؤ، مان لو اپنا جرم، مزہ کو کچھ نہ ہو یہی تمہیں معافی دلوا سکتا ہے، دعا کرو معافی مانگو تو بہ کرو، اگر تمہاری انا ان سب کے آڑے آرہی ہے تو اپنے جرائم کی سزا بھگتتے

ہوئے کہا۔
 ”انکل کی طرف سے تو آپ بے فکر ہو جائیں، وہ اس وقت نیکی کما رہے ہیں ہمیں ملے تھے یہاں ایک ایکسڈنٹ کیس آیا تھا ایک زخمی کو بلڈ کی ضرورت تھی اس لئے وہ اسے خون دینے کے لئے گئے ہیں کہہ رہے تھے کہ آپ کو بتا دوں اور جب تک انکل آ نہیں جاتے ہم آپ کے پاس ہی رہیں گے، بلکہ انکل بلڈ دینے کے بعد کچھ کمزوری ٹیل کریں گے تو مجھے تو رات یہاں رکنا ہی ہوگا۔“ فیصل نے کہانی بناتے ہوئے کہا، یہ آدھا سچ بھی تھا۔

”ارے نہیں بیٹا، میں اب ٹھیک ہوں آپ دونوں کیوں میری وجہ سے بے آرام ہوتے ہو۔“ صابرہ بولیں۔

”بیٹا بھی کہہ رہی ہیں اور غیروں جیسی بات بھی کر رہی ہیں۔“ فیصل نے مصنوعی حُکلی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جیتے رہو بیٹا، خوش رہو، حمدان نہیں آیا اس نے بھی تو آنا تھا مزمنہ کے ساتھ۔“ صابرہ نے اسے دعا میں دے کر یاد آنے پر استفسار کیا۔

”آئی! اصل میں بات یہ ہے کہ حمدان اور مسز مزمنہ حمدان دونوں آپ کے پاس آ رہے تھے کہ اچانک عائشہ آئی کی طبیعت خراب ہوگئی، یونو ان کو شوگر، بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے تو وہ ہی بڑھ گیا شاید لہذا وہ دونوں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور نسرین بی کو میرے ساتھ بھیج دیا تاکہ آپ کی خدمت کر سکیں۔“ فیصل کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا، اس نے فوراً معقول بہانہ گھڑ کر پوری تفصیل سے سنا دیا۔

”ارے ان کی کیا ضرورت تھی مزمنہ کے ابو ہیں تو سہی یہاں۔“

”آئی! آپ کو دیکھ بھال کے لئے کسی

”ہاں مزمنہ نے بالکل صحیح کیا، مجھے لگتا تھا میری بیٹی بہت ڈری، سہمی، کمزور ہے اور اعتماد کی دولت سے خالی رہ گئی ہے، لیکن حالات نے میرا حشرہ دور کر دیا، ماشاء اللہ میری بیٹی تو بہت سمجھدار ہے، بہادر اور معاملہ فہم ہے۔“ صابرہ نے فخری لہجے میں کہا تو فیصل مسکراتے ہوئے بولا۔

”بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ میں نے تو آپ کی بیٹی کو اپنی بہن بنا لیا ہے بس آپ میری پہچاری سی بہن کے لئے ڈھیر ساری دعائیں مانگیں گے اللہ پاک مزمنہ کو صحت تندرستی والی لمبی زندگی دیں اپنے شوہر کے ساتھ اور وہ ہمیشہ شاد آباد رہے۔“

”آمین!“ صابرہ نے دل سے کہا ساتھ ہی نسرین نے بھی۔

”میرا دل بہت بے چین ہے مزمنہ کی طرف سے اللہ کرے کے سب خیر ہی میری بیٹی پر آج نہ آئے وہ سدا تندرستی، عزت اور مسرت والی زندگی جیئے، سدا سہاگن رہے، نیک اولاد رب اسے نصیب کرے اور اولاد کی خوشیاں اپنے شوہر حمدان کے سنگ دیکھنا نصیب ہوں میری مزمنہ کو۔“ صابرہ نے اپنا آنچل پھیلا کر دل سے دعا

مانگی، جواباً ان دونوں نے دل سے آمین کہا، فیصل نے بہت طریقے سے سمجھداری سے مزنہ کے لئے دعا کروائی تھی ان سے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مزنہ کو اس وقت اپنی ماں کی دعاؤں کی اشد ضرورت تھی۔

☆☆☆

حمدان یوسف آئی سی یو کے باہر کھڑا اگلاس ونڈو سے مزنہ کو دیکھ رہا تھا، سر پر سفید ٹی شہی، منہ پر آکسیجن ماسک لگا تھا، مشین پر اس کے دل کی دھڑکن بتدریج کم زیادہ ظاہر ہو رہی تھی، بلڈ لگا ہوا تھا، وہ ساکت وجود کے ساتھ پیشٹ بیڈ پر لیٹی تھی، اس بات سے بے خبری کے جیسے وہ بھی دل ہی دل میں چاہنے لگی تھی اس شخص کا دل اس کے لئے رو رہا ہے، گڑ گڑا رہا ہے، دپ کائنات سے اس کی صحت و سلامتی کی دعا میں مانگ رہا ہے۔

”امی ٹھیک کہتی ہیں سارے مرد میرے باپ دادا جیسے نہیں ہوتے، کچھ مرد حمدان یوسف جیسے بھی ہوتے ہیں، جو کسی کی بھی نفرت کو محبت میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں اور وہ ہنر ہے حسن اخلاق حسن عمل جو کسی کے بھی دل میں اس کی محبت پیدا کر سکتا ہے، جیسے میرے دل میں حمدان یوسف کی محبت پیدا ہو گئی ہے، میں خوش ہوں کہ میرا شریک حیات بہت اچھا انسان ہے اور اس بھی ہوں کہ میں حمدان یوسف کے ساتھ اپنی پوری زندگی نہیں گزار سکی۔“ مزنہ کی ڈائری کا ایک ورق تھا یہ جسے پڑھ کر حمدان یوسف خوشی اور بے گل گیا تھا۔

”کچھ رشتے خوشی سے نہیں بنائے جاتے لیکن خوشی بن جاتے جیسے میرا حمدان یوسف سے رشتہ کل تک میری مجبوری تھا اور آج میری خوشی بن گیا ہے، میں جانتی ہوں یہ رشتہ نہیں چلے گا لیکن فی الحال میں اس لمحے کو انجوائے کرنا چاہتی

ہوں کہ میں خوش ہوں، میں پیار کرنے لگی ہوں اپنے شوہر سے۔“ ڈائری کا ایک اور ورق الٹ گیا۔

”ابو نے حمدان یوسف کے والد سے فراڈ کیا، پاور آف اٹارنی حاصل کی اور ان کا سب کچھ ہتھ لیا، میرا اور امی کا سر شرم سے جھکا دیا ہے، لیکن میں یہ سب حمدان یوسف کو واپس لٹا کے رہوں گی چاہے مجھے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔“

ایک اور جگہ لکھا تھا۔

”میں بری تو نہیں ہوں لیکن بری بن رہی ہوں، بری بننے کے لئے حمدان یوسف کے ساتھ پہلے دن سے بدتمیزی سے پیش آ رہی ہوں تاکہ انہیں یقین آ جائے کہ مزنہ بھی اپنے باپ کی طرح ایک بری لڑکی ہے، ب حس، بدتمیز، لاپچی، مغرور اور بد دماغ، اس طرح وہ تنگ آ کر خود ہی مجھے چھوڑیں گے، ورنہ ابو کے جرم کا بار ندامت مجھے تمام عمر ان کے سامنے نظر میں جھکائے رہنے پر مجبور رکھے گا اور ایسی زندگی مجھے منظور نہیں ہے۔“

”مجھے مردوں پر اعتبار نہیں تھا کیونکہ میں نے اپنے گھر کے مردوں کو کبھی اپنی ماں کی بیوی کی، بیٹی کی عزت کرتے نہیں دیکھا تھا، لیکن حمدان یوسف نے مجھے اعتبار کی وجہ دے دی، پیار کی وجہ دے دی۔“ حمدان یوسف نے مزنہ کی ڈائری کا ورق ورق پڑھا تھا کئی جگہ وہ بے اختیار رو دیا تھا، اسے مزنہ اور صابرہ کی تکلیف دہ زندگی کا دل سے احساس ہو گیا ہے، اس کے دل میں ان دونوں کے لئے عزت بے پناہ بڑھ گئی تھی اور مزنہ کے لئے، مزنہ کے لئے تو وہ عشق و محبت کی انتہاؤں پر تھا، بڑا ٹوٹر پر جاتے ہوئے وہ مزنہ سے نظر بچا کر اس کی کینٹ سے ڈائری نکال کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور وہاں اپنے کام سے

لوگ بتاتے کیوں نہیں کیا ہوا ہے مزہ کو؟“ صابرہ نے بے چینی سے کہا۔

”کمال ہے آنٹی! مزہ جیسی بہادر بیٹی کی ماں ہو کر آپ اتنی کمزور کیسے ہو سکتی ہیں؟ ساری زندگی آپ نے ہمت اور حوصلے سے گزاری اور بیٹی کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا سن کر آپ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا، خدا نخواستہ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوگی تو ہم یا مزہ آپ کو کیوں بتانے لگے؟ پہلے ہی دل کمزور کر لیا آپ نے مزید کچھ برانہ ہو اس لئے آپ کو اس ڈر سے کوئی کچھ بتائے گا ہی نہیں۔“ فیصل نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

”بیٹا، وہ میرے دکھ تھے میری ذات تک تھیں جو ظلم و زیادتیوں وہ میں نے سہہ لیں، ماں باپ خود پر سب کچھ سہہ لیتے ہیں مگر اپنی اولاد کا دکھ نہیں سہہ سکتے، اولاد کسی دکھ یا پریشانی میں ہو تو یہ ایک ماں کا دل کیسے برداشت کر سکتا ہے؟“ صابرہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آپ صحیح کہہ رہی ہیں لیکن اگر آپ ماں ہو کر ہمت نہیں کریں گی تو آپ کی بیٹی کو کون سنبھالے گا؟“

”کیا ہوا ہے میری بیٹی کو؟“ صابرہ نے تڑپ کر پوچھا۔

”پہلے آپ وعدہ کریں کے خود کو سنبھالیں گی اپنا دل مضبوط رکھنا ہے آپ کو کیونکہ آپ کی بیٹی کو اس وقت آپ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔“ فیصل نے ان کا ہاتھ تھام کر نرمی سے جواب دیا، ان کی حالت کا ٹو تو بدن میں لہو نہیں جیسی ہو رہی تھی۔

”کہاں ہے مزہ؟“ کا نپتی آواز میں پوچھا۔

”آئی سی یو میں ہے دودن سے سر پر گہری

فارغ ہو کر اس نے ڈائری پڑھی تھی، دوران سفر بھی وہ ڈائری پڑھتا آیا تھا، ایک بات اس کے لئے اہم تھی کے مزہ کے دل میں اس کے لئے پیار ہے، اسے مرد ذات پر اعتبار کرنا آ گیا ہے کم از کم وہ حمدان یوسف پر اعتبار کرنے لگی تھی اس کے لئے یہی بہت تھا اور وہ اس اعتبار کو کسی صورت ٹوٹنے نہیں دے گا وہ یہ عہد کر کے واپس لوٹا تھا، مگر یہاں تو سب کچھ ٹوٹ رہا تھا، اس کا دل، اس کی روح، اس کا گھر، اس کی زندگی، وہ اللہ کے حضور سجدے کر رہا تھا، آنسو بہا رہا تھا، مزہ کی خاطر اپنی محبت کی خاطر، صابرہ کو ہسپتال سے ڈسچارج ہوئے دودن ہو گئے تھے، نوادراشد نے ان کے آرام کی خاطر گھر میں کل وقتی ملازمہ کا انتظام بھی کر لیا تھا، نسرین بھی ان کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور فیصل بھی ان کا حال پوچھنے آ رہا تھا، حمدان یوسف اور مزہ ہی نہیں آئے تھے اور یہ بات صابرہ کو پریشان کر رہی تھی، انہوں نے کئی بار مزہ کے سیل نمبر پر کال ملائی مگر اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔

”مزہ میری طبیعت کا پوچھنے نہیں آئی مگر فون تو کر سکتی تھی نا وہ اس کا فون بھی بند جا رہا ہے، اللہ خیر کرے میری بچی ضرور کسی مشکل میں ہے۔“ صابرہ نے فیصل اور نسرین کو دیکھتے ہوئے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو دونوں چور بن گئے۔

”دہن بی بی کا فون تو پانی میں گر گیا تھا خراب ہو گیا تھا نا جیسی آپ کو کال نہیں کر سکی۔“ نسرین نے بہانہ بنایا۔

”ہاں تو حمدان کے موبائل سے کال کر سکتی تھی وہ گھر میں لینڈ لائن نمبر بھی ہے اس سے کال کر لیتی مگر نہیں، میری بیٹی ایسی لا پرواہ رگز نہیں ہے تم لوگ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو، کچھ ہوا ہے نا؟ میری مزہ ضرور کسی تکلیف میں ہے تم

چوٹ لگی ہے۔“ فیصل نے عائشہ رضا کے ذکر کے بغیر انہیں ساری بات بتادی۔

”یا اللہ، رحم کر پروردگار تو غفور و رحیم ہے، حفظ ہے میری بیٹی کو صحت والی لمبی زندگی عطا کر دے پروردگار، مرنے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا پھر اس کے ساتھ برا کیسے ہو سکتا ہے مالک، مجھے میری بیٹی کا کوئی دکھ نہ دیکھانا اب۔“ صابرہ روتے ہوئے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگی۔

☆☆☆

میں زندہ ہوں تو

ایسے ہوں

کوئی خوش ہے، کوئی غصے سے نفرت سے مجھے دیکھتا دکھائی دے

کسی کی آنکھ کا تارا ہوں میں

کسی کو جان سے پیارا ہوں میں کسی کے لب پر محبت پھول بن کر کھل رہی ہے

مجھے ماں کی دعاؤں زیست بن کر مل رہی ہے کسی کی نفرتوں نے مات کھا کر

محبت کا بھرم پھر رکھ لیا ہے کسی کی سازشیں ناکام ہو کر

زمین کی خاک میں یوں

مل گئی ہیں

کہ جیسے مرنے والے کے بدن کو

زمین کی خاک چاٹ لیتی ہے

کسی کی چاہتیں مقبول ہو کر

گلے پھر زندگی سے آملی ہیں

اجل کو مات ہو کے رہ گئی

ماں اور محبت کی دل و جان سے کٹی گئی

دعائیں قبولیت کا شرف پا گئیں نہیں، مرنے کو

پورے پچاس گھنٹے بعد ہوش آ گیا تھا، ادھ کھلی

آنکھوں کے سامنے دھندلا سا عکس بن رہا تھا۔

”مرنہ!“ حمدان یوسف نے بے اختیار

تڑپ کر پکارا تھا۔

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں نرمی سے

تھامے وہ اس کے چہرے کو بہت بے قراری سے

دیکھ رہا تھا۔

”مرنہ! آنکھیں کھولے پلیز مرنہ، میں

آپ کو اس طرح سے نہیں دیکھ سکتا، پل پل مر رہا

ہوں میں آپ کو ایسے دیکھ کر، پلیز آنکھیں

کھولیں، بات کریں مجھ سے۔“ حمدان یوسف

پر نرم آواز میں اس سے مخاطب تھا، اس کی سماعتیں

دھیرے دھیرے بیدار ہو رہی تھی، حمدان یوسف

کی آہستہ آہستہ بینائی بن کر اس کی آنکھوں میں

اتر رہی تھی، گلاس وینڈو سے فواد راشد یہ منظر دیکھ

کر خوشی سے اشک بہاتے ڈاکٹر کو بلالائے،

ڈاکٹر نے مرنے کا چیک اپ کیا اس سے بات کرنا

چاہی مگر وہ کچھ نہ بولی اس کے لب ساکت تھے۔

”میری بیٹی بات کیوں نہیں کر رہی ڈاکٹر

صاحب؟“

”دیکھو وہ کافی لمبی بے ہوشی کے بعد ہوش

میں آئی ہیں، اس لئے انہیں پوری طرح بیدار اور

ایکٹو ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا، شام تک

انتظار کرتے ہیں اگر کوئی امپر ومنت نہ ہوئی تو ہم

مس مرنہ کے چند ٹیسٹ کروائیں گے کہ

خدا نخواستہ کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے، آپ دعا

کرتے رہیے، ہم اپنا کام تو کر ہی رہے ہیں باقی

صحت شفا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“ ڈاکٹر سہیل

نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔

حمدان یوسف نے بھی ان کی بات سنی تھی

اور بے بسی سے مرنہ کی صورت کو دیکھا تھا جو

سرسوں کی طرح پیلی پڑ گئی تھی۔

مرنہ کو آج تیسرا دن تھا ہوش میں نہیں آیا تھا

اسی بات نے عائشہ رضا کو پریشان اور پشیمان

ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور شرمندہ سی ہسپتال آنے

لے جا سکتے، یہ سب یہیں اسی دنیا میں دھرا رہے
جائے گا۔“ حمدان یوسف تو جیسے بھرا ہوا تھا ان کی
بات کے جواب میں پھٹ پڑا، فیصل نے اس کا
شانہ تھکا، اسے خاموش رہنے کو کہا۔

”آئی! آپ دعا کریں مزنہ کو آپ کی
معافی کی نہیں دعاؤں کی ضرورت ہے وہ مکمل
تندرست ہو گئیں نا تو سمجھئے گا کہ اللہ نے بھی آپ
کو معاف کر دیا ہے۔“ فیصل نے نرمی سے کہا تو
وہ پریم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اثبات
میں سر ہلا کر وہیں ایک بیچ پر بیٹھ گئیں اور پورے
دل سے اللہ سے معافی اور مزنہ کی صحت یابی
دعا میں مانگنے لگیں۔

مزنہ اب پوری طرح ہوش میں آ گئی تھی،
سب کو دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی، سب کے چہروں
پر، ان کے اپنے لئے فکر و محبت کا اندازہ لگا سکتی
تھی وہ، حمدان یوسف کی محبت پر اسے کامل یقین
تھا اور جانتی تھی کہ وہ کتنے دکھ اور پریشانی میں رہا
ہوگا اس کی اس حالت کی وجہ سے، اس کے ٹیسٹ
تمام کھیتھے تھے، کمزور بہت زیادہ تھی، زخم بھرنے
میں کچھ دن تو لگنے تھے، ابھی دوا، غذا، ڈاکٹر کی
ہدایات کے مطابق دی جا رہی تھیں، صابرہ بھی
اس کے پاس کئی بار آ چکی تھیں لیکن وہ خاموش تھی
کمزوری بہت تھی یا شاید اتنی تھکن تھی اس کے
اندر کہ وہ بولنے کی بھی تاب نہ لا رہی تھی، اس
کی خاموشی حمدان یوسف کے لئے سوہان روح
تھی۔

”مزنہ! آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟ پلیز
کچھ تو کہیے۔“ حمدان یوسف نے اس کا ہاتھ تھام
کر بچی لہجے میں کہا تو وہ اس کے چہرے پر پھیل
ویرانی، پریشانی اور پشیمردگی دیکھتے ہوئے بہت
مدھم آواز میں بولی۔
”آپ گھر جا کر آرام کریں، نیند پوری

پر مجبور ہو گئی تھیں، فیصل اور حمدان یوسف انہیں
دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

”آپ کیا دیکھنے آئی ہیں؟ یہی نا کہ آپ کا
بیٹا زندہ ہے یا مر گیا؟“ حمدان یوسف انہیں
دیکھتے ہوئے بہت ضبط سے بولا تھا، وہ شرمندگی
سے نظر جھکا کر بولیں۔

”اللہ نے کرے کہ تمہیں کچھ ہو اور مزنہ کو بھی
کچھ نہیں ہوگا وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”میں شرمندہ ہوں میں نے جو بھی کیا،
بہت غلط کیا، مزنہ تو بہت معصوم اور پیار کرنے
والی اچھی نیک دل لڑکی تھی میں نے اسے غصے اور
انتقام کی آگ میں اندھا ہو کر بہت زیادہ دکھ دیا،
تکلیف دی، مجھے معاف کر دو بیٹا، پلیز مجھے
معاف کر دو۔“ عائشہ رضا شرمندہ تھیں یا نہیں
حمدان یوسف کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی،
وہ صرف مزنہ کے لئے فکر مند اور بے قرار تھا، اس
کے لئے دودن اور دو راتوں سے جاگ رہا تھا،
بڑھی ہوئی شبیو، سرخ آنکھیں، بکھرے بال،
بھوک پیاس سے بے پرواہ وہ اپنی محبت کی سلامتی
کے لئے تڑپ رہا تھا دعا میں مانگ رہا تھا۔

”مجھ سے کیوں معافی مانگ رہی ہیں،
معافی مانگتی ہے تو مزنہ سے مانگیں جس نے بمشکل
ابھی آنکھ کھولی ہے جو آپ کی وجہ سے پچاس گھنٹے
بے ہوش رہی ہے، اگر وہ آپ کو معاف کر دے
گی تو میں بھی آپ کو معاف کر دوں گا، معافی مانگتی
ہے تو اللہ سے مانگیں، توبہ کریں اللہ کے حضور،
کیونکہ یہ مال و دولت یہ سب آپ کی کمائی نہیں
تھی مئی، یہ اللہ کی عطا تھی جس کے چھننے کے خیال
نے آپ کو اتنا پاگل کر دیا کہ آپ نے اپنے مقام
کو بھلا دیا، خود کو انسانیت کی توہین کرنے پر آمادہ
کر لیا، یہ جو کچھ ہے نا آپ کے پاس دولت، گھر،
پراپرٹی یہ سب آپ یا میں اپنے ساتھ قبر میں نہیں

کریں پھر فریش ہو کر یہاں آئیں، ایسی اجڑی صورت دیکھ کر میں کیسے ٹھیک ہوں گی الٹا اس گلٹ میں رہوں گی کے میری وجہ سے آپ کی یہ حالت ہے۔“

”شکر الحمد للہ، آپ نے بات تو کی اور میری جان اپنی اجڑی صورت کی کسے فکر تھی مجھے تو آپ کی فکر تھی گھر جا ہی نہیں پایا اس ڈر سے کہ کہیں، آپ مجھے چھوڑ کر نہ چلی جائیں۔“ حمدان یوسف نے اس کی آواز سن کر خوشی سے مسکرا کر کہا۔

”آپ نے جانے ہی نہیں دیا، اتنی آوازیں دیں کہ مجھے لوٹنا ہی پڑا۔“ مزنہ نے دھیمی آواز میں کہا تو وہ خوشدلی سے مسکرا دیا۔

”اس نعمت و احسان کے لئے میں اللہ تعالیٰ کا تمام عمر بھی شکر ادا کرتا رہوں تب بھی حق ادا نہ ہوگا مزنہ، آئی لو یو ریلی لو یو مجھے عشق ہے تم سے۔“ وہ اس کا ہاتھ چوم کر دل سے بولا۔

مزنہ کے وجود میں زندگی کی نئی روح پھونک دی ہو جیسے اس کے کس نے اس کے پیار بھڑے اظہار نے وہ حقیقتاً پھر سے جی اٹھی تھی اور سب تلخیاں بھلا کر اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

”مجھے معلوم ہے شروع دن سے۔“ وہ بولی۔

”معلوم تھا پھر بھی ترس نہیں آیا مجھ پر۔“ ”نہیں۔“ وہ شریر انداز میں مسکرائی۔

”ظالم۔“ حمدان یوسف نے اسے پیار بھری خنقی سے دیکھا تو وہ دھیرے سے ہنس دی اور اس کی ہنسی نے حمدان یوسف کو روح تک سے سرشار و شاد کر دیا۔

☆☆☆

دو ہفتے بعد آج مزنہ کو ہسپتال سے چھٹی مل

رہی تھی اور وہ صابرہ کے ساتھ جانا چاہتی تھی اپنے پرانے گھر، اپنے میکے حمدان یوسف کو پتا چلا تو فوراً چل کر بولا۔

”ہرگز نہیں، آپ میرے ساتھ جائیں گی اپنے گھر۔“

”لیکن۔“

”کوئی لیکن ویکن نہیں، امی کی صحت پہلے ہی اچھی نہیں ہے آپ ان کے گھر جا کر ان سے خدمت کروائیں گی کتنی بری بات ہے نا۔“ حمدان یوسف نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو مزنہ نے صابرہ کی طرف دیکھا وہ حمدان یوسف کی محبت اور پروا پر مسکرا رہی تھیں۔

”امی آپ ہی کہیں نا ان سے مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے۔“ مزنہ نے صابرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پیار سے کہنے لگیں۔

”مزنہ بیٹی، اب تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ ہی جانا ہے جہاں بھی جانا ہے، اللہ نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ نصیب کیا ہے اس کا شکر ادا کرو اور ہنسی خوشی ایک دوجے کے ساتھ زندگی بسر کرو میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں۔“ ”اور میری بھی۔“ نوادر اشد نے مزنہ کے سر پر دست شفقت رکھا۔

”میں تو پھر آپ اپنی بیوی کا خیال رکھیں میں اپنی بیوی کا خیال رکھتا ہوں، کیوں بیگم صاحبہ، اب گھر چلیں۔“ حمدان یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کی جانب اپنا دایاں ہاتھ بڑھا دیا، صابرہ اور نوادر اشد اپنے داماد کی بیٹی سے محبت دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

”چلیں۔“ مزنہ نے حمدان یوسف کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جسے حمدان یوسف نے مسکراتے ہوئے مضبوطی سے تھام لیا۔

حمدان یوسف کا ہاتھ تھامے وہ حمدان ولا

میٹھا دیا، کمرہ تازہ گلابوں کی خوشبو سے معطر تھا،
مزمنہ کی حیرت و مسرت سواٹھی۔

”درد تو نہیں ہو رہا؟“ حمدان یوسف نے
اس کی کمر کے پیچھے تکیہ لگاتے ہوئے بہت پیار
سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں
سر ہلایا۔

”شکر الحمد للہ لیں جوس پیس۔“ حمدان
یوسف نے شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر
سے جوس کا گلاس کور ہٹا کر اس کی جانب بڑھایا۔
”بس۔“ مزمنہ نے دو گھونٹ پی کر کہا۔

”تھوڑا سا تو اور پیس۔“ حمدان یوسف
نے اتنے پیار سے کہا کہ اسے دو گھونٹ مزید پینا
پڑے۔

”حمدان!“ مزمنہ نے دل سے اس کا نام لیا
تھا اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا، جیسے زندگی
نے اسے بکا رہا ہو۔

”جی امیری جان۔“ حمدان یوسف نے اس
کے پاس بیٹھ کر اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو
جماں کر لیا، وہ حیا سے سٹ گئی۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“
”جی ضرور۔“

”جو بھی کچھ ہوا جومی نے کہا آپ اس
بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کریں گی۔“
مزمنہ نے اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔“ وہ بولا۔
”کیوں؟“ مزمنہ نے گھنی پلکیں اٹھا کر اس
کے حسین چہرے کو دیکھا۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری مزمنہ ایسا
کچھ کر ہی نہیں سکتیں۔“ حمدان یوسف کے حد
درجہ یقین اور اعتبار پر اس کی آنکھیں چمک
پڑیں۔

میں داخل ہوئی تو حیا سے مسکرا دی۔
گھر کے ملازمین ہار پھول لئے اس کے
استقبال کو کھڑے تھے، دو کالے بکرے صدقے
کے لئے منگوائے گئے تھے، حمدان یوسف کے
کہنے پر مزمنہ نے بکروں پر ہاتھ پھیرا، عائشہ رضا
نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ مزمنہ اور حمدان یوسف
کے سر سے وار کر ملازم کو دیئے کہ کسی ضرورت
مند کو دے دیں، مزمنہ کو اتنے اچھے ویکم کی ہرگز
توقع نہیں تھی، عائشہ رضا پہلے ہی اس سے اپنے
کیے کی معافی مانگ چکی تھیں، اور وہ حمدان یوسف
کی محبت کی خاطر سب بھلانے کو تیار ہو گئی تھی،
نوادرا شند کو بھی اس نے احساس دلا دیا تھا کہ
زندگی دولت کے بنا تو گزاری جاسکتی ہے مگر
زندگی پر خلوص رشتوں کے بغیر صرف ہاری جاسکتی
ہے، زندگی جینے کے لئے رشتوں کا ساتھ ہونا
بہت ضروری ہے۔

گلابی لباس میں وہ کھلتا گلاب لگ رہی تھی،
چہرے کی رونق اور چمک صرف حمدان یوسف کی
محبت کا کرشمہ تھی اور اپنے ابو کا ایک اچھے انسان کا
عہد تھا جس نے اسے اپنی ماں کی طرف سے کافی
حد تک اطمینان بخشا تھا، حمدان یوسف اس کا ہاتھ
پکڑ کر اسے اوپر بیڈ روم میں لے آیا جو دو ہفتے
میں بالکل بدل گیا تھا نیا پیٹ، نیا فرنیچر، پردے،
تالین، سینری، صوفے، ایل ای ڈی ٹی وی گوکہ
ہر چیز نئی اور شاندار تھی، جہازی ساز کے ڈبل بیڈ
پر سرخ گلاب کی پتیوں ”آئی ایم سوری“ اینڈ
”آئی لو یو“ لکھا ہوا تھا، پھولوں کی پتیوں سے
بنے بڑے سے دل میں لکھے یہ منفرد اظہار یہ
الفاظ مزمنہ کے دل کو چھو گئے۔

کمرے کی ایک ایک چیز سیٹنگ، سجاوٹ
میں حمدان یوسف کی محبت جھانک رہی تھی، حمدان
یوسف نے اسے بہت احتیاط و آرام سے بیڈ پر

”آئی ایم سوری، میں نے آپ کو ہرٹ کیا ہے۔“

”نہیں تم نے مجھے ہرٹ نہیں کیا بلکہ خوش کیا ہے زندگی میں محبت کا احساس دلایا ہے، جینے کا مقصد سمجھایا ہے، تم نے بہت درد سہا ہے، بہت تکلیف برداشت کی ہے بہت جھیلا ہے لمبی کے برے سلوک کو، پلیز جان میری محبت کی خاطر می کو معاف کر دو، میں نے تمہارے ابو کو معاف کر دیا ہے، تم بھی میری می کو معاف کر دو، سچ پوچھو تو تمہارے ابو کا جرم اتنا بڑا نہیں تھا جتنا بڑا درد تم نے می کے ہاتھوں جھیلا ہے، بہت شرمندہ ہوں میں خود سے کہ میں اپنی محبت کی حفاظت نہیں کر سکا، اس کا خیال نہیں رکھ سکا، اس لئے مجھے اور می کو معاف کر دو پلیز، کرو گی نا معاف؟“ حمدان یوسف نرمی سے کہتے ہوئے اس کی صورت کو پر امید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے تو می کو کب کا معاف کر دیا، رہی بات آپ کی تو مجھے آپ سے کبھی بھی کوئی شکایت نہیں رہی، آپ تو بہت اچھے ہیں۔“ مزرنہ نے دھیمے پن سے دل سے جواب دیا۔

”تھینک یو مزرنہ، تھینک یو سوچ، انشاء اللہ تعالیٰ اب سب اچھا ہو گا، یہ پھول پسند آئے ہماری زندگی کو؟“ حمدان یوسف نے اس کی پیشانی چوم کر محبت سے کہا۔

”جی مگر، یہ سوری کیوں لکھا؟“ مزرنہ پھولوں کی پتیوں سے لکھے، آئی ایم سوری کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سوری ہر اس بات کے لئے ہے جو اس گھر میں کسی بھی طرح آپ کو تکلیف اور دل آزاری کا، دکھ کا باعث بنی ہے۔“ حمدان یوسف نے جواب دیا۔

”میں اتنی اچھی تو نہیں ہوں کہ مجھے ایسے

سوری لکھا جائے۔“

”تم مکتی اچھی ہو یہ میرے دل سے پوچھو۔“ وہ اس کی کلائی میں سونے کے انگن پہناتے ہوئے پیار سے بولا۔

”میں تو تمہارے عشق میں ڈوب چکا تھا اور جب سے تمہاری ڈائری پڑھی ہے تب سے۔“

”ڈائری۔“ وہ ڈائری کا سن کر چونکی۔

”یہ سوری اس بات کے لئے بھی ہے کہ میں بزنس ٹور پر جاتے ہوئے تمہاری ڈائری بھی ساتھ لے گیا تھا اور اس ڈائری کے ایک ایک لفظ نے مجھے تڑپایا ہے رلایا ہے، تم نے اور آئی نے بہت تکلیف دہ اور افیت ناک زندگی گزاری ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ فواد راشد صاحب کو بھی ہدایت مل گئی ہے اپنی کے ذریعے ہی ان کو اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا ہے، دکھوں کی کالی رات کے بعد سکھوں کی روشن صبح نے آنکھ کھول دی ہے اور.....“

”اور کیا؟“ مزرنہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”ڈائری پڑھنے کے بعد مجھے اپنی پسند اور محبت پر فخر ہونے لگا ہے، میرے دل میں تمہارا مقام تمہارا عشق بے پناہ ہے اتنا کہ میں خود بھی بیان نہیں کر سکتا، میں واقعی بہت خوش نصیب ہوں کہ میری زندگی میں تم ہو، اور جانتی ہو ڈائری میں لکھی وہ بات جسے پڑھ کر میں ہواؤں میں اڑنے لگا تھا، وہ کیا تھی؟“

”کیا تھی؟“

”وہ یہ تھی کہ میری مزرنہ بھی مجھ سے پیار کرتی ہے۔“ حمدان یوسف نے اس کی پیشانی سے اپنی پیشانی مس کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بتایا تو وہ حیا سے سرخ ہو گئی۔

”جی نہیں۔“ وہ فوراً مکر گئی۔

”میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ تمہیں

شگفتہ شگفتہ — روای دواں

ابن النشاء

اچھی کتابیں

پڑھنے کی عادت ڈالیں



ابن النشاء کی تازہ تصنیف

دخل وحقولات

شائع ہوگئی ہے

آج ہی اپنے قریبی بکسٹال یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں

لاہور اکیڈمی

چوک اردو بازار لاہور

042-3731797, 37321690

مجھ سے پیار نہیں ہے کھاؤ قسم۔“ حمدان یوسف نے اس کی تھوڑی پکڑ کر کہا۔

”میں جھوٹی قسم نہیں کھاتی۔“ مزنہ نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا، کتنا خوبصورت اقرار محبت تھا حمدان یوسف تو دل و جان سے اس پر فدا ہو گیا۔

”یہ سب خوبصورت ہیں۔“ مزنہ نے کلائی میں پہنائے گئے ننگن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کی رونمائی کا تحفہ ہے۔“

”پھر سے۔“ وہ حیران ہوئی۔

”جی ہاں پہلے تو بس نکاح کی رسم ہی ادا ہوئی تھی باقی رکیں تو ابھی ادا ہونا ہے میری جان۔“ حمدان یوسف نے پھولوں کی پتیاں اٹھا اٹھا کر اس کے چہرے پر پھیلتے ہوئے کہا۔

”باقی رکیں؟“ مزنہ نے ابھن آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”جی ہاں نکاح کے بعد سہاگ رات ہوئی ہے ولیمہ ہوتا ہے اس کے بعد دولہا دلہن ہنسی مون منانے جاتے ہیں تو یہ سب رکیں ہم اب پوری کریں گے کیا خیال ہے؟“

”کیا مطلب؟ ابھی نہیں پلیز ابھی میں مکمل تندرست نہیں ہوئی ہوں پتا ہے ناڈاکٹر نے مجھے ریسٹ کرنے کے لئے کہا ہے؟“ مزنہ ایکدم سے بوکھلاتے ہوئے بولی اور حمدان یوسف اس کی حالت و کیفیت سے محظوظ ہو کر ہنس پڑا۔

”مزنہ میری جان ڈونٹ وری، آپ کی صحت میرے لئے سب سے اہم ہے جتنا ریسٹ آپ کو ڈاکٹر نے بتایا ہے اس سے دوگنا ریسٹ میں آپ کو کرواؤں گا، آپ میرے ساتھ ہیں، میرے پاس ہیں، میری زندگی کا حصہ ہیں مجھے

بیٹھا۔
 ”میں ڈر گئی تھی۔“ مزمنہ نے اس کے سینے پر ہکا سا مکد مارا۔
 ”روز روز کہاں کریں ناں پھر ایسے نہیں ہو گا؟“

”کیا؟“
 ”مجھے عشق ہے۔“ وہ شرارت سے بولا۔
 ”ہاں ہے تو آپ کیا مزمنہ کی جان لیں گے آپ؟“ وہ پیار بھری خطکی سے بولی تو وہ ہنس پڑا۔
 ”ایسا ہو سکتا ہے کیا؟ مزمنہ تو میری جان ہے۔“ حمدان یوسف نے اس کے چاند چہرے کو اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے کر بہت پیار سے کہا تو اس نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے پھولوں سے لکھے آئی لو پوئی پیتاں دونوں ہاتھوں میں جمع کیں اور حمدان یوسف پر نچھاور کر دیں پیار کے اظہار کے اس خوبصورت انداز پر حمدان یوسف خوشی سے کھل اٹھا اور مزمنہ نے شرما کر اس کے محبت بھرے سینے پر اپنا سر رکھ دیا، جہاں وہ اس کے دل کی دھڑکنیں تک سن سکتی تھی اور حمدان یوسف کی دھڑکنوں سے بھی ایک ہی آواز آرہی تھی۔
 مجھے عشق ہے
 مجھے عشق ہے

☆☆☆

اور کیا چاہیے، زندگی ہونی چاہیے صحت و محبت بھرا ساتھ ہو تو رہیں کبھی بھی ادا ہو سکتی ہیں۔“ حمدان یوسف نے اس کے مقابل بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بہت محبت سے کہا تو وہ حیران رہ گئی، حمدان یوسف جیسے مرد بھی ہوتے ہیں دنیا میں اتنے لوگ، کیرنگ، اتنی عزت دینے والے، عورت کا احترام کرنے والے، اور بہت خوش نصیب بھی کے اسے حمدان یوسف جیسا مہذب، نیک، سیرت، لوگ، کیرنگ شریک زندگی ملا تھا، اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہنے لگے۔

”حمدان آپ نے میرے دل سے سارے ڈر دور کر دیئے ہیں آپ آج کی دنیا کے سب سے بہترین مرد ہیں۔“
 ”بڑنگ؟“ حمدان یوسف مسکراتے ہوئے بولا۔

”نہیں سچ ایک اور سچ بتاؤں آپ کو؟“
 ”بتاؤ۔“ اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
 ”مجھے عشق ہے آپ سے، آپ کی ہر بات سے، آپ کی ذات سے، مجھے عشق ہے۔“ مزمنہ نے اس کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے دل سے اپنی محبت کا اقرار کیا تو چند لمحے حمدان یوسف اس کو حیرت و مسرت سے دیکھتا رہا پھر ایک دم سے اس کے سامنے بے ہوش ہونے والے انداز میں گر گیا، مزمنہ گھبرا گئی۔

”حمدان..... حمدان!“ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لئے اسے پکارتی بے حد پریشان لگ رہی تھی۔

”جی حمدان کی جان۔“ حمدان یوسف مسکراتا ہوا آنکھیں کھول کر بولا۔

”یہ کیا تھا؟“ وہ مصنوعی خطکی سے بولی۔
 ”ہزار والٹ کا کرنٹ تھا جو آپ کے اظہار عشق نے لگایا تھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ

شاہی مہر

سندس جبین



جاتیں، ڈھیروں اہتمام کرتیں مگر اللہ کو جانے کیا منظور تھا، اچھے بھلے رشتے آتے، لڑکی بھی پسند آ جاتی، گھر گھر نہ بھی من بھاتا، پھر نجانے کیا ہوتا کہ انکار ہو جاتا، اماں دن رات پریشان رہنے لگیں، کچھ لوگوں کے مطالبات اور کچھ بیٹی کی فرمائشیں کہ لڑکا ایسا ہو ویسا ہو، اماں تو مکمل طور پر عاجز آ چکی تھیں، عاجز تو باجی تسلیم بھی آ چکی تھی، کہ آگے دو بہنیں مزید محو انتظار تھیں شادی کے لئے اور ایک اس کے نام کے پتھر تھا کہ سرک ہی نہ رہا تھا، اماں نے اسے بی اے کروانے کے بعد آگے کسی کو ایف اے سے زیادہ نہ پڑھنے دیا تھا، وہ سمجھتی تھیں بڑی کو پڑھا کر جو تیر مارنا تھا وہ مار چکیں اب مزید کسی کے تیر مارنے کی ضرورت تھی، نہ محجاش۔

اسی طرح جب رشتہ ڈھونڈتے دو سال گزر گئے تو اماں کو مانو چپ سی لگ گئی، باجی کے مطالبات اب گھٹ چکے تھے، ایک دن کسی لڑکے کا رشتہ آیا جو چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، چاروں بھائی مل کر چاول کا کارخانہ چلاتے تھے، اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے، مگر مصیبت یہ تھی کہ لڑکا میٹرک فیل تھا، (فیل ہونے کا بھی ان کے کسی عزیز نے (انڈھولا تھا) ورنہ ان کو تو یہی تھا کہ لڑکا میٹرک پاس تھا، شکل و صورت میں بھی ٹھیک تھا، باجی تسلیم کو بڑا اعتراض تھا کہ صرف میٹرک؟ مگر اس بار اماں نے اس کی ایک نہ چلنے دی، اور یوں رشتہ پکا ہو گیا، خاندان والوں نے بھی شکر کیا کہ چلو کسی ٹھکانے لگی اماں کی لاڈلی ورنہ تو وہ کسی کے قابو آنے والی نہ تھی، مگر یہ تو ان کی بھول تھی، دو ماہ بعد جب شادی ہوئی تو اصل مژدہ کھلا۔

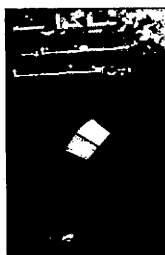
پہلا دھماکہ، لڑکا میٹرک فیل تھا اور یہ باجی تسلیم نے خود اس کے کاغذات میں دسویں کے

باجی تسلیم کی شادی اس ٹرک کی مانند ثابت ہوئی جس نے اپنے پیچھے کی سیاری ٹریفک روک رکھی ہوئی ہے، اس کی شادی تھی بھی ایک مسئلہ، سارے خاندان کی سب سے حسین اور تک چڑھی لڑکی جسے کوئی پسند ہی نہ آتا تھا، ان وقتوں کی بی اے پاس جن زمانوں میں کوئی میٹرک تک بھی بمشکل پہنچتا تھا، وہ کالج جاتی تو گویا سارے خاندان کے سینے پہ مونگ دتی ہوئی جاتی تھی، کالج بھی قیامت ڈھاتی، آدھا کالج اس کی نزاکت اور خوبصورتی پہ مرتا تھا باقی حسد کا شکار تھا ورنہ مرتا تو وہ بھی تھا، باجی تسلیم تھی بھی بڑی ذہین و فطین، ساری نیچر ز بھی اس کے مداحوں میں شامل تھیں، یوں ہر طرف سے ملی اہمیت نے اس کا ایسا دماغ خراب کیا تھا کہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہ تھی، اماں نے بی اے کرنے کے بعد اسے سلائی سیکھنے بٹھایا تو جھگڑنے لگی کہ سلائی والی آئی بس شلواریں سلائی جاتی ہیں یا پھر قمیضوں کی تریپائی کروانی ہے، سکھائی دکھائی کچھ بھی نہیں، اماں نے لاکھ سر پیٹا کہ کسی طرح وہ دوبارہ جانے یہ پیادہ ہو جائے مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ڈھیٹ تھی جا کر نہ دی، اماں بھی تھک ہار کر چپ ہو رہی، گھر رہنے کے طور طریقے بھی اس کے عجیب تر تھے، ہر وقت چھوٹے بہن بھائیوں پہ رعب ڈالنا اور ڈانٹ کر اپنا کام نکلوانا اس کا من پسند مشغلہ تھا، اماں کو اس کے طور طریقے بڑا ہولا یا کرتے تھے، فٹ رشتے والیوں کو بلا بھیجا، سوچا کہ اب عمر ہو چلی ہے اس کی شادی کی فکر کرنی چاہیے، یہ بوجھ سینے سے ہٹے تو دوسری اولاد کا بھی سوچیں گی، بس پھر تو گھر میں ایک نیا کٹا کھل گیا، ہر وقت یہی فکر کہ کوئی اچھا بر مل جاتے تو وہ اس کے فرض سے فارغ ہوں، جب بھی کوئی رشتہ دیکھنے آتا تو اماں بچھ بچھ

شگفتہ شگفتہ رواں دواں



ابن انشا کے سفر نامے



آج ہی اپنے قریبی بکسٹال یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں

لاہور اکیڈمی

پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرگھڑ روڈ اردو بازار لاہور

فون: 042-37310797, 042-37321690

زلزلٹ کارڈ پہ دیکھا تھا، پہلا غرور چھناک سے تب ٹوٹا جب مجازی خدا نے اس کے بی اے پاس ہونے کی کوئی گھاس نہ ڈالی، بلکہ الناندق اڑایا کہ لڑکی ذات ہو کر اتنا پڑھنا لکھنا چہ معنی دارد؟ کوئی افسری کرنی تھی کیا؟ دوسرا دھماکہ، لڑکا بھائیوں کے ساتھ کارخانے میں کوئی کام نہ کرتا تھا بلکہ یونہی چند گھڑیاں بیٹھ کر بھائیوں سے جیب خرچ کے نام سے پیسے اینٹھ کر عیاشی کرتا تھا، گھر اور ذمہ داری سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا، باجی تسلیم کی تو تانا کسی نے کمر ہی توڑ کر رکھ دی کہاں وہ ہر جہہ نیا جوڑا زیب تن کرنے والی اور کہاں یہ درماندگی کہ۔

مہینوں بعد بھی نیا جوڑا نصیب نہ تھا، چلو یہ بھی کسی نہ کسی طرح کڑوا گھونٹ یا نصیب کی بدبختی جان کر وہ بی جاتی مگر تیسرا دھماکہ اف؟ تیسرا دھماکہ باجی کے ساس سر نہیں تھے اور یہی تو وہ چاہتی تھی، سارے خاندان کی لڑکیوں کے درمیان بیٹھ کر اس نے کس نخوت اور بے زاری سے کہا تھا کہ وہ وہاں شادی کروائے گی جہاں ساس سر کا جھنجھٹ ہی نہ ہو، ایسا کوئی قبولیت کا وقت تھا کہ ساس سر تو واقعی نہیں تھے مگر شومنی قسمت کہ تین عدد جیٹھ تھے جن کی بیویاں بہنیں تھیں، منہ بولی نہیں بلکہ سگی بہنیں، مطلب تین جیٹھانیاں بمعہ سگی بہنیں، باجی کو انہوں نے دو مہینوں میں ناک آؤٹ کر دیا، سارا طظنہ اور کرو فر ختم شد۔

پہلے پہل تو باجی نے مقابلہ کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر انہوں نے ایک نہ چلنے دی آخر کو وہ تین تھیں اور باجی اکیلی اور ویسے بھی وہ انگریزی کا محاورہ ہے ناں ”پیچورٹی از اتھارٹی“ تو بس وہی ہوا، الٹا سارے خاندان کے آگے بھی باجی کو بمعہ ان کی بی اے کی ڈگری کے خوب ذلیل کیا،

سب سے بڑی وجہ قینچی کی طرح چلتی زبان قصور وار ٹھہرائی گئی۔

باجی روتی ہوئی گھر آئی تو یہ شرط رکھی کہ واپس تب جائے گی جب شوہر صاحب الگ گھر لے کر دیں گے، شوہر نے جب مطالبہ بھائیوں کے آگے رکھا تو انہوں نے اپنی بیویوں سے مشورہ لیا وہ تو مانو اسی انتظار میں تھیں، اندھا کیا چاہیے دو آنکھیں کے مصداق جھٹ سے ہاں کر دی، انہیں اپنی راج دھانی میں ویسے بھی کوئی چوتھا کہاں منظور تھا، برا ہوا اماں کا جنہوں نے بس تین بیٹیاں پیدا کی تھیں، ورنہ تو مسئلہ ہی کوئی نہ تھا۔

خیر باجی واپس گئیں تو اپنے الگ گھر میں ہی گئیں، مگر صرف سر پر چھت ہونا لازمی تو نہ تھا، تن پہ کپڑا اور پیٹ میں روٹی بھی چاہیے تھی، بالائے ستم یہ کہ شوہر کچھ کرتا نہ تھا، ایک کے بعد ایک تین بچے پیدا ہوئے تو زندگی کی گاڑی کھینچنا اور بھی کھن مرحلہ بنتا چلا گیا، اب یوں ہوتا کہ ہر دوسرے ہفتے وہ بچوں کو اٹھائی رکشہ لے کر سیدھا ماں کے گھر سدھارنی، چھوٹی بہنیں، اسے دیکھ دیکھ شادی سے ہی نفرت کرنے لگی تھیں۔

تسلیمہ سے چھوٹی نسیمہ تھی، ایف اے پاس نسیمہ جس نے باجی کو دیکھ کر سارے گرماں کے گھر سے ہی سیکھ لئے تھے، سلائی کڑھائی میں ایسی طاق کہ جس کپڑے کو سیتی مانو جان ڈال دیتی، اپنے جہیز کی بیڈ شیٹوں پہ ایسے خوبصورت پھول کاڑھے کہ دیکھنے والے آتش آتش کراٹھتے، کھانا پکاتی تو ایسا کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے، سارا خاندان اس کی خوبیوں کا معترف تھا، اماں نے اس کا رشتہ جاننے والوں میں کر دیا تھا، شکل و صورت کی نسیمہ بھی پیاری تھی مگر اماں باجی تسلیمہ کا انجام دیکھ چکی تھی اس لئے زرا دیر نہ کی، لڑکے کی شکل و صورت نہایت عام سی تھی مگر تب تک

اماں کا ذہن بدل چکا تھا ان کا خیال تھا کہ لڑکا بس اچھا کماتا ہونا چاہیے، باجی کے شوہر کی طرح نکٹھو نہ ہو، تو انہوں نے شادی کی تاریخ دینے والی کی منگنی وغیرہ کا بکھیرا بھی نہ کیا، کہ فضول رسموں کی کیا ضرورت تھی بھلا۔

نسیمہ کی ساس اور سسر دوئوں حیات تھے، ساس تو صدقے واری جاتی تھی، خوب ارمانوں سے بیاہ کر لے کر گئی، نسیمہ کی بری ایسی بنائی کہ لوگ دیکھتے رہ گئے، کمرہ ایسا سجایا کہ آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، سب کو لگا کہ بس نسیمہ کا نصیب تو چمک اٹھا، نسیمہ جب بھی آتی، خوب تیار شہار ہو کر بری کے زرق برق جوڑے پہنھا کر لاشکی چمکتی آتی اور تسلیہ کو احساس کمتری کا شکار کر جاتی، وہ سوچتی کہاں یہ ایف اے مر کے پاس کرنے والی نسیمہ جو شکل و صورت میں اس سے کمتر بھی تھی کیسے راج کر رہی تھی اپنے گھر۔

رفتہ رفتہ معاملات بگڑنے لگے، پتا چلا کہ نسیمہ کی بیاہنا نذوجہ فساد تھی جس کا گھر میں ضرورت سے زیادہ عمل دخل تھا وہ اس کے سسرالی گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر رہی تھی اور اکثر و بیشتر انہی کی طرف پائی جاتی تھی، وہ ان کے ہر گھریلو معاملے میں مداخلت کرتی تھی، ساس مکمل طور پر اس کے قابو میں تھیں عملی طور پر گھر میں حکومت نند کی ہی تھی، نسیمہ نے بے انتہا کوشش کی کہ معاملات اس کے قابو میں رہیں، وہ ہر وقت گدھوں کی طرح مشقت کرتی رہتی، نت نئے کھانے گھر کی صفائی ستھرائی، کپڑوں کو سینا پرونا، مگر اس کے باوجود کوئی خوش ہی نہ ہوتا تھا ہر وقت نکتہ چینی کے ماحول نے رفتہ رفتہ خوش طبع نسیمہ کو بد مزاج کر دیا، وہ اب دو بدو جواب دینے لگی، آخر تھی تو وہ بھی تسلیمہ کی بہن، زبان چلانا خوب جانتی تھی،

شگفتہ شگفتہ رواں دواں



اردو کی آخری کتاب

طنز و مزاح



آج ہی اپنے قریبی بکسٹال یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں

لاہور اکیڈمی

پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرگرم روڈ اردو بازار لاہور
فون: 042-37310797, 042-37321690

سراسر اور نندنے جو زبان کے جو ہر دیکھے تو گلے پیٹ لئے اب پھر وہی مسئلہ ہونے لگا آئے روز جھگڑے اور لڑائیاں، مگر نسیہ باجی تسلیم کی طرح بے وقوف نہ تھی کہ منہ اٹھا کر ماں کے گھر چل پڑتی اس نے مورچے یہ رہ کر جنگ لڑنے کو ترجیح دی، اس نے تسلیم کی طرح ماں کے گھر روز روز منہ اٹھا کر آنا مناسب نہ سمجھا، یوں لوگوں کی باتوں سے بچ گئی اور گھر والوں کے لئے بھی پریشانی کا باعث نہ بنی، ہاں رہی بات جھگڑوں کی تو وہ تو جی ہر گھر میں ہوتے ہیں، کہاں نہیں ہوتے، کمال تو یہ ہے کہ انسان گھر بسانا سیکھے جو کہ اس نے بسا لیا، روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر سراسر اس اوپر والے پورشن میں علیحدہ کر دیا تھا، کھانا پکانا الگ، دولا بکا، جان چھٹی۔

پھر سنا کہ وہ چھوٹے بھائی کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے، نسیہ کو رتی بھر دلچسپی نہ ہوئی مگر سنا تھا کہ بری بڑی شاندار بنا رہی تھی اس کی نند، آخر کو چھوٹی بھانجی، نسیہ کو پتا چلا تو قہقہے مار مار کر ہنستی رہی اور شوہر کا خوب دل جلانی رہی یہ کہہ کر کہ ابھی تمہاری ناگن جیسی بہن یہ چونچلے کرے گی اور بعد میں ایک ایک سوٹ کی قیمت وصولی گی۔

نسیہ سے چھوٹی شمینہ کا حال سنئے۔
اماں نے جب بڑی تسلیم اور نسیہ کا حال دیکھا تو چھوٹی کو بیاہنے سے ڈرنے لگی، وہ دونوں لڑکیوں کے معاملات سن سن کر تھک گئیں تھیں، جیسی سوچا شمینہ تو ابھی بس بیس سال کی ہے پچیس کی ہوگی تو بیاہنے کا سوچیں گی۔

شمینہ نے فرصت میں چغلیاں کرنے اور سننے سے بہتر جانا کہ پرائیوٹ کسی مضمون میں ایم اے کر لے، اس نے اپنے تئیں آسان سمجھ کر اردو

کا چناؤ کر لیا اور لکی سب سے بھاری بھر کم اردو میں بات کرنے اور لکھنوی آداب اپنانے، اماں نے سر پیٹ لیا کہ وہ اچھی بھلی لڑکی نمونہ بن گئی تھی، اس کے ادب آداب، اٹھنا بیٹھنا سب بدل گیا۔

باجی تسلیم کو طے کرنے کا ایک اور شکار مل گیا مگر شمیمہ بڑی عجیب تھی اسے فرق ہی نہ پڑتا تھا، ویسے بھی وہ دونوں بہنوں سے کم صورت تھی اور گن کے نام پہ خاک چھاننا بھی نہ آتی تھی اسے، سوا سے یقین تھا کہ نہ اسے کوئی شہزادہ ملے گا نہ ولن، وہ دونوں بہنوں کے جھگڑے دیکھ کر شادی نامی چیز سے متنفر ہو چکی تھی، اگر اماں کا ڈر نہ ہوتا تو بیاہنگ دہل بھی شادی نہ کرنے کا اعلان کرتی مگر اماں کی مار کا ڈر تھا جو اسے ایسی کوئی بھی بات کرنے سے روکتا تھا۔

اس کا ایم اے اردو مکمل ہوا تو اماں ناچاچتے ہوئے بھی اس کے لئے رشتے دیکھنے بیٹھ گئیں، بیٹی کی ماں تھیں، رشتہ آیا بھائی دو بہنیں تھے ایک بھائی اور بہن بیاہے جا چکے تھے اور دو کنوارے تھے، دوسرے بھائی کو شمیمہ کے لئے پسند کیا گیا، وہ ایک کمپنی میں ملازم تھا اور بڑی معمولی سی تنخواہ لیتا تھا، مگر ابا اور بڑے بھائی کا جو توں کا شوروم تھا جو اچھا خاصا چلتا تھا، اس لئے اماں نے ہاں کر دی، ویسے بھی وہ کون سا حور پری تھی جو اس کے لئے بر آتے، اماں تسلیم کی طرح ہر روز گھر میں رشتے دیکھنے والوں کو بلا کر خاطر مدارت کرنے کی سکت نہ رکھتی تھیں، اس لئے جب کر کے رشتہ کر دیا، شمیمہ کا اگرچہ دل تو نہ مانتا تھا مگر پہلے ہی ماں اتنی دکھی تھی کہ وہ مزید تکلیف نہ سہہ سکتی تھی، جیسی چپ کر کے سر جھکا دیا۔

کچھ مہینوں بعد شادی رکھ دی گئی، سونے کی کوئی چیز سسرال والوں کی طرف سے نہ پہنائی

گئی اور بری میں بھی گنتی کے چند جوڑے تھے باجی نے تو طوفان مچا دیا، مگلاوے پہ آئی شمیمہ کے آگے چیخ چیخ کر اس کے سسرال والوں کو برا بھلا کہا، شمیمہ خاموشی سے سنتی رہی، نسیمہ کے بھی کچھ یہی اعتراض تھے کہ جن سسرال والوں نے بہو کو سونا نہ پہنایا وہ تو اسے کوئی اہمیت ہی نہ دیں گے، دونوں بہنوں کو بڑا قلق تھا کہ ماں نے تیسری بہن کے لئے کیسے بہو کے ننگے لوگ منتخب کر لئے تھے جو کہ اتنی حیثیت بھی نہ رکھتے تھے کہ بہو کو چار اچھے جوڑے ہی پہنا دیتے۔

مگر بہو صاحبہ کو کیا فرق پڑتا تھا، اس کی جانے ہلا، وہ ہر بات سے بے پرواہ اس چاندی کی انگٹھی کو دیکھتی جاتی تھی جس میں ایک سیاہ نگینہ جڑا تھا، جو اس کے شوہر نے اس کے لئے اپنے پیسوں سے خریدی تھی اس وعدے کے ساتھ کہ وہ اسے ضرور سونے کی انگٹھی بھی بنوا کے دے گا۔

خیر زندگی کا پہلی ایک بار پھر چل پڑا اور وہ دونوں بہنیں جو کہ اس امید پہ بیٹھی تھیں کہ بس شمیمہ کی نند اور جیلانی اپنی اصلیت دیکھا میں اور وہ شمیمہ کو اپنے نادر و نایاب قسم کے مشوروں سے نوازیں اس کی نوعیت ہی نہ آئی۔

شمیمہ تو ایسی گھنی میسنی نکلی کہ خدا کی پناہ، جانے کیا جادو چلایا اس نے اپنے سسرال پہ کہ ساس سے لے کر چھوٹے دیور تک، تب اس کے کلمے پڑھتے تھے، ساس تو جھولی بھر بھر دعائیں دیتی اس کی ماں کو جس نے ایسی تربیت کی تھی۔

بہنیں تو دور اماں کو خود یقین نہ آتا کہ ان کی کم عقل و کم شکل بیٹی ان کا یوں نام روشن کرے گی، تینوں ماں بیٹیاں راز جاننے کو بے قرار تھیں مگر راز کھلتا بھی تو سہی۔

یونہی ایک دن موقع پا کر دونوں اس کے

سسرال چلی گئیں کہ ذرا اس کا طور طریقہ تو دیکھیں کہ آخر ایسی کونسی بات تھی جس کی بنا پر اس کا سارا سسرال اس کا عقیدت مند ہوا پھرتا تھا۔ وہاں جانے پہ پتا چلا کہ ثمنینہ تو ساس کے ساتھ بازار گئی تھی جب کہ اس کی بیابتا نند اور جیٹھانی موجود تھیں، چائے اور دیگر لوازمات پیش کرنے کے بعد دونوں بڑی خوشدلی سے ان سے پیش آئیں یونہی نسیہ نے باتوں میں بڑی ہوشیاری سے پوچھا۔

”آپ کو ثمنینہ کی کون سی عادت سب سے اچھی لگتی ہے؟“ نند اور جیٹھانی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس پڑیں۔

”کوئی ایک ہو تو بتائیں۔“ جیٹھانی نے کہا۔

”ہماری بھابھی تو شہزادی ہے، لاکھوں میں ایک۔“ نند بڑے فخر سے کہہ رہی تھی۔

شہزادی کا لفظ سن کر تسلیمہ جل بہن گئی یہ جسے اپن حسن پہ بڑا غرور تھا۔

”کوئی ایک خوبی ہو تو بتائیں۔“ نند تو گویا موقع کی تلاش میں تھی لگی ثمنینہ کے قصیدے پڑھنے۔

اور خوبی کا لفظ سن کر نسیہ کو اپنی ساری خوبیاں خاک میں ملتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں، لو بھلا اس پھوہڑ میں کون سی خوبی؟ کیسی خوبی؟ نسیہ کو حیرت نے آن گھیرا۔

”چلیں آپ ایک دو خوبیاں ہی بتا دیں تاکہ ہمیں بھی پتا چلے کہ آخر ایسا کیا اچھا لگا ہوگا آپ سب کو؟“ بابی تسلیمہ نے تجسس سے بے حال ہوتے ہوئے پوچھا۔

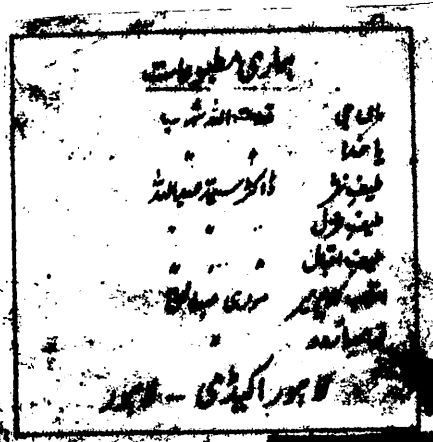
”ہماری بھابھی کی سب سے بڑی خوبی ان کی مہذب اور میٹھی زبان ہے، وہ اتنا پیارا بولتی ہیں کہ دل کرتا ہے کہ وہ بولتی رہیں اور بندہ

سامنے بیٹھ کے سنتا رہے۔“ نند بھابھی کی تعریفوں میں رطلب اللسان تھی اور دھڑ دھڑ باجی تسلیمہ کے سر پہ جیسے دھماکہ ہوا، وہ پرلے درجے کی کوجبی، کم صورت بہن جسے آج تک انہوں نے کچھ سمجھا نہ تھا، وہ اپنی زبان کے سر پہ بازی مار گئی تھی، انہیں اپنی بدزبانی کے سارے قصے یاد آئے تھے دل جیسے ڈوب سا گیا تھا اور یاد تو نسیہ کو بھی آیا تھا کہ بھگڑے تب شروع ہوئے تھے جب اس نے بابی تسلیمہ کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے زبان درازی شروع کی تھی۔

”آپ یقین کریں ایسا نہیں ہے کہ ہمارے گھر میں معاملات خراب نہیں ہوتے، ہوتے ہیں مگر ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کی خوبصورتی سے کبھی معاملات خراب نہیں ہوتے۔“ نند کی تعریفیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں تھیں۔

اور دونوں بہنیں سکتے زدہ سی اس ”اسمِ عظم“ کو دیکھ رہی تھیں جس نے ان کی خوبصورتی اور خوبیوں کو گناہا دیا تھا۔

☆☆☆



چودھویں قسط کا خلاصہ

نعمان نے پرانے کاغذات میں سارنگ کی تصاویر دیکھی اور سارنگ سے بات کی کہ اگر وہ شفیع کو چھوڑ دے تو کیا وہ اسے اپنا سکتا ہے۔
پر بھات کو حبیب اور شمع کے ناکام تعلق کا پتا چلتا ہے۔
سکھاں نے پر بھات کے باپ کی حمایت میں بات کی ہے، شمع اور حبیب کی شادی ابتدا میں ہی ٹوٹ جانے کا بتا کر وہ دلگرفتہ ہے۔
سکھاں نے بلند آواز میں کہا ہے میں نے حبیب کو معاف کیا۔
حبیب نے مراقبہ کے دوران سکھاں کے احساس کو نہیں محسوس نہیں کیا ہے۔
چیزل اور پر بھات کی پہلی بار کھل کر تفصیل سے بات ہوئی ہے۔

پندرھویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے





”معافی کا مطلب ہوتا ہے چھوڑ دینا، دست برداری، قطع کرنا، وہ مجھے چھوڑ رہی ہے، وہ مجھ سے دستبردار ہو رہی ہے، میرے عشق سے، دستبردار ہو رہی ہے، اسے آزادی چاہیے پر بھات۔“
آواز اور لہجہ گلو گہر تھا۔

”وہ تھک گئی ہوگی، وہ بھی ایک انسان ہیں، نباہتے نباہتے بے زار ہو گئیں، ایک ایسا بے نام عشق جسے چھپا کر بھی رکھنا تھا اور وہ اس عشق کی بر بادی اور رسوائی لے کر پھرتی رہیں۔“
”وہ عشق ہی لے کر پھرتی رہیں اور کچھ نہ ملا انہیں، سوائے عشق کے، کچھ اور ہاتھ نہ لگا ان کے، سوائے بر بادی کے، نہ عشق والا بھی ملا، اور نہ ہی عشق کا سکون، صرف اور صرف ہجران کا نصیب ہوا۔“

”اور میں..... میں تمہیں کہاں سے مکمل لگ رہا ہوں، کیا میرے اندر تم نے توڑ پھوڑ نہیں دیکھی پر بھات۔“

”دیکھی ہے، لیکن انہوں نے بہت جھپلا ہے، ایک عورت کا آخر کیا قصور ہے، کہ وہ صرف جھیلے..... وہ ساری عمر روگ لگا کر بیٹھی رہے تو عشق ہے ورنہ بے وفا۔“
”میں نے اس سے وفا کی سند نہیں لی، نہ ہی اے روگ لگا کر بیٹھنے کو کہا، میں تو خود چاہتا تھا کہ وہ بس جائے، وہ اپنا گھر اور دل بسائے۔“

”یہی تو مسئلہ ہے ابا جی کہ مرد اجڑے تو سنور بھی جاتا ہے عورت اجڑے تو بس نہیں پاتی، وہ بے بس بھی تو دہری چکی میں ہستی ہے، ایک الزام اس کی ساری زندگی کا سکون لے لیتا ہے، خدا جانے انہوں نے آسانی پر ہجر کو کیوں فوٹ دی، لیکن جھپلا بہت ہے، آپ سے دو گنا، ان کے سامنے تو آپ کی صفائی دے آئی ہوں، لیکن سچ ہے کہ انہیں بہت فرق پڑا، ان کی زندگی متاثر ہوئی، کچھ بھی تو نہیں رہا ہے ان کے پاس، کچھ بھی نہیں، تمہیں دکھ ہے ناں پر بھات۔“ ان کی گیلی آنکھیں مزید بھرا آئیں۔

”بہت دکھ ہے ابا، بہت زیادہ، محبت جسے انتظار کروائے، دکھ ہوتا ہے، ہجر عمریں کھا جاتا ہے، سب کچھ کھا جاتا ہے، ہجر کچھ نہیں چھوڑتا، خالی کر دیتا ہے بندے کو اندر سے بھی باہر سے بھی اور پھر ہجر اگر تمام عمر پر بھاری ہو تو ہجر جھیلنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔“

”عمر تو بیت گئی چار لمبے، چار مہینے زیادہ سے زیادہ کوئی چار سال ہی تو بچے ہو گئے۔“

”کیوں پر بھات ایسا تو مت کہو بار، لوگ سو سو سال جیتے ہیں۔“

”لوگ جیتے ہو گئے ابا ہجر والے ختم ہو جاتے ہیں، ڈھیر ہو جاتے ہیں، ہجر والے، رہا کر دیں ناں تا کہ وہ یہ چار سال چار مہینے آرام سے نکال نہ سکیں، چار لمبے نہ کہہ سکی۔“

”اللہ سو ہنراں اس کی عمر دراز کرے میں نے اسے معاف کیا، میں نے اسے معاف کیا۔“ وہ کہتے ہوئے رو پڑے تھے۔

اور دوسری طرف سکھاں کی گہری نیند میں بھی بند مٹھی کھل گئی تھی، جیسے کوئی عہد پیمان گر گیا ہو ہاتھ کی انگلیاں ڈھلک گئیں اور انہوں نے آنکھیں کھول کر خالی ہاتھ کو دیکھا تو ڈبڈبایا ہوا منظر پایا اور ایک جملہ انہوں نے سارنگ کی موجودگی میں کہا تھا، جو اس کے کانوں نے بھی سنا۔

”اس نے مجھے معاف کر دیا، میں اب آزاد ہوں۔“ ساتھ ہی آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا گلے میں اور خالی آنکھوں سے نمی قطرہ بن کر پٹک گئی، پٹک کر بہہ گئی اور بہہ کر ضائع ہو گئی اور جورہ گیا وہ چلپٹاتا ہوا کرب تھا۔

تکلیف کی انتہا تھی، یا پھر ختم ہونے کی، تکلیف ختم ہونے کی، ایک ملال تھا جو گزرے ہجر کی منادی کرنے لگا تھا، دوسری جانب ادھوری صورت والے بت کی نسوانی آنکھوں میں مٹی کی لہر درد بن کر دوڑنے لگی تھی، احساسات کہیں سے کہیں سفر کرنے لگ گئے تھے۔

جینگی کی بات یاد آئی کہ حبیب شاہ بت اگر بناؤ بھی تو آنکھیں مت بنانا، بنا بھی لو تو آنکھیں جھکا کر رکھنا اور اگر اٹھ بھی جائیں تو ان پتھریلی نظروں کا اثر مت لینا۔

”آنکھیں مل جائیں تو حبیب شاہ پتھر بت بن جاتے ہیں اور بت بشر بننے لگ جاتے ہیں، بس ایک سانس نہیں لے سکتے، بانی سارا کچھ کہہ دیتے ہیں، جو آپ کے اندر ہوتا ہے اور باہر بھی، آنکھیں کہانیاں کہتی ہیں، پھر وہ چاہے بندوں کی ہوں، یا پھر بتوں کی ہی۔“

☆☆☆

گھر لوٹنے پر دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”تم؟“ وہ سامنے کھڑا تھا۔

”ہاں کیوں؟ میں گھر نہیں آ سکتی۔“

”نہیں میں نے سوچا تم شاید مریدہ ہاں کو گئی؟“

”ہاں میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن سوچا کہ اتنا بھی ضروری نہیں ہے رکنا۔“

”ٹھیک کہتی ہو..... آ جاؤ۔“ وہ نظریں چرا رہا تھا۔

”کیسے ہوں۔“ یہ اچانک سوال تھا، وہ چونکا۔

”ٹھیک ہوں، اور تم کہنے سے پہلے خود کو روکا کہ کیا پچھنا ہے یہ۔“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔“

”اچھا ہے، اندر آ جاؤ۔“

”کھانا کھایا ہے۔“

”ضرورت نہیں ہے۔“

”کھانے کی۔“

”ہاں شاید۔“

”اور کس کس شے کی ضرورت نہیں؟“ سوال یہ بھی اچانک تھا، وہ رک کر نعمان کو حیرت سے

دیکھنا چھوڑ چکی تھی۔

”چھوڑنا چاہتے ہو مجھے۔“

”نہیں..... خود..... کو۔“ وہ سر جھکا اٹھانہ سکا۔

”دشمنی ہوگی اس سے تمہاری؟“ شفیعہ کا لہجہ نرم تھا۔

”نہیں تمہاری۔“ وہ ہنس پڑی۔

”میری تشفی تو اب شاید ہی ہو۔“
 ”کیا سمجھا ہے تم نے مجھے بے غیرت؟“
 ”ایسا کیوں کر رہی ہو؟ میں ایسا سوچ سکتا ہوں کیا یہ سوچا تو یہی ہے تم نے کہ مجھے چھوڑ دو گے اور پھر میں جا کر دوسری شادی کر لوں گی، وہ بھی سارنگ جیسے مجبور انسان کے ساتھ، تف ہے تم پر۔“
 ”اور تمہیں کیا لگتا ہے وہ ایسا کرے گا؟“ نعمان کو توقع نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی کھل کر بات کر کے گئی۔

”تم اس سے محبت کرتی ہونا؟“ لہجہ کمزور تھا۔
 ”نہیں..... تم نے دیکھا ہے کہ کبھی راتوں کو اٹھ کر میں کبھی روئی ہوں۔“
 ”نہیں..... لیکن تم اچانک رات کو اٹھ کر میرے کمرے سے نکل جاتی ہو، تم اکثر اوقات میرے ساتھ رہتے ہوئے میرے ساتھ نہیں ہوتیں، تم اکثر میرے ساتھ ادب جاتی ہو، وہ اس لئے ہے میرے دل میں کچھ نہیں ہوتا۔“
 ”سارنگ میرے ماضی میں آیا تھا، اس نے میری توجہ کھینچی تھی، مجھے اس سے انسیت تھی، لیکن نعمان ڈرے ہوئے کمزور مردوں پر آپ اتنی تو ذمہ داری نہیں ڈالتے ناں۔“
 ”تم اسے کمزور کہہ رہی ہو، وہ اپنے دور کا دلیر کا مدیڈ مشہور ہے۔“

”ہاں وہ بہادری اور طرح کی ہے، یہ اور طرح کی۔“
 ”میں کیا ہوں شفیعتمہاری نظر میں؟“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ہنس دی۔
 ”مذاق اڑا رہی ہو میرے سوال کا۔“
 ”نہیں نعمان، مذاق نہیں اڑا رہی، ہنس رہی ہوں۔“
 ”مجھ پر ہنس رہی ہو؟“

”نہیں بس حالات پر ہنس رہی ہوں۔“
 ”میرے سوال کا جواب نہیں دو گی۔“

”نہیں، بہت بے کا سوال ہے، جب تمہیں خود نہیں چکا کہ تم میرے سامنے کیا ہو، میں کیا ہوں، ہمارا رشتہ کیا ہے، کیا جھوٹ موٹ کا مسکرائنا، کیا صرف بہلانا، کیا سیر سپاٹے کرنا، ہلا گلہ، مذاق مختری، یہی ہے سب؟ یہ کروں تو میں تمہیں سمجھتی ہوں، تمہارے ساتھ خوش ہوں۔“
 ”نہ نہ کروں تو میں خوش نہیں ہوں۔“

”کسی مرد کے ساتھ تھوڑی بات چیت کیا کر لوں، تم خوف زدہ ہو جاتے ہو۔“
 ”تم اس کے لئے نرم ہو جاتی ہو شفیعتم۔“

”تمہارے لئے بھی تو ہوتی ہوں۔“
 ”میں تو تمہارا شوہر ہوں یاں۔“ وہ چپ ہو گئی۔

”تم اسے دیکھ کر ٹھہرتی ہو۔“
 ”تم اس سے بات کر کے خوش ہوتی ہو۔“

”بہت اچھے نعمان..... پھر؟“

”میں نے وہ فائل دیکھی۔“

”ہاں، مجھے اندازہ تھا، حالانکہ پر بھات نے مجھ سے جھوٹ بولا، لیکن مجھے پتا تھا جس طرح سے وہ جھوٹ بول رہی ہے، جھوٹ خود گہتا ہے کہ میں جھوٹ ہوں، مجھے اندازہ تھا کہ وہ فائل تم نے دیکھی ہوگی، وہ اہمیت رکھتا ہے تمہاری نظر میں۔“

”میں نے اسے بتایا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو اور جب بتایا تو وہ رو پڑا۔“ شفیعہ کا دل چاہا ایک زوردار پھپھرا سے جڑ دے لیکن ایسا کرنے نہ سکی۔

”یہ پوچھو کہ محبت کرتے ہو تب بھی روتا ہے، یہ بتاؤ وہ کرتی ہے تب بھی روتا ہے، عجیب انسان ہے وہ۔“

”عجیب ہو تم سالوں سے چھپا رہی ہو۔“

”اور سب سے زیادہ عجیب تو میں ہی ہوں کہ جسے یہ پتا ہے کہ اس کی بیوی اس سے محبت نہیں کرتی تب بھی وہ اسے زبردستی ساتھ رکھے ہوئے ہے۔“

”تم نے مجھ سے ساتھ مانگا ہے نعمان، ساتھ تو دیا ہے میں نے تمہیں، مجھے میری نظروں میں تو مت گراؤ۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”کتنی بار جرح کی ہے تو نے میرے ساتھ، کتنی بار میں نے تمہیں سمجھایا ہے، اب اگر میں تمہیں مطمئن نہیں کر پائی تو ٹھیک ہے، تم الگ کر دو راستہ۔“

”لیکن کم از کم نعمان مجھے کسی اور مرد کا لالچ دے کر مجھے غصہ مت دلاؤ، سارنگ سے شادی کرنی ہوتی تو بھی کر چکی ہوتی میں۔“

”اور جو تم محبت کرتی ہو؟“

”وہ دوسرا مسئلہ ہے۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں ساتھ نعمان کی چھلک پڑیں۔

”مطلب کرتی ہوناں۔“ وہ بڑبڑایا سر جھٹک کر آنسو پوچھ کر۔

”تم میرے آقا تو نہیں ہو، کیوں کرتے ہو یہ سوال مجھ سے میں تمہاری غلام تو نہیں ہوں کہ ہرگز رے کل کا تمہیں جواب دوں۔“

”شفیعہ تم مجھے خلع کا نوٹس بھیجو۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں تمہیں خود نہیں چھوڑ پاؤں گا، تم مجھے چھوڑو۔“

”تم انسان نہیں ہو۔“ وہ شدید دکھ اور غصے میں آ گئی تھی، اتنا کہہ کر کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا اندر سے۔

وہ ہارے ہوئے انسان کی طرح بیٹھا رہا، اسے لگا اس کے سامنے کسی بھی کیس کو جیتنا بڑا مشکل ہے، ہار کر اسے جیت لینا یا پھر جیت کر فتح کر لینا۔

نہ پوری طرح وہ خود پر قابض ہونے دیتی ہے اور نہ ہی خود حکومت کرنا چاہتی ہے۔

اس کے ساتھ کا یہ عالم تھا کہ، نہ وہ چھوڑتی ہے، نہ ہی تھام کر قریب رکھتی ہے۔

اس کے ساتھ بیٹھ رہو، وہ سیٹ سے نہیں ہٹائے گی، ابھی بکھار مسکرا کر دیکھ لے گی، بات کرو تو جواب دے گی لیکن آنکھوں میں جھانک کر کوئی ایسا سوال نہیں کرے گی جس سے وہ آپ کو بھنبھوڑ کر آپ کا جرم بتادے یا پھر آپ کو معاف کر کے دل سے لگا دے۔
ایک پھانس، ایک فاصلہ، ایک رک رکھاؤ، ایک کانٹا، ہمیشہ موجود ہوتا ہے جو یکجائی کا دشمن رہتا ہے۔

عجیب سا تھکا، جسے نہ وہ کھونا چاہتا تھا اور نہ ہی اسے پورا کبھی حاصل کر پایا۔
ایک جنگ تھی جو دم شعلے کی طرح جل بجھ رہی تھی، سلکتی ہوئی، بے نام سی، جسے نام تول گیا، لیکن اس کا انجام کرو تو بس تباہی دھکتی تھی۔

☆☆☆

”کیسی عورت ہے تو سبیل خاتون، ایک تو ماں سے چھپاتی ہے، دوسرا دکھ بانٹنے بھی نہیں جاتی۔“ وہ چادر سر سے اتار کر ماں کو دیکھنے لگی۔
”کیا چھپانی ہوں میں بتاتھہ سے۔“
”سب چھپاتی ہے پر ماں سے کب چھپتا ہے کچھ، چری چھو کری، تجھے چلنا تھا سارنگ کے گھر۔“

”نہ اماں، میری ہمت نہیں پڑتی۔“ وہ سر پر بازو رکھے بولی۔
”سبیل جو دکھ میں کام نہ آئے وہ کبھی دکھ سکھ کا ساتھی نہیں بن سکتا چری، جیبتی کہتی تھیں دکھ میں اپنوں کی پہچان ہوتی ہے، جو دکھ میں کام آئے، وہ دکھ کا ساتھ ہی اور جو دکھ میں چھوڑے سکھ میں بھی اس کی طلب نہیں رہتی کسی کو۔“
”اماں اسے تو میری طلب سرے سے نہیں ہے، لکھ لے تو۔“
”سبیل تجھے تو ہے ناں؟“

”طلب نہیں ہے ماں، چاہ ہے۔“
”چاہ تو ہے ناں، طلب بھی تو اسے کہتے ہونگے۔“
”پڑھی لکھی تو نہیں ہے تیری ماں، پر سمجھ تو مٹھے رب نے دی ہے ناں سب کو۔“
”ٹھیک کہتی ہے اماں، پر جا کر اس کی دلجوئی کرنے کا مقصد ہوگا کہ میں اپنا مطلب ڈالنا چاہتی ہوں۔“

”چاہ رکھنے کا یہ تھوڑا ہی مطلب ہے کہ ڈورے ڈالے جائیں برا لگتا ہے ناں اماں۔“
”تو بھی ٹھیک ہے سبیل، پر غلط میں بھی نہیں، چل بیچ میں چکر لگے گا تو چلنا، سندس اور چاچی مہراب کا تو تو خیال کر لے کچھ۔“

”اچھا، چلوں گی اماں، پر ڈورے نہیں ڈالوں گی، سارنگ کے کمرے میں نہیں جاؤں گی۔“
”لے چری پھر تو وہ لوگ شک میں پڑ جائیں گے بس ایسی بات ہے تو پھر جاؤں گی ہی نہیں۔“

”یہ لے پھر شک یقین میں ڈھل جائے گا، پہلی واری اتفاق سمجھ لئے، دوسری واری نہ چلی تو

کوئی نہ کوئی کھٹک ہوگی، پھر ابھی موقع نہیں ملا ہوگا پر بھات کو بات کرنے کا۔“

”اماں تو نے اسے کیوں کہا۔“

”چری، وہ ماں کہہ رہی تھی مجھے، بیٹی بن کر پوچھنے لگی تو میں نے بھی ماں بن کر بتا دیا اسے۔“

”پر اماں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”پر کچھ نہیں سبیل خاتون، راستہ کھولا جاتا ہے، بندہ آواز تو دیتا ہے ناں چری، اب روٹی پکائیں گے نہیں تو خود چل کر منہ میں آئے گی کیا۔“

”تو بھی حد کرتی ہے اماں۔“

”چل چھڈ، تو بس دعا کر، دعا کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں چری۔“

اسے یاد آیا کہ ماں اس کے بچپن میں کہا کرتی کہ سبیل دعا کر، جب ابانہ رہا تب بھی کہتیں سبیل دعا کر، جیجی ماں کہتی ہیں کہ دعا کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔

”اماں یہ جیجی جیسا کوئی اور کیوں نہیں ہے ان کے خاندان میں۔“

”چری، ہر بندہ ایک ہی باری پیدا ہوتا ہے، پر ان کی سمجھ نسلوں تک جاتی ہے۔“

”اماں سچ بی بی بھی ایسی ہیں؟“

”پتا نہیں دھی، پر سچ بی بی بھی بھلے لوگوں کی اولاد ہے، بھلی ہوگی۔“

”اماں کیا بھلے لوگوں کی رب سنتا ہے؟“

”چری رب تو سب کا ہے، سب کی سنتا ہے۔“

”پھر یہ لوگ بھلے کیوں ہیں؟“

”چری دنیا بھلا کہتی ہے، پر اصل بھلا وہ ہے جو اپنے رب کا ہوا۔“ اس کے بندوں کا نہیں۔

”جیجی لگتا تھا کہ رب کی ہے، وہ رب سائیں کی باتیں کرتی تھی۔“

جیجی ایسی بات کرتی تھی جو دل پر لگتی تھی۔

”جو رب کی باتیں کرے، اس کی ساری باتوں میں حکمت آ جاتی ہے۔“

”اماں تو میرے لئے دعا کرنے؟“ وہ ان کی گود میں لیٹ گئی سر رکھ کر۔

”تیرے لئے دعائیں میں ہی کروں کیا، تو خود بھی کر۔“

”اماں..... بندہ چاہ کیوں رکھتا ہے۔“

”بندہ چاہ رکھنے کے لئے جنا گیا ہے۔“

”پہلے بندے کی، پھر رب کی، ایک دن ایسا آتا ہے کہ جب رب کی رکھتا ہے۔“

”پہلے رب کی کیوں نہیں رکھتا اماں؟“

”بندہ پاک صاف نہیں ہوتا ناں، پہلے پاک صاف ہوتا ہے بندے کی چاہ رکھ کر، پھر اسے پتا

چلا جاتا ہے کہ چاہ کیا ہوتی ہے۔“

”اماں۔“ نیند آرہی ہے، اسے بہت دنوں بعد سکون ملا تھا۔

”سو جا، وہ ذکر پڑھنے لگیں سو نہرے رب کا۔“ اور سبیل خاتون نیند کی حسین وادیوں میں

اترنے لگی۔

”تو بات نہیں کرتی اس کے ساتھ۔“

وہ آتا ہے گھر، پہلے دن بھر نہیں آتا تھا، اب دوبار آتا ہے، وقت ہوا تو بار بار آئے گا۔
”جاہتی ہوں وہ وقت آئے کہ فیروز گھر سے نکلے ہی نہ، گھر بیٹھا رہے، تو اسے چاہ دے۔“
”اچھے دوں۔“ وہ گھٹنوں کے نزدیک بازو لپیٹ کر ان کے سامنے بیٹھی تھی۔

وہ لیٹی ہوئی تخت پر اسے سمجھا رہی تھیں۔

”بات کر اس سے، خیال رکھ اس کا اور کس طرح۔“

”کس زبان میں بات کروں اس سے، میری زبان اسے اچھی نہیں لگتی ہوگی، اس کی زبان

میرے منہ پر نہیں چڑھتی۔“

”رباعی تکبر کسی کام کا نہیں ہوتا دھی، مرد کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، ایک بار جھک جا، پھر
جھکاتی جاتا۔“

”نہ جھکے کا شوق ہے نہ جھکانے کا۔“

”بندہ رب کے سامنے جھکے تو بندہ، بندے کے سامنے جھکے تو کافر کہلاتا ہے۔“

”میں اگر اچھی مسلمان نہ بھی بنی تو بھی کافر بن کر تو کوئی بھی مرنا نہیں چاہے گا ناں۔“

”ٹھیک کہتی ہے تو، چل جھک تو، مڑ تو سہی نگاہ تو کر، اسے اپنا تو سمجھ، چری ماں باپ کی بھی تو

بندہ سن لیتا ہے ناں، تجھے اس لئے کہہ رہی ہوں کہ چاہتی ہوں تجھے پیچھتا نا نہ پڑے۔“

”مجھے پتا ہے یہ رشتہ بے جوڑ ہے، تو سمجھ والی ہے، فیروز چریا نکما ہے، پر تو اسے موقع تو دے،

تھوڑی اچھی ہے تو زیادہ اچھی بن جا، زیادہ ہے تو اور زیادہ بن، بہت ہے تو حد کر دے، پر کر تو

سہی، تو آگے بڑھ، رباعی تو آگے بڑھ، تجھے چار چاند لگ جائے ہیں، تو آگے تو بڑھ، ایک قدم

بڑھا، اس کا سہی اس کی چیزوں کا خیال رکھ، اس کے پیڑے اس کا کھانا پینا پھر یہ تو تیرا فرض ہے

پگلی۔“

”وہ نباہے نہ نباہے، تو نباہ کر، تو آگے بڑھ، تو آگے بڑھ، تجھے اجر ملے گا، اجر سارا تیرے

نام لکھا جائے گا، دیکھنا۔“

”مجھے اجر کی پرواہ نہیں ہے۔“ اس کی آواز نرم تھی لیکن ایک ہٹ دھری نے جگہ لے لی تھی۔

”تو پھر کس کی پرواہ ہے تجھے، ہاں بول، کس کی پرواہ۔“

”پتا نہیں۔“

”جیجی بولی تھی تو اثر ہوتا تھا، میں بولوں تو بہہ جاتا ہے۔“ وہ افسوس سے خود سے ہی کہنے

لگیں۔

وہ کہنا چاہتی تھی کہ اثر ہوا ہے، لیکن کہہ نہیں سکی، اس کی انانے کہنے نہ دیا، گھٹنوں کے گرد بازو

دے بیٹھی رہی۔

”اس سے اچھا تو بغاوت کرنے والے کرتے ہیں۔“

”تو نے شادی بھی کی اور انا سے بھی نہیں، ایسی شادی تو نہ ہی کرتی تو اچھا تھا۔“

”زندہ گاڑ دیا جاتا مجھے۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”وہ زمانے گئی، حویلی میں بڑی بڑی بغاوتیں ہوتیں کسی نے کسی کو زندہ نہیں گاڑا۔“

”منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا، اسی سے ڈرتی تھی کہ کہیں میرے ماں باپ منہ

دکھانے کے قابل نہ رہیں تو مجھے کوسیں گے، آخرت برباد ہو جائے گی میری۔“

”آخرت بچانے کے لئے تو نے زندگی پر جو اٹھایا، چل اچھا کیا پر اب قبول تو کر۔“

”کیا تو ہے، وہ بھی تو سیدھا بنے۔“

”وہ نہیں بنے گا تو کیا تو بھی نہیں بنے گی۔“

”سیانی ہے تو تو۔“

”اس کے قدموں میں گر جاؤں کیا؟ شمع لی بی“

”مجھے ماں کہتے تیرے ہونٹ نہیں پکس گئے۔“

”ماں کہہ دے تو سمجھوں گی ماں بھتی بھی ہے، جب دل کرے گا تو کہہ دوں گی، عزت تو

کرتی ہوں آپ کی میں۔“

”اچھا۔“ وہ ہنس پڑیں، وہ اٹھ کر پانی لے آئی، انہیں سہارا دیا، پانی پلایا، اور پھر گلہاس رکھا۔

”چل اور کچھ نہ کر، بس اتنا کر رہا مگر وہ کھانے تو اسے پانی دینا۔“

”بھوکا ہو تو کھانا دینا۔“

”گھر آئے تو کپڑے استری کر کے رکھنا۔“

”بات نہ ہی کر، پر اتنا تو کرے گی ناں۔“

”میں بھی تو تیری ماں برابر ہوں، ماں نہ سہی، ماں برابر سہی، ہوں تو سہی ناں۔“

”تو نے اتنا بھی نہ کیا تو میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گی رانی۔“

”اتنا کر لوں گی، آپ بے فکر رہیں۔“ اس نے جیسے کسی حد تک ہار مانی ہو۔

”لیکن بس اتنا ہی کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“

”بات کرے گا تو چپ رہوں گی۔“

”چل ٹھیک ہے، اللہ کرے اتنا بھی ہو رہے۔“

”یا رب سائیں میرے فیروز کو ہدایت دے، میرے فیروز کے منہ پہ مہر لگا۔“ کہتے رو

پڑیں، مہر لگانے کا مطلب چپ لگانا تھا۔

”آپ رو کیوں رہی ہیں؟“

”تو سیانی ہے، تجھے پتا ہے ماں اگر بچے کے لئے یہ دعا کرے تو کتنی بے بس ہوگی وہ ماں۔“

رباعی کے ہاتھ کانپے چادر درست کرتے ہوئے اسے یاد تھا ایک بار اسے بھی ماں نے کہا تھا کہ۔

”رباعی شالا تیرے منہ پر تالا ہو، تیزی زبان کو مہر لگے۔“ اور کہنے کے بعد تنہائی میں جا کر رو

پڑی تھیں۔

اس نے تب ماں سے کہا تھا کہ۔

”پہلے بد دعائیں دیتی ہیں پھر روتی کیوں ہیں۔“
 ”گنہگار کی چری ماں بچے کو اول تو بد دعا دیتی نہیں فرض اگر دے بھی دے تو رو دیتی ہے اور
 اندر ہی اندر کہتی ہے کہ کاش یہ دعا نہ سنی جائے۔“
 ”آپ فکر نہ کریں اپنا دھیان رکھیں، دوا لے لیں۔“ اس نے دوائیں نکالیں۔

”یہ گولیاں، نئی ہیں۔“
 ”ہاں، میں نے مہنگائی ہیں۔“
 ”مجھے کیسے بتا لاکہ کون سی منگوائی ہیں۔“
 پر بھات نے ڈاکٹر سے بات کر کے نسخہ بھیجا وہی ملازمہ کو پیسے دے کر کہا کہ آچر سے کھوشہ
 سے لادے۔

”پر بھات، حبیب کی بیٹی۔“
 ”ہاں، حبیب کی بیٹی۔“
 ”وہ اتنی اچھی کیوں ہے؟“
 ”اس کا باپ بھی اچھا ہے، باغی ہے تو کیا ہوا۔“
 ”اس کی ماں کیسی تھی؟“
 ”وہ تب ہی شاید گزر گئیں، جب پر بھات کم سن تھی اسے باپ نے پالا ہے، اس پر باپ کا اثر
 ہے، قہر ہے اس کی۔“
 ”آئندہ اسے نسخہ مت دیکھانا رباعی، اس پر اس کے باپ کی مہر ہے اور اس کے باپ کا میں
 نے کبھی احسان نہیں لیا، تو بیٹی کا کیسے لوں گی، وہ رشتے نہ بنے میں باپ سے بھی چار ہاتھ آگے
 ہے، خود ہی کہتی رہتی ہے۔“
 ”جانے دے، کسی پر بوجھ نہ ڈال، ان دوائیوں نے آپ پر اثر ڈالا ہے، بس یہی منگاتی رہ،
 جب تک اثر رکھتی ہیں، پھر چھوڑ دینا۔“
 ”پندرہ دن بعد دوا بدلتی ہوگی ماں جی۔“ وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

”تم نے مجھے ماں جی کہا۔“
 ”جی بس کہہ دیا۔“
 ”تو پہلے کیوں نہ کہا۔“
 ”پہلے ماں کم سن بی بی زیادہ لگ رہیں تھیں آپ۔“
 ”اب تو ماں لگ رہی ہوں ناں۔“
 ”بالکل لگ رہی ہیں۔“ اس نے چادر ان کے اوپر ڈالی۔
 ”اب آرام کریں۔“

”تو بہت اچھی ہے رباعی، کاش تجھے فیروز پر رحم آئے اور اسے تیری قدر ہو، ماں کی دعا ہے،
 خدا کرے کہ قبول ہو، دعا کر کہ قبول ہو۔“ وہ ان کے پاس تب تک بیٹھی رہی، جب تک انہیں نیند
 نہ آگئی، انہیں نیند آگئی تو یہ بھی وہیں کمرے میں رکھی چار پائی پر لیٹ گئی اور اسے نیند نے آلیا۔

رات گئے فیروز لڑھکتا ہوا گھر آیا تھا اور جھولے میں گرے پڑے انداز میں لیٹ گیا۔
صبح فجر کے وقت شیخ نے اسے آواز دی اور وہ باہر گئی تو فیروز کو جھولے میں دیکھا، اس کا دل
کیا کہ بات کرے، لیکن نشے میں دھت بڑبڑاتے ہوئے اس کے منہ سے جب پینے کی بو، آئی تو
وہ پیچھے ہٹ گئی۔

ناگواری سے۔

شیخ کو ملازمہ وضو کروا رہی تھی، شیخ نے رباعی کا ناگواری سے پیچھے ہٹنا دیکھا۔
اور وضو کر کے نماز کے لئے چوکی پر آگئیں، جو زمین سے ذرا بلندی پر خاص طور پر نماز کے
لئے ہی بنوائی تھی، وہ بیٹھ کر نماز پڑھنے لگیں۔

رباعی نے پلر کے سامنے مضلہ بچھایا، نماز پڑھ کر ختم بھی کی، لیکن شیخ سجدے میں جھکی رہی،
اسے کچھ خدشہ ہوا۔

”اماں ماں جی، آپ ٹھیک ہیں؟“ اس نے انہیں آواز دی اور پھر ہلایا، تو وہ سر اٹھا کر اس کی
طرف خفگی سے دیکھنے لگیں۔

”تو نے مجھے اٹھایا، اللہ سے بات کرنے نہیں دی، اللہ سے کیا بات کر رہیں تھیں آپ؟، جو
مجھ سے نہیں کر سکتی۔“ ان کی آواز میں رعب دھمک اور طراری تھی، آنکھوں میں چمک، وہ کچھ سمجھتے
اور نہ سمجھتے ہوئے خاموش رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”تم کیوں جا رہی ہو شفیعہ؟ ڈاکٹر نعمان کو چھوڑ کر، وہ یہ کہہ نہیں پا رہے تھے کہ مجھے چھوڑ
کر۔“

”نعمان بچہ نہیں ہے ابا، نعمان کو کچھ عرصہ اکیلے رہنے دیں۔“ وہ اپنا ضروری سامان پیک
کر کے لائی تھی۔

ویزہ کے لئے اپلائی کر دیا تھا، قوی امید تھی کہ جلد آ جاتا۔
”اس وقت میرا جانا ضروری ہے، کورس چند ماہ کا ہے لوٹ آؤں گی، فی الحال اس موضوع
سے ہٹ کر بات کریں۔“ وہ شدید دھمی دھمی انداز سے، ڈرتا کہ ان کے سامنے رونہ دے، تھک نہ
جائے، لیکن تھکن تو چہرے سے جھلکتی تھی۔

”تم جا رہی ہو، ضد نہیں چھوڑو گی۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں کا رشتہ کمزور نہ پڑے۔“ وہ ہنس پڑی، رکنے سے زیادہ کمزور پڑ
رہا ہے، رک گئی تو چھ ماہ بھی چل نہیں پائے گا۔

”سمجھیں رشتے کو وقت دینے کے لئے نکل رہی ہوں تاکہ وہ سوچ لے، میں سوچ لوں، اور
پھر کوئی فیصلہ لیں۔“

”بات یہاں تک آگئی ہے اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔“ وہ افرہ تھے۔

”اس سے زیادہ آگے بڑھ گئی ہے، رشتہ کچے دھاگے پر کھڑا ہے، دھاگا کسی بھی وقت ٹوٹ

سکتا ہے، نعمان سے بات کروں؟“
 ”ہرگز نہیں، بات کرنے سے بات بنے گی نہیں بلکہ بگڑ جائے گی اور جب بات کرنے سے
 بات بگڑ جانے کا خدشہ ہو تو بات نہ کرنا ہی سب سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔“

”اباجی آپ کا مجسمہ۔“ پر بھات اچانک پیچھے آئی تھی۔
 ”میرا مجسمہ؟“ انہوں نے گردن پھیر کر دیکھا۔

”جو آپ نے بنایا، وہی مجسمہ۔“

”اچھا تو یہ کہو ناں، کیا ہوا اسے۔“

”آپ اسے مکمل کیوں نہیں کر رہے۔“

”مجھے ڈر ہے کہ مکمل کر کے توڑ نہ دوں۔“

”آپ اسے توڑ چکے ہیں ایک مرتبہ، دوبارہ نہیں توڑ سکیں گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مجسمہ شمع بی بی کا ہے ناں۔“ وہ گھوم کر ان کے سامنے آگئی۔

”نام مت لیا کرو کتنا کہا ہے کہ نام مت لیا کرو، نام لے لیتی ہو۔“ شفیع نے ان طرف

دیکھا، کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے۔

”آپ نے اس کو توڑا تھا، مجسمہ توڑنے سے کیا ہوگا، بنائیں تو سہی، پھر توڑ دیجئے گا۔“

”ان بے تکی باتوں کا کیا مقصد ہے پر بھات؟“ اس کی بجائے شفیع بولی۔

”یہی باتیں تو تک والی ہیں آیا۔“

”جانے دو، تک والی باتوں کو، آپ چائے پیئیں۔“

”آج سوچ رہی ہوں میوزیم میں غزل پر وگرام ہے مل کر چلتے ہیں۔“

”اولاد واقعی اس لئے ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں پہلایا کرے یا پھر لڑا کرے، چلو ٹھیک ہے،

چلیں گے۔“ وہ چائے پینے لگے اتنا کہہ کر۔

پر بھات منہ بنا کر بیٹھ گئی اور رباعی کا نمبر ٹرائی کرنے لگی تو جو مسلسل بند آ رہا تھا اور ابھی

اچانک لگا تھا تو وہ فوراً اٹھ کر اس سے بات کرنے لگی۔

”رباعی کیسی ہو تم؟ کہاں ہو؟ فون کیوں بند تھا؟“ ایک دم سے تین سوال، وہ دوسری طرف

ہنسی۔

”خوش ہوناں۔“ اس نے ہنسی سے اندازہ لگانا چاہا۔

”تیا نہیں خوش رہنا کتنا ضروری ہے۔“

”شاید جینا ضروری ہے۔“

”یہ بتاؤ فیروز کا رویہ کیسا ہے؟“

”ماں جی نے کہا ہے کہ ایک کمرے میں دو مرد نہیں رہتے۔“

”واہ کیا کمال بات کی ہے۔“

”آپ نے سنا شمع بی بی نے رباعی کو کہا کہ ایک کمرے میں دو مرد نہیں رہ سکتے۔“ وہ بچوں کی

طرح بے ساختہ بتا رہی تھی، حبیب چونکے۔
 ”کس کو بتا رہی ہو یہ تم، ہماری باتیں کیا ہمارے درمیان نہیں رہ سکتیں؟“ رباعی دوسری طرف بگڑی تھی۔

”اف تو بے کیا ہے، ہمارے ہی درمیان ہیں فکر نہیں کرو۔“
 ”تم بتاؤ مجھے فیروز کا رویہ کیسا ہے۔“
 ”نہ محبت نہ نفرت، یکسر اجنبیت۔“
 ”چلوئی الحال اسی میں عافیت جانو۔“ رباعی کھوکھلی ہنسی ہنسی۔
 ”لیکن ہمارے بارے میں سخت ہے، کہتا ہے تم سے بات نہ کروں۔“
 ”اچھا۔“ وہ کچھ لمحے سوچ میں پڑ گئی۔
 ”مت کرو۔“

”تم بھی یہی چاہتی ہو؟“
 ”نہیں چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے تمہارا گھر نہ ٹوٹے، تم سے نہ بات کروں تو پھر کس سے کروں۔“

”یہ بھی ہے، چلو تم ایسا کرو کبھی بکھار چھپ چھپا کر دو منٹ خیریت بتا دینا۔“
 ”تمہیں ایک بات بتانی ہے پر بھات۔“
 ”ہاں بتاؤ۔“

”صبح کی بات میں بہت اثر ہے، اس کی ہر ایک بات میں اثر ہے، وہ کہتی ہے ماں جی کہو تو کہنے لگتی ہوں، جو کہتی ہیں وہ ماننا پڑتا ہے۔“
 ”صبح فجر کی نماز پر عجیب حرکت تھی ان کی آنکھوں میں، عجیب چمک، کہنے لگیں اللہ سے بات کر رہی ہوں، عبادت گزار ہوں گی، اثر تو آتا ہے، نماز پڑھتی ہیں۔“
 ”نہیں پر بھات تم نہیں سمجھتیں، کل رات ان کا روپ عجیب تھا اور صبح فجر پر وہ خود اچھا ہو سکتا ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ان کی۔“

”ہاں بہتر ہے دوا اثر کر رہی ہے۔“
 ”چلو اچھا ہے، یہ تو اچھی خبر ہے۔“
 ”کیوں تم ڈرتی ہو اس سے؟“

”نہیں لحاظ کرتی ہوں، جس دن نہ کیا تو اپنے گھر پہنچا دی جاؤں گی۔“ کہہ کر فون بند کر دیا اس نے تو پر بھات مہر کی طرف آئی۔

”فون بند ہو گیا؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”نہیں اس نے خود کیا، فیروز آ رہا تھا۔“

”ڈرتی ہے اس سے۔“ اس بار شفقت بولی۔

”نہیں کہہ رہی تھی کہ لحاظ کرتی ہے، جس دن نہ کیا، گھر پہنچا دی جائے گی، جہاں سے آئی تھی۔“

”مشکل ہے ایک مس بیچ شادی کا چلنا۔“

”ہے تو لیکن وہ یہ مشکل پھیل رہی ہے۔“

”اور کیا کہہ رہی تھی؟“ وہ منجس تھے۔

”کہہ رہی تھی منع کچھ عجیب سی محسوس ہوتی ہیں، خود سے باتیں کرتی ہیں اور آنکھوں سے

روشنی پھوٹتی ہے۔“

”اچھا؟“ وہ خالی کپ کو دیکھ رہے تھے۔

”جی..... بالکل..... مجھے بھی ان کی شخصیت میں ایک حیرت تو محسوس ہوا ہی تھا۔“

”جیسے وہ کوئی حکم دے تو ٹالنا نہ جاسکے؟“ حبیب کے سامنے ججی کا عکس آ گیا۔

”بالکل اور اگر بندہ انکار کرے تو پچھتائے۔“

”جیسے اس کی سنی جاتی ہو، یا پھر جیسے وہ کچھ جان گئیں ہو، خیر اتنے دکھ دیکھ کر تو کوئی کچھ بھی

جان سکتا ہے۔“

”لیکن جب وہ روتی ہیں تو لگتا ہے سارا گھر رو رہا ہے، دیواریں آنسو بہا رہی ہیں۔“

”جب بد دعا دے رہیں تھیں تو لگتا تھا کہ عرش ہل جائے گا کہنے لگیں کہ تیرے باپ کو

قبرستان نصیب نہ ہوگا حویلی کا، لگتا تھا ایسا ہوگا۔“ وہ بے ساختہ کہہ گئی، حبیب کی جیسے دنیا اندھیر نظر

آنے لگی۔

”کہہ رہی تھی معاف نہیں کروں گی، قیامت تک معاف نہیں کروں گی، حساب ہوگا لگتا

ہے۔“ حبیب کے جسم میں سرسراہٹ دوڑ گئی۔

”بس کر دو پر بھات۔“ شفیعیت نے باپ کے تاثرات چاہتے ہوئے اسے جھڑکا۔

”ایک طرف وہ عورت ہے جو معاف کر دیتی ہے، ہجر کا سارا سفر معاف کر دیتی ہے، کہتی ہے

حبیب تم مجھے معاف کرنا، میں نے تمہیں معاف کر دیا اور دوسری طرف وہ ہے جو کہتی ہے کہ دل

نہیں کہتا کہ معاف کروں، حویلی نصیب نہ ہوگی، قبرستان نے ہوگا۔“

”بس کر دو پر بھات۔“ وہ پھر دھاڑی اس پر۔

”معاف نہیں کیا اس نے آزاد نہیں کیا۔“ حبیب نے سر میز کی سطح پر رکھ دیا، آنکھیں برسنے

لگیں تھیں، شفیعیت نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پر بھات خود جیسے حواس باختگی سے

بڑبڑائے جا رہی تھی۔

”تو اس نے آزاد نہیں کیا۔“ اور حبیب نے سر اٹھا کر آنسوؤں بھر کر چہرے سے دھندلا منظر

دیکھا

”اے خاندانی فیض کے لئے شاید چن لیا گیا ہے۔“ وہ کہہ رہے تھے کہ چن لیا ہے، اس بار

بھی عورت ہے اس عورت کو چنا جو معاف نہیں کر پائیں، اس بار سوال شفیعیت کی طرف سے تھا۔

”ججی کی جگہ شمع کے علاوہ اور کوئی نہیں لے سکتا۔“ وہ چہرہ نشو سے صاف کرنے کے بعد

بولے۔

”خاندانی فیض خاندان میں بٹتا ہے۔“

”فیض کیا بندوں کے ہاتھ ہوتا ہے؟“ پر بھات جھلائی۔
 ”نہیں لیکن یہ فطرت کا اصول ہے، امانت خون کو ہی جاتی ہے تقریباً۔“
 پر بھات کا ذہن کچھ گھٹیاں سلجھانے کی خواہش کرنے لگا اور اس نے ذہن کا رسہ کھول دیا،
 کچھ سمجھنا باقی تھا۔

☆☆☆

”عشق بندے کا انتظار کرتا ہے اور پھر وقت پڑے تو اسے آواز دیتا ہے، صرف میں نے ہی
 نہیں عشق نے بھی میرا انتظار کیا ہے، عشق نے بھی مجھے ڈھونڈا ہے، پکارا ہے۔“ عقیفہ نے شکست
 زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ایسا مت کرو زبیر عالم، مت جاؤ، تم ہر بار چلے جاتے ہو، تم تب بھی نہیں تھے جب احرار
 نے کالج میں فرسٹ پوزیشن لی تھی، تم کبھی بھی اس کے ساتھ نہیں رہے، اس وقت مت جاؤ، میں
 اس کی زندگی کے لئے بہت اہم فیصلہ لینے جا رہی ہوں، میرے ساتھ چلو۔“

”دیکھو میری بات سنو، تم خوش ہو، وہ خوش ہے یا کافی ہے۔“

”تم لوگ جاؤ، مجھے نکلنے دو، مجھے جانے دو، میں جا کر کیا کروں گا۔“

”لوگ اگر کہیں کہ احرار کا باپ کہاں ہے تو کیا کہوں کہ مر گیا؟“ وہ پھٹ ہی تو پڑی تھی۔

”ہاں کہہ دینا کہ مر گیا۔“ وہ سامان پیک کر رہا تھا لا پرواہی سے بولا۔

”امی یہ سب کیا ہے؟“ احرار اسی وقت آیا تھا کمرے میں۔

”تمہارا باپ پھر کسی ویرانے کی خاک چھاننے جا رہا ہے۔“

”ویرانہ نہیں، عشق۔“ اس کی شاعری ایک آواز ہے۔

”میں اس کی تلاش میں نکل رہا ہوں، پتا نہیں کس کا بیڑا ڈوبنے نکلا ہے۔“

”میں اس سے مل کر بات کرنا چاہتا ہوں، میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس کے شعر کے ہر لفظ نے

مجھے پیغام دیا ہے، وہ تنہائی کی شاعری ہر بات کرتی ہے، جیسے اس پر اذن اترتا ہو اور وہ خود ایسے
 لکھتی ہے جیسے اذن اتر رہی ہو۔“

”یہ پھر کسی معصوم لڑکی کو اجازت کرم لے گا، کیوں لکھتی ہیں یہ پاگل لڑکیاں، کیوں کرتی ہیں

شعر و شاعری۔“

”کرتی بھی ہیں تو نام نہ لکھا کریں اور لکھ بھی دیا تو پتا نہ دیا کریں۔“

”اف حد ہوگئی، آپ چلیں ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

”انہیں اللہ سمجھ دے۔“ وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

”اللہ اس لڑکی کی حفاظت کرے اور اسے تم سے بچائے۔“ وہ کہہ کر نکلیں۔

”پاگل عورت ہو تم بھلا دو فنکار وہ لکھاری بھی بچے سکتے ہیں کیا، وہ شاعرہ، میں مصور، میں

اس سے ملنا چاہتا ہوں ہر بندہ دنیا میں اپنے جیسے بندے کی تلاش میں رہتا ہے اس میں بھلا الگ

کیا ہے۔“ وہ بیگ بند کر کے سگریٹ سلگانے لگا تھا۔

”چلو احرار۔“ وہ نیچے آگئیں۔

”تم خوش تو ہونا؟“

”اب بس شادی ہی تو کرنی ہے، اچھا ہے آپ کی پسند سے کر لوں، لڑکی آپ کو اچھی لگتی ہے تو ٹھیک ہے۔“

”لیکن مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے، بلکہ ٹھہریں، میں پر بھات کو فون کرتا ہوں، اسے بھی لئے چلتے ہیں، ذرا نشئی رہے گی۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے، اسے بلاؤ، یہ کہنا کہ گاؤں جانا ہے سارنگ کے چالیسویں پر نہیں جاسکتے تھے تو اب ہو کر آئیں، پھر راستے میں بتائیں گے۔“

”وہ بالکل چلے گی، اس نے خود مجھے کہا تھا کہ چلنا ہے، وہ بھی نہیں گئی تھی، کل اصل میں شفیعیت آپا باہر کے لئے روانہ ہوئی ہیں تو کل کا سارا دن وہ مصروف تھی، رات کو ٹیکسٹ کر کے بتایا تھا۔“

”ہاں اچھا کیا، چلو وہ ساتھ ہو گئی تو اچھا رہے گا۔“

اس گھر والے پر بھات پر بہت بھروسہ کرتے ہیں، وہ اسے فون کر کے گاڑی میں آ بیٹھا۔
”ہم بس اس کو گھر سے لے لیتے ہیں، جب تک وہ تیار ہو جائے گی، ویسے بھی رات گئے تک لوٹ آتا ہے۔“

”ویسے میں سوچ رہا ہوں بتائیں وہ لوگ کیا سوچیں گے۔“

”کچھ نہیں سوچتے وہ، خوش ہونگے۔“

”آپ کو کیسے پتا۔“

”بس ہے پتا، تم بے فکر رہو، مجھے سندھی جیسی پرہ اور انہیں تم جیسا داماد ملے تو اور بھلا کیا چاہیے۔“ وہ انہیں بہت عرصے بعد اتنا خوش دیکھ کر مطمئن تھا۔

”اب یہ تو تب ہو گا جب وہ لوگ بھی کچھ سوچیں، مثبت جواب دیں۔“ اس نے راستے کا موڑ کاٹا اور سوچا کہ پر بھات ضرور اس فیصلے سے خوش ہوگی۔

☆☆☆

نصیب وہ ہوتا ہے جو اچانک کھلتا ہے۔

کوئی دروازے پر دستک دے تو کھولو، خیر خواہ ہو تو بٹھاؤ، بات کرو، نہ بھی ہو تو مہمان سمجھ کر کھانے بیٹھنے کا پوچھو، خیال رکھو، جب تک ٹکا رہے مقدر سمجھو، جب چلا جائے خوشی سے رخصت کرو، جیجی کہتی تھیں نصیب در پر آئے تو اسے ٹھوکر نہیں مارتے، سکھائی کی بات میں مہربانوں نے اسے اضافہ کیا تھا۔

”سندس سے پوچھیں، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سارنگ کے چہرے پر خوشی بھی تھی اور شرمندگی بھی۔“

”کوئی کسی پر رحم کھاتے ہوئے اتنا بڑا فیصلہ نہیں کیا کرتا، سارنگ پلینر مثبت سوچو۔“ پر بھات اسی وقت اندر آئی تھی۔

”میں معافی چاہتی ہوں یہ آپ سب کا پرسنل معاملہ ہے لیکن میرے خیال سے میں دوست

ہونے کے ناطے بول سکتی ہوں۔“
 ”تم اس گھر کا حصہ ہو پر بھات، بہنوں کی طرح ہو میرے لئے۔“ سارنگ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا، کہتے ہوئے۔

”احرار اچھا لڑکا ہے، میں اسے بہت وقت سے جانتی ہوں۔“
 ”مجھے پتا ہے، تم لوگ سندس سے معلوم کر لو۔“
 ”میں نے بات کی ہے سندس سے۔“

”پھر کیا کہا اس نے؟ مجھے تو کچھ نہیں کہہ رہی تھی چری۔“ روپڑی۔
 ”وہ حیران ہے بلکہ تھی اس وقت، لیکن اب خوش ہے کہے گی تو نہیں ناں، تھوڑا وقت تو لگتا ہے ناں۔“

”بس پھر ہاں کہہ دیتی ہوں بہن عقیفہ کو۔“ وہ مٹھائی لائی ہیں تو خوشی پوری کریں۔
 ”شکر ہے اللہ پاک کا، میرا سفر آسان ہو رہا ہے۔“ سکھاں نے بے ساختہ شکر ادا کیا تھا۔
 مٹھائی کی رسم کر کے بات چلی کی گئی تھی۔

دودن پہلے اس گھر سے چالیسویں کا سوگ اتر ا تھا، اور دودن بعد انہیں اتنی اچانک یہ خوشی ملے گی کسی کو اندازہ نہ تھا، ایک سکھاں دودن سے کہہ رہی تھی کہ رب سوہنراں دکھ کے بعد خوشی بھی چکھاتا ہے، کرب کے بعد اطمینان چکھاتا ہے، وہ چکھائے گی، اس گھر سے دھند بھی اترے گی۔
 ”یار رب میرے بچوں کے لئے اب خیر کی خبریں بھیج دے۔“ سارنگ ان کی بات پر خاموش ہو جاتا تھا۔

سندس، مایوس اور مہراب خاتون نے وقت کی رسی کو بہت لمبا ہوتے محسوس کیا تھا، لیکن اس اچانک خبر نے ان کے کندھوں سے ایک بوجھ جیسے اتار پھینکا تھا۔
 عقیفہ نے دو ماہ بعد کی شادی کی تاریخ بھی رکھ لی تھی، اور انہیں جہیز وغیرہ بنانے سے روکا تھا۔

مہراب خاتون نے اسے وہ بیٹی دکھائی جس میں جوڑ جوڑ کر اس نے سندس کے لئے جہیز کی چیزیں، جوڑے، رلیاں، چادریں، غلاف اور چھوٹی بڑی چند چیزیں جمع کی ہوئیں تھیں، انہیں لگتا تھا یہ چیزیں نہیں امیدیں ہیں جنہیں قطرہ قطرہ جمع جوڑ کر کے وہ سندس کا نصیب جوڑ رہی ہیں، کہتی یہ نہیں کہ۔

”رب بیٹھا میں چیزیں جوڑ رہی ہوں، میرا کام یہی ہے، تو نصیب جوڑنا، جو تیرا کام ہے، میں نے اپنا کام کر لیا ہے، اب تیرے حکم کی دیر ہے۔“

☆☆☆

رباعی کو ماں نے بلایا تھا، پریشان نظر آ رہیں تھیں، اس کے آتے ہی خطوط کا پلندہ اسے تھما دیا تھا، وہ حیران رہ گئی۔

”یہ کس نے بھیجے ہیں؟“
 ”مجھے کیا پتا، سوچا تھا تجھے بھیج دوں پھر سوچا بلا کر دے دوں، کسی نامحرم کے ہوئے کو فیروز

آگ لگا دے گا سب کو، پرنا محرم کے کیوں ہونگے، میری بیٹی ایسی تو نہیں ہے۔“ وہ خود ہی اپنی بات کا جواب نکالنے لگیں، رباعی نے حیران پریشان ہوتے ہوئے خطوط کھولے، تو ششدر رہ گئی، سراپنے کے لئے کیا لفظ چنے گئے تھے پر خط کے آخر میں لکھا تھا۔

”تمہارا نام محرم جو تم سے بہت جلد آئے گا۔“ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
 ”کس کے خط ہیں رباعی؟“ ماں اس کی آنکھوں کی پریشانی سے دلہتی جا رہی تھی۔
 ”کسی کے نہیں۔“

”کسی کے تو ہوں گے، کیا تو خود اپنے آپ کو اتنے خط لکھے گی۔“ ان کا لہجہ تیز ہوا۔
 ”پر بھات کے ہیں اماں۔“ اس نے الجھ جھٹ سے یہی سوچا تھا۔
 ”جھوٹ مت بول ماں سے چھو کر۔“

”اماں، مجھے اور بھلا کون خط لکھے گا، تو بھی چری ہے کیا، پر بھات سے بات نہیں ہوئی تھی، تو پریشان ہو گئی ہے خط لکھ ڈالے ہیں اس نے۔“
 ”تو سچ کہہ رہی ہے ناں؟“

”جھوٹ بولوں گی؟“ اس نے پہلی بار صفائی سے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تھی۔
 ”بول تو نہیں سکتی، عادت بھی نہیں تجھے پر بندے کا کیا بھروسہ بھلا۔“ وہ کہہ کر اس کے لئے چائے کا کہنے چلی گئیں، وہ چپ رہ گئی۔

”بندے کا کیا بھروسہ۔“ چائے لے کر آئیں تو رباعی سارے خط پڑھ کر رکھ چکی تھی۔
 ”تو پریشان کیوں ہے، فون کرناں پر بھات کو۔“
 ”خفا ہے وہ مجھ سے۔“

”خفا کیوں ہے وہ تجھ سے؟ وہ تو تیری سہیلی ہے۔“
 ”سہیلی ہے بھی تو خفا ہے۔“

”میں نے بات جو نہیں کی، پھر اس روز فیروز نے بڑا شور کیا تھا۔“
 ”شور کرتا ہے وہ؟“

”بہت کیا اس روز تو۔“

”اچھا.....“ ماں پریشان ہو گئی۔

”نفسہ بھی کرتا ہے، شور بھی کرتا ہے، تجھے مارتا تو نہیں ناں۔“

”اگلا قدم یہی ہوگا اس کا بس یہی تو رہ گیا ہے۔“

”اللہ نہ کرے اچھی بات منہ سے نکال رہا ہے۔“

”قسمت ہی جب اچھی نہ ہو تو بات منہ سے کیسے اچھی نکلے گی۔“

”اچھی قسمت ہے تیری رباعی، بہت اچھی ہے، بہت زیادہ۔“

”وہ بھی اچھا ہے، تو بھی اچھی ہے۔“ وہ اس کے بالوں کی لٹوں کو چھوتے ہوئے پیار سے

کہنے لگیں۔

”کچھ بھی اچھا نہیں ہے اماں، سوائے تیرے، سوائے ابے کی خاموشی کے۔“ وہ ان کی گود

میں سر رکھ کر لیٹ گئی، ماں بال سہلانے لگیں۔

”سب اچھا ہو جائے گا رباعی، سب اچھا ہو جائے گا رباعی، تو انتظار کر، تجھے اچھا بننا پڑے گا، سب سے پہلے تجھے اچھا بننا پڑے گا، پھر سب اچھا ہو جائے گا، دیکھنا۔“ وہ اسے بہلانے لگیں، رباعی نے چمکتی ہوئی آنکھیں جھپکائیں تو آنسو بے اختیار ہو گئے۔

”سب کو دکھ دیکھنے پڑتے ہیں، جو بپا ہوتا ہے، دکھ دیکھتا ہے۔“

”یہ زندگی ہے رباعی، ایسا ہوتا ہے، پھر سکھ بھی آ جاتے ہیں، ایک دن سکھوں کا ہوتا ہے۔“

”وہ بھی اچھا ہو جائے گا، تیرا خیال رکھے گا۔“

”ایسا سوچا نہیں ہے اس لئے بھلا مت ماں۔“

”ایسا سوچ چری، بیوی ہے تو اس کی، شوہر ہے وہ تیرا، بھلے شور کرتا ہو، بھلے چری ہو۔“

”ہاں وہ شور کرنے والا، چری موالی، شوہر ہے میرا، وہ نشہ کرنے والا شوہر ہے میرا۔“

”رباعی یہ ادھر کہہ رہی ہے ماں کے سامنے، وہاں مت کہنا دکھ نہ دینا، دکھ نہیں دیتے دھی، پہلے پہل ہی دکھ نہیں دیتے، وہ تو نے سنا نہیں تو تو سیانی ہے ناں، وہ جو کہتے ہیں کہ کانے کو منہ پر کانا نہیں کہتے، تو چری کو چری مت بول، موالی کو موالی مت بول۔“

”چری کو چری نہ بولوں، موالی کو موالی نہ بول، سب قانون تیری ریاست کے اندھے ہیں ماں جی، سارے قانون تیری ریاست کے کالے۔“ وہ دکھ سے ہنس پڑی، ماں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

”میری ریاست نہیں ہے یہ رباعی۔“

”جانے دے اماں جس نے بھی یہ ریاست بنائی، تو نے بھی اسے پروان چڑھایا، پہلے بیٹی پیدا کی، پھر اسے سمجھوتوں کے گز سکھائے، پھر موالی سے خاندان میں بہاواں وہی سب کیا، اندھی ریاست کی۔“

”حصہ دار ہے تو اور اب میں بھی، تیری بیٹی بھی اندھی ریاست کی بانی ہے، وہ بھی یہ سب کرے گی، اسے بھی یہی سب کرتا ہے۔“ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”مت کہہ ایسے رباعی، مت کہہ، اچھا بول، اچھا سوچ، ایسا کرنے سے کیا سب اچھا ہو جائے گا اماں؟“

”ہاں ہو جائے گا، ہو بھی سکتا ہے، تو اچھی تو بن، تو اچھی بنی تھی، پھر کیا ہوا۔“

”پر تو بنے گی تو ہوگا، ماں کا یقین کر، میں یتیم تھی۔“

”میرے سر پر کسی کی دعا نہ تھی، پر تیرے سر پر ہے، ماں کی دعا ہے تیرے سر پر۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو آنسوؤں سے بھیگے چہرے میں انہیں دیکھتے، ہاتھ اٹھا کر چوم لیا اور دوبارہ لیٹ گئی ان کی گود میں۔

”کچھ نہیں ہوگا تجھے رباعی، یہ خط جلا دیں، نہ لے کر جائیں، جلا دینا، کسی کو پتا نہیں چلے گا، کوئی نہیں پہچان پائے گا، رب تیری لاج رکھے، بس تو خطوں کے جواب نہ دینا، خطوط کے جواب نہیں دیتے دھی۔“

”تو ماں کو یہ یقین ہے کہ یہ خط پر بھات نے نہیں بھیجے ہو گئے۔“

”اماں دعا کر دعا کر اماں، خطوط والا ادھر آنہ پہنچے۔“ وہ پھر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
 ”تیری بیٹی نے کچھ نہیں کیا اماں، کوئی گناہ نہیں کیا، کچھ نہیں کیا، کچھ بھی تو نہیں، کبھی کبھی کو خط
 نہیں لکھا۔“
 ”مجھے پتا ہے چری، پتا ہے، تو نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا، مجھے پتا ہے رباعی، اور تجھے کچھ نہیں
 ہوگا کہ تو نے کچھ نہیں کیا۔“

☆☆☆

”تم خوش ہونا سارنگ۔“
 ”بہت خوش ہوں، ابا کی ایک ذمہ داری ادا ہونے والی ہے، ہم خوش ہیں، پر بھات سمجھ نہیں
 آتا کہ ایسے بھی آسانیاں ہوتی ہیں زندگی میں، جب بیمار تھا تب چیزل، احرار اور رم نے اتنا ساتھ
 دیا۔“
 ”چوت لگی تو سنبھالنے والے آگئے، ڈاکٹر نعمان پلٹ پلٹ کر حال پوچھتا تھا، جس سے کوئی
 رشتہ نہ تھا، اس کے لئے دعا کرنا۔“
 ”اسے کیا ہوا؟“

”کچھ ہوا تو نہیں ہے، لیکن یہ ہے کہ آپ کچھ ماہ کے لئے باہر چلی گئیں، وہ بہت اپ سیٹ
 ہیں، دونوں کے درمیان اچھے حالات نہیں ہیں، دعا کرو ان کا گھر نہ ٹوٹے۔“ وہ افسردگی سے اس
 کی طرف دیکھنے لگا۔

”مجھے پتا ہے، تم مجھ سے پوچھنا چاہتی ہو۔“
 ”لیکن میں تمہیں بتانا ہوں کہ میں ایسا نہیں چاہتا۔“
 ”میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کا گھر ٹوٹے۔“
 ”اتنا فرشتہ صفت انسان ہے، پھر تمہاری بہن سے کتنی محبت کرتا ہے ناں، اتنی محبت کہ کوئی کر
 ہی نہ سکے، اتنا انتظار کر کسی سے کیا ہی نہ جائے، اتنا غل کہ کوئی سہارہ نہ سکے، اتنی برداشت کہ کوئی
 سنبھل نہ سکے۔“

”اتنی امید کہ بندہ ٹوٹے ٹوٹے بکھرتے بکھرتے، پھر سے جڑنے اور بچنے لگے۔“
 ”سارنگ بس یہ سب آپا کو سنا دو، انہیں بتاؤ کہ نعمان ایسا ہے، انہیں تو کوئی ہوش ہی نہیں
 ہے، انہیں ایک میل کرو، ہو سکتا ہے تمہارے کہنے پر انہیں بھروسہ ہو۔“
 ”بس اتنا ہے کہ ڈاکٹر نعمان کو محبت کا سلیقہ نہیں آتا۔“
 ”یہ مت کہنا ان سے کیوں کہ اس کا انہیں پتا ہے۔“
 ”گلتا ہے پر بھات کہ وہ خوش نہیں کر سکا انہیں۔“
 ”مجھے معلوم ہے سارنگ، لیکن وہ حقدار تو ہے ناں۔“
 ”ہاں ہے، حق دار تو ہے۔“

”لیکن محبت اختیار کا نام ہے جو خود ہی دے دیا جائے، جو سونپا جائے۔“
 ”بس تو پھر انتظار کرنا ہوگا مزید، لیکن تم انہیں کہو گے، اگر آسانی ہو۔“ وہ سر ہلانے لگا۔

”میں تمہیں مجبور کر رہی ہوں ناں سارنگ؟“ اسے فوراً احساس سا ہوا تھا۔

”پر بھات، وہ کمزور تھا حد درجہ۔“

”سارنگ ایک بات بتاؤ۔“

”یہ مت کہنا کہ اس سے محبت کرتا ہوں؟“

”یہ پوچھو گی تو جواب وہی ہوگا جس کی تمہیں امید ہے۔“

”یہ پوچھتی ہوں کہ کیا اسے حاصل کرنا چاہتے ہو؟“

”اسے کبھی اپنا آپ دینا چاہتا تھا، حاصل کرنے کا تو کبھی سوچا ہی نہیں ہے۔“

”ہارنے کا سوچا تھا، سو ہار گیا، چاہا تھا اس کے آگے ہاروں لیکن ہوا یہ کہ اس کو ہار گیا، اس کے سامنے ہار گیا، بہر حال ہار گیا۔“

”اور اب جیتنا چاہتے ہو؟“

”نہیں کچھ نہیں، بس اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہتا ہوں۔“

”تم ضرور ہو گے، اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہو؟“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”ایسا ہو سکتا ہے، شاید کیوں کہ ڈاکٹر نعمان اور آپا کی کھل کر بات ہو گئی ہے، نعمان نے انہیں بتایا ہے کہ تمہاری ان سے بات ہوئی ہے۔“

”اس نے تو فقط اتنا پوچھا کہ محبت کرتے تھے؟“



شگفتہ شگفتہ — رواں دواں

ابن انشاء

اچھی کتابیں

پڑھنے کی عادت ڈالیں

دنیا گول ہے

خمار گندم

اردو کی آخری کتاب

چلتے ہو تو چین کو چلیے

ابن بطوطہ کے تعاقب میں

آوارہ گرد کی ڈائری

بقلم خود

داخل در معقولات

گمری گمری پھر اسافر

لکھنؤ ایکسپریس چوک اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 37310797

”میں نے کہا اب تک کرتا ہوں۔“
 ”جب نعمان نے اسے بتایا تو اس کا کیاری ایکشن تھا پر بھات۔“
 ”تمہارا کیا تھا؟“

”میں رو پڑا تھا پر بھات۔“
 ”بس پھر یقین ہے کہ وہ بھی رو پڑی ہوگی، آنکھیں تو بھرا گئیں ہوگی ان کی بھی۔“
 ”تمہیں یقین ہے؟“
 ”ہاں ہے۔“

”وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں؟“ وہ بڑبڑایا۔
 ”کتنا بھر پور خوشی سے ہمکنار کر دینے والا احساس ہے ناں۔“
 ”سارنگ میں چاہتی ہوں تم ایک بار بات کرو، ان سے میں نہیں کہہ پاؤں گا۔“
 ”ایسا کرنا پہلے سلام کرنا، پھر حال احوال، چھوٹی موٹی بات چیت کے بعد ہمت آ جائے گی۔“

”تمہیں پتا ہے؟“

”ہاں ہے۔“

”وہ بات کا جواب دے گی؟“

”ہاں دے گی۔“

”اچھا، بیچ کروں گا۔“

”کرنا۔“

”نمبر دینا۔“ مدھم مسکراہٹ میں دیا جلنے لگا تھا اس کا۔

”کروں گی، نمبر دیتی ہوں۔“

”تم علاج کرواؤ گے ناں؟“

”ہاں کرواؤں گا، کیا ٹھیک ہو جاؤں گا؟“

”ہاں، اگر علاج کرواؤ گے تو ہو سکتے ہو۔“

”تمہیں یقین ہے؟“

”ہاں مجھے یقین ہے۔“

”شدید خواہش پوری ہوتی ہے ایک دن؟“

”ہاں ہوتی ہے۔“

”محبت رائیگاں نہیں جاتی کیا؟“

”نہیں کبھی نہیں، اس دنیا میں صرف محبت ہی ہے جو رائیگاں نہیں جاتی، جس کا وقت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، بس ایک محبت ہی تو ہے جو کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتی۔“ پر بھات دل میں سوچ کر رہ گئی۔

(جاری ہے)

سحر موجی
حناء بشری



چند لمحوں کے لئے انہیں یقین ہی نہ آیا کہ یہ ان کی وہی سکھڑ و سلیقہ مند بیٹی ہے جو صفائی ستھرائی کی دلدادہ تھی، پھیلاوا تو اس کی فطرت کے خلاف تھا، ذرا سی بے ترتیبی دیکھ کر وہ کمر پہ دوپٹہ باندھ کر جھاڑو پونچھا ہاتھ میں پکڑ کر پورے گھر کو چکا کر رکھ دیتی تھی کہ روبینہ کے دل سے اس کے لئے ڈھیروں دعائیں نکلا کرتی تھیں، اور اب اپنی سکھڑ بیٹی کو ”پکڑ پھو ہڑ پن“ دیکھ بنی دیکھ کر آنکھیں حیرت سے پھٹنا لازمی امر تھا۔

”جلال کی کال ریسیو کیوں نہیں کر رہی۔“ کمرے کی بے ترتیبی سے کوفت کھائی روبینہ ہر عورت کی طرح مجبور خود ہی ترتیب دینے میں لگ گئیں، مگر ساتھ ہی ساتھ کڑے تیوروں سے سوال پوچھنا نہ بھولیں۔

”جلال کی کال آئی تھی؟“ بھول پن کی اداکاری عروج پہ تھی، ایک شخص جو کانوں میں ہینڈ فری ٹھونسنے نا جانے کتنے گھنٹوں سے میوزک سن رہا ہو وہ کسی کال کے آنے سے بے خبر رہا ہو، جلال ٹوبہ کا شوہر تھا، وہ نا جانے کتنی کالز اس کے اسمارٹ فون پہ کڑ چکا تھا مگر ہر بار نا کامی کا سامنا ہوا تو تنگ آ کر سس کے نمبر پر کال کر دی، نہ صرف کھری کھری سنائیں بلکہ لگے ہاتھوں دو چار دھمکیاں بھی دے ڈالیں، وہ سخت تپا ہوا تھا۔ ”زیادہ ڈرا سے کرنے کی ضرورت نہیں، تمہیں پتہ ہے کالز آئی ہیں۔“ روبینہ کے لئے یہ ایک نیا انکشاف تھا کہ بیٹی نے شادی کے بعد ڈرا سے کرنا بھی سیکھ لئے ہیں۔

”آں..... اچھا۔“ ابھی بھی ٹوبہ کی اداکاری اسٹاپ نہیں ہو رہی تھی، چہرے پر حیرت سجائے وہ یوں فون چیک کرنے لگی جیسے پرانے وقتوں کا پرانا سا ماڈل ہو جس میں کال ریکارڈ رکھنے کی صلاحیت ہی نہ ہو، لمحہ بھر کے لئے روبینہ نے مکمل

”یہ سب کیا ہے ٹوبہ؟“ ایک غصیلی اور ناقدانہ نگاہ کمرے کے حال چلے پہ ڈالتے ہوئے روبینہ نے لاپرواہی سے لیٹی ہوئی بیٹی سے پوچھا، جو لاپرواہی، بے پرواہی اور من مریضوں کی آخری حدوں کو چھوتی صوفے میں دھنسی گرد و پیش سے لاپرواہ اپنی ذات میں مست کانوں میں ہینڈ فری لگائے یقیناً فیورٹ سا گنگ سن رہی تھی، لیٹے لیٹے پیٹ پہ رکھا فل سائز کا چپس کا پیکٹ کھاتے ہوئے ایک تیز میں دو شکار کر رہی تھی۔

مطلب موسیقی کی دھنیں کانوں کو مزہ دے رہی تھیں اور چپس زبان کو مزہ، چہرہ تیار ہاتھ کہ وہ اس وقت ”فل انجوائے“ کے موڈ میں تھی۔

”ٹوبہ!“ اب روبینہ قدرے بلند آواز میں مخاطب ہو میں مگر جن سماعتوں میں موسیقی سیسہ بن کر اتر رہی ہو، وہاں دوسری کوئی آواز کہاں اترتی۔

”ٹوبہ، بہری ہو گئی ہو؟“ اب کی بار روبینہ مکمل جلال میں آ گئی تھیں سو نہ صرف بلند آواز میں چلائیں بلکہ صوفے پہ لیٹے اس بدست ہاتھی کے کانوں سے ہینڈ فری غصے سے کھینچ ڈالا۔

”کیا ہے امی؟“ ہاتھی کا مزہ سخت کر کر اہو گیا تھا، ہاتھ چپس کے پیکٹ میں رہ گیا اور چہرے پر ناگواری کے سخت تاثرات چھا گئے، شاید وہ اس اچانک افتاد کے لئے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھی کچھ بھی چڑچڑاہٹ سوانیزے پر نظر آئی۔

”سارا موڈ خراب کر دیا امی۔“ چپس منہ میں ڈالنے کے لئے ٹوبہ نے جو پیکٹ کھنگالا تو احساس ہوا کہ وہ بھی خالی ہو چکا ہے، غصے سے اسے توڑ موڑ کر وہیں قالین پہ پھینکتے ہوئے ٹوبہ نے سر جھٹکا تو روبینہ بھی پھٹی آنکھوں سے بنی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران پریشان رہ گئیں،

خاموشی سے بیٹی کی اداکاری ملاحظہ کی اور سخت ناگواری سے اس کے ہاتھ سے فون کھینچا اور فوراً ہی بیس پچیس کالوں کا ریکارڈ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

”حد ہوتی ہے لاپرواہی اور ڈھٹائی کی۔“ نہایت غصے سے وہ کال ریکارڈ اس کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے طنزیہ بولیں۔

انہیں بیٹی کے رویے کی سمجھ نہیں آرہی تھی، کہ وہ سب ڈرامے اور تمنا شے کیوں کر رہی ہے، شادی کے بعد تو وہ بالکل بدل گئی تھی لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ پہلے والی ٹوبیہ ہے وہ تو نہایت ذمے دار اور سلیقہ مند لڑکی تھی کہ چند روز کے لئے میکے آتی تو ماں کے گھر کو چکا کر رکھ دیتی بلکہ چھوٹی بہنوں کی اچھی خاصی کلاس بھی لیتی۔

”یہ تم لوگوں نے میرے بعد گھر کا کیا حشر کر ڈالا ہے۔“

اور اب وہی ٹوبیہ تھی کہ اسے میکے آئے ڈیڑھ ہفتہ ہو گیا تھا اس کی بے ترتیبیاں دیکھ جہاں چھوٹے بہن بھائی حیران تھے، تو روینہ پریشان تھی، حیرت و پریشانی اپنی جگہ مگر ایک بات جو معمہ بنی ہوئی تھی کہ ٹوبیہ کو آئے کئی روز گزر گئے تھے مگر وہ دوبارہ سرال جانے کا نام نہیں لے رہی تھی، کپڑوں کا بیگ یوں بھر کر لائی تھی جسے سال بھر کے لئے قیام کا ارادہ ہو۔

تیسری حیرت انگیز بلکہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ اس کا شوہر جلال اسے کتنے فون کر چکا تھا، وہ نہ تو کال رسیو کرتی اور نہ ہی خود کال کرتی۔

”شاید دونوں کے درمیان کوئی ان بن ہو گئی ہے؟“ ماں کے دل کو کھٹکا ہوا تو بیٹی سے پوچھا مگر بار بار پوچھنے کے باوجود وہ گول مول کر جاتی۔

یہ گول مول کرنے کی عادت بھی نئی تھی،

ورنہ وہ جس بات پر پریشان ہوتی ماں سے ضرور مشورہ لے کر اپنی مشکل کا حل نکالا کرتی، مگر پہلی بار ٹوبیہ نے زندگی میں ماں کی مدد کے بغیر اپنی عقل سمجھ سے کام نکال لیا ہے اور اس پر عمل کرتی پر فارم کر رہی ہے، مگر مشکل کیا تھی یہ روینہ کو سمجھ نہیں آرہی تھی، ہاں البتہ جلال کے فون سے یہ حقیقت تو سامنے آ گئی تھی کہ ان دونوں کا ضرور کوئی جھگڑا ہوا ہے جو ٹوبیہ میکے آئی ہے مگر اصل بات کیا تھی، یہ بتانے کی زحمت داماد جی نے بھی نہ کی تھی۔

”اپنی لاڈلی کو کہیں اپنے طور طریقے درست کر لے ورنہ میرے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔“ دھمکی بتا رہی تھی کہ جھگڑا چھوٹا موٹا نہیں ہے کسی بڑی بات پہ ہوا ہے اور دونوں ہی اپنی جگہ ڈٹ گئے ہیں۔

”ٹوبیہ یہ کمرے کا کیا حال بنا رکھا ہے، چڑیا گھر بھی اس سے صاف ستھرا ہوتا ہے۔“ ڈریسنگ ٹیبل پہ اوندھے پڑے گرد میں اٹے پرفیومز، لوشن اور کریمز، صوفے پہ پڑے کپڑے جو نہ پتہ چل رہا تھا کہ دھونے والے ہیں یا دھل کے آئے ہیں، صوفے کے نیچے سینڈلز کے جوڑے آپس میں دھینگا مشتی کر رہے تھے، بیڈ کی چادر میلی اور ایک تنکے کا غلاف اتر ہوا بیڈ کے کونے پر پڑا تھا، صفائی ستھرائی کی بھی ایک ایگ کہانی تھی، ہر چیز گرد میں منہ چھپائے ہوئے تھی، پچھلی رات زور کی آندھی چلی تھی ہر چیز پر گرد ڈال گئی تھی۔

”کیا ہوا ہے ٹھیک تو ہے سب۔“ چہرے پر لاپرواہی سجائے اس نے ماں کے توجہ دلانے پر بھی کمرے کی بے ترتیبی پہ نظر نہ ڈالی بلکہ کشن کے نیچے دبا اپنا کچر تلاش کرنے لگی تھی، ایک ہاتھ میں تھنے بالوں کا جوڑا پکڑ رکھا تھا اور دوسرے

دروازہ کھلا چھوڑ دینا، ٹھنڈک بھی ضائع اور گیس کا بھی الگ نقصان، جلال کی لاپرواہی کی وجہ سے فریق دوچار بار خراب بھی ہو چکا تھا مگر جلال نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ یہ حرکت لازمی کرنی ہے چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔

”جلال آپ کی مہربانی ہوگی آپ پانی مجھ سے مانگ لیا کریں۔“ ٹوبیہ ضبط کر کے کہتی۔
”کچھ نہیں ہوتا، سب ٹھیک ہے۔“ جلال کی بے نیازی کا یہ عالم تھا۔

”جلال اسے سی چل رہا ہے، آپ دروازہ کھلا چھوڑ جاتے ہیں۔“ ٹوبیہ کے مطابق ساری کولنگ کمرے کے باہر نکل جاتی تھی مگر یہاں بھی جلال کی اپنی ہی منطق تھی۔

”تو تم میرے نکلنے ہی کمرے کا دروازہ بند کر لیا کرو، یوں بیڈ پہ بیٹھ کر آؤر دینے کا مقصد۔“ جلال اب ٹوبیہ کے ٹوکے پر چڑھنے لگا تھا۔

اسے لگتا کہ جیسے وہ کوئی نا سمجھ سا بچہ ہے اور ٹوبیہ اسے استانی بنی ہر وقت سمجھاتی سکھاتی رہتی ہے۔

”میں کئی دفعہ سو رہی ہوتی ہوں، مجھے کیا پتہ آپ کب دروازہ کھلا چھوڑ گئے ہیں۔“ ٹوبیہ جل بھن کے رہ جاتی۔

کھانا کھا کر بھی ہاتھ دھونے کی زحمت نہیں کرتا تھا، ہمیشہ ہاتھ پینٹ سے رگڑے جاتے، ٹوبیہ کے بار بار کہنے کے باوجود اسے اپنی یہ عادت بہت پیاری تھی ٹوبیہ کھانے کے بعد ٹشو پیپر پکڑاتی مگر وہ ضد بنا لیتا کہ ہاتھ پینٹ سے ہی رگڑوں گا چاہے کوئی میری گردن اتار دے۔

چھوٹے موٹے معاملات میں ہی نہیں من موچی معاملات میں بھی دھن کا پکا تھا۔

”آؤنا یار، دوپہر کا کھانا ساتھ کھاتے ہیں،

ہاتھ سے کچر کی تلاش، چند لمحوں تک ناکامی ہوئی تو سارا غصہ کشن پہ ڈھاتے ہوئے اسے فرش پہ چٹا تو ماں بیٹی کی حرکت پہ ہکا بکا رہ گئی، انہیں تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ان کی بیٹی ٹوبیہ ہی ہے۔

”ٹوبیہ یہ کیا طور طریقے اپنالے ہیں؟“
”اتنی لاپرواہی، او میرے خدا۔“ روبینہ کی آواز میں تاسف تھا اور چہرے پر بھی، بس یہ بات ماں کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ ٹوبیہ جو جیسے پھٹ پڑی اور پھر سیاری رام کھا جواب تک ماں سے چھپائے ہوئے تھی، بتا دی۔

☆☆☆

ٹوبیہ بہت سلیقہ مند تھی، اور ہر معاملے میں صفائی ستھرائی اور ترتیب کا خیال رکھنے والی، جبکہ جلال کا مزاج اس کے برعکس تھا۔

نہانے کے لئے واش روم استعمال کیا تو ٹوبیہ کبھی نہ لے کر جانا، مین کال کھلا چھوڑ جانا فرش پہ داہر لگانے کی زحمت نہ کرنا، ایک دو بار تو فرش کی پھسلن سے ٹوبیہ گری تھی اور چھوٹ بھی لگی، گیلیا ٹولیا اکثر ہی بیڈ پر پھینک دینا، جب ٹوبیہ کاحوں سے فارغ ہو کر کمرے میں آتی تو بیڈ پر ٹیکے پن کا نشان منہ چڑا رہا ہوتا، دانت صاف کیے تو بھی پیسٹ کا ذہن ادھر ادھر پھینک دینا تو بھی برش کا کپ نہ چڑھانا، موبائل چارج کیا تو چارجر بغیر سوچ آف کیے کھلا رکھ چھوڑا، ایک دو بار ٹوبیہ کو معمولی نوعیت کے جھٹکے لگے، کچڑ میں لت پت جوتے لے کر سیدھا قالین پہ آ جانا۔

”جلال ابھی دودن پہلے میں نے کارپٹ دھویا تھا آپ نے پھر سے۔“ وہ شیطانی، اس کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے جلال انداز اور جواب لاپرواہی کا حامل ہوتا۔

”او خیر خیر ہے، پھر دھل جائے گا۔“
فریق سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لینا مگر

نہ کر سکی تو تلخ ہو کر بول پڑی، جلال صاحب نے جلال میں آ کر پہلی بار ہاتھ بھی اٹھا لیا، جھگڑا زیادہ بڑھا تو ثوبیہ روٹھ کر میکے آ گئی۔

”اچھا تو یہ وجہ بھی جس کی وجہ یہ تم دونوں کا جھگڑا ہوا۔“ ماں کمرے کو سمیٹ کر اب بیٹی کے سامنے آ بیٹھی تھی۔

”امی اتنا من مو جی مرد، میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔“ ثوبیہ کا غصہ پھر سے جاگ اٹھا تھا۔

”سردیاں ہیں تو گاجر کے حلوے اور گجریلے پہ شامت، ساگ، پالک اور میتھی کا تو ایک دن بھی ناغہ نہیں ہونا چاہیے، گاجر کا مرہ بھی ہر وقت موجود ہو۔“ ثوبیہ جلال کی بگڑی ہوئی عادتوں کا ذکر کرتے ہوئے خود بھی حالت جلال میں آ گئی تھی۔

”کیلا کھایا وہیں ٹیبل پہ چھلکا رکھ دیا، کیونکہ کھا کر جھلکے جگہ جگہ پھینک دیئے۔“

یہ سب لا پرواہیاں، اپنی جگہ عین عید کے ہونے پہ بالکل آخری دنوں میں جب مصروفیات دوگنا ہو جاتی ہیں، جلال گھر میں رنگ و روغن کا کام شروع کروا لیتا، خود سارا دن دوستوں کی سنگت میں گزار دیتا اور ثوبیہ سارا دن اکیلی کام کر کے ہلکان ہو جاتی۔

”جلال، گھر کا رنگ و روغن کروانا بھی ضروری ہے مگر یہ کام اگر سہولت سے ہو جائے تو خاتون خانہ کو بھی مشکل نہ ہو، دس پندرہ دن پہلے یہ کام ہو جاتا تو بہتر تھا۔“ ثوبیہ دبے لفظوں میں شکوہ کرتی تو جلال حسب توقع بھڑک اٹھتا۔

”ایک تو تم عورتیں کسی حال میں خوش نہیں ہوتیں۔“ جلال کے طور طریقے دیکھ کر صنف نازک بھی صند میں آ گئی۔

ایسے تو پھر ایسے ہی سہی، ایک مرد کی من

بالکل ریڈی ہے۔“ ثوبیہ سے ایک بار بھی پوچھنے کی زحمت نہ کی جاتی خود ہی پروگرام بنا لیا جاتا، چھ ساتھ دوستوں کا ٹولہ لے کر گھر پہنچ جاتا اور خاتون خانہ حیران پریشان رہ جاتی۔

”بس جلدی سے کھانا نکال دو۔“ جلال یوں نارٹل انداز میں کہتا جیسے پروگرام پہلے سے سیٹ تھا۔

اور خاتون خانہ جو گھر بھر کی تفصیلی صفائی ستھرائی کر کے ہلکان ہوئی ہوئی اور دوپہر کا کھانا بھی عموماً دال چاول پکائے ہوتے، تھکی مامدی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

”کم از کم آفس سے فون کر کے بتا دیتے کہ ساتھ میں دوست بھی آرہے ہیں۔“

”ایک بار میرے کان میں ڈال دیتے تو میں ڈھنگ سے کھانا پکا لیتی۔“ ثوبیہ کے کہنے پر جلال کا تو میٹر ہی گھوم جاتا۔

”اب کیا کروں، گولی مار دوں سارے مہمانوں کو۔“ ثوبیہ کے جلنے لڑھنے پر جلال اس سے بھی دس گناہ چراغ پا ہوتا۔

”گھر چلانے کا ایمان سے کوئی طریقہ سلیقہ نہیں ہے ثوبیہ مہمیں۔“ اور پھر جلال اماں مرحومہ کے طریقے سلیقے پہ وہ دھواں دار پھر دیتا کہ ثوبیہ کے دماغ کی رگیں دکھنے لگتیں۔

”ہر وقت اماں کے فریڑز میں شامی کباب، ابلّا ہوا چلن اور کوفتے موجود تھے یہاں مہمان آئے اور وہاں سب جھٹ سے تیار۔“

دوستوں کو کھانا دیر سے ملنے کی وجہ سے جو سکی ہوتی ہوئی اس کی وجہ سے جلال سوچ سوچ جلال میں ہی آ جاتا تھا۔

”اتنی سلیقہ مند تھیں آپ کی اماں تو کچھ بیٹے کو بھی سکھا دیتیں۔“ کاموں کی تھکاوٹ اور کم وقت میں جلدی جلدی کھانا تیار کرنا ثوبیہ بھی ضبط

قدموں کا رخ ٹوبیہ کی جانب کر دیا۔

☆☆☆

جلال اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا خواہش مند تھا تو اب ٹوبیہ اکھڑ پن کا مظاہرہ کرنے پہ تل آئی تھی، وہ بھندھی کہ وہ اس چڑیا گھر میں دوبارہ نہیں جائے گی، جب روہینہ نے ساری صورتحال دیکھی تو صلح صفائی کروانے میدان میں آگئی۔

”ٹوبیہ یہ کیا بھوتنی ہے تم آگے ہی کافی حماقتیں کر چکی ہو اب مزید گنجائش نہیں ہے، ویسے بھی اگر مرد جھک جائے تو پھر عورت کے لئے مناسب نہیں ہوتا کہ وہ یوں اکڑ دکھائے۔“ جہاں دیدہ ماں بیٹی کے تیور دیکھ کر سمجھانے لگی۔

”جلال کو اپنی غلطیوں کا احساس ہے تو اب تم سختی دکھاؤ گی تو گھر خراب ہوگا، جلال نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر ٹوبیہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو میں اسے طلاق دے دیتا ہوں۔“ روہینہ کی زبانی یہ سن کر ٹوبیہ کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی، ضد ضد میں وہ یہ بھول گئی تھی کہ عورت کا گھر ہی اس کا سب کچھ ہوتا ہے اگر وہی نہ رہے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی، مرد کا کیا ہے وہ دوسری عورت لے آئے گا مگر عورت ساری زندگی اپنی ضد اور انا کو لے کر بچھڑاتی ہے۔

”بہت مقابلہ کر لیا ایک عورت ہوتے ہوئے مرد کا، بس اب لوٹ آؤ اپنی فطرت پہ اور قدرت نے عورت کو اس فطرت پر بنایا ہے نہی، سمجھو تیرے اور درگزر کرنا۔“ ماں کی باتیں دل میں اتر کر اسے نئی منزل کا پتہ دے رہی تھیں۔

☆☆☆

مانیاں برداشت سے باہر ہوئیں تو ٹوبیہ نے بھی اپنے طور طریقے بدل لئے، جو جہاں پڑا ہے پڑا ہے جو کچھ اٹھا ہے کھرا ہے کوئی پرواہ نہیں، چند دنوں میں گھر کی حالت ایسی ہو گئی کہ جلال کا تو میسر ہی گھوم گیا۔

دونوں کے درمیان اختلافات بڑھنے لگے اور آئے روز جھگڑا ہونے لگا تو شکایت ٹوبیہ کی ماں تک آن پہنچی۔

”امی اب میں واپس گھر نہیں جاؤں گی، سنبھالیں خود اپنا چڑیا گھر۔“ ٹوبیہ نے فیصلہ سنایا۔

☆☆☆

وہاں جلال کی وہ حالت ہوئی کہ سارا جاہ و جلال بھول گیا، ٹوبیہ کے جانے کے بعد گھر چڑیا گھر اور اپنا آپ درخت پر جھولتے بندر جیسا، گھر کی لیے ترتیبیں جو ٹوبیہ کے غور دلانے پر نظر نہیں آتی تھیں اب تنہا ہوا تو سب نظر آنے لگا، مجبوراً ملازمہ رکھنا پڑی، ملازمہ کا انتخاب بھی کسی مصیبت سے کم نہ تھا اگر چھوٹی بچی رکھتا تو وہ سارا گھر کیسے سنبھالتی، جوان ملازمہ پر تو دنیا نے وہ باتیں بنائی تھیں کہ کوئی حد نہیں، کہ بیوی کی غیر موجودگی میں دل بہلانے کے لئے ملازمہ ہی رکھ لی، سو جلال نے ادھیڑ عمر ملازمہ کا انتخاب کیا، وہ بھی کہاں تک سارا گھر سنبھالتی، ہفتے کے بعد اس نے تو کانوں کو پکڑ لیا۔

اب جلال کو احساس ہو رہا تھا کہ واقعی وہ بھی ان مردوں جیسی سوچ کا مالک تھا جو عورت کو انسان نہیں، بجلی سے چلنے والی مشین سمجھتے ہیں اور وہ بھی ایسی مشین جو ہمیشہ چلتی رہے بھی خراب نہ ہو، اس کا ہر پرزہ ان کی مرضی کے مطابق کام کرتا رہے، ایک عورت کو افراد خانہ سے احساس توجہ اور خیال کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ لا پرواہی اور من موبجی پن کی، اس سوچ نے جلال کے

مفادِ رسد

عشا بھٹی



جانب مائل تھا، لیکن اس کے نرمی والے تمام اشتہا انگیز نشیب و فراز ہنوز ہوش و خرد سے بے گانہ کر دینے والے تھے، جس کی پلیٹ میں ساحل قریشی بھی تھا، عالیہ بیگم اسے ایک دوست کے توسط سے ملی تھی، تین عدد بچوں کی ماں، ناچاچتے ہوئے بھی وہ اس کے چنگل میں پھنس گیا، وہ بھی اپنی خوشی سے اسے پیسوں بلکہ بے شمار دولت کی ضرورت تھی اور عالیہ بیگم کو ساحل جیسے نوجوان کی۔

”میڈم کسی دن آپ کے شوہر نے دیکھ لیا تو؟“ وہ اس کو دیکھ کر مسکرائی۔

”جب وہ دن آئے گا دیکھا جائے گا۔“ وہ قدرے قریب ہو کر بولی۔

پھر صبح صادق کے وقت وہ شکستہ قدموں سے اسے رستے پر چلا جو اس کے لئے قطعی انجان نہ تھا۔

☆☆☆

”بہت کم دن رہ گئے ہیں ساحل کی ماں۔“ اس کے باپ نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔

”میں سوچ رہا ہوں۔“

”صرف سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا، لے کھانا کھا۔“ ساحل کی ماں نے ٹبرے رکھ کر میز آگے کو کھسادی۔

”تم نے کھایا؟“ وہ روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے بولا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”تو پھر یہ بھی یہاں سے لے جاؤ مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔“ وہ روٹی کا نوالہ واپس رکھتے ہوئے، کھانے کی ٹرے دور کھسادی۔

”اے ہے، تم تو کھانا کھا لو سارا دن دھوپ میں محنت کر کے آتے ہو، پھر سارا دن خوار ہوتے پھرتے ہو۔“ بیوی کے کہتے ہی اس نے ٹرے

کاش کہ انسان اپنے اندر شعور اور آگہی کو بھی اجاگر کرے کیونکہ بہت سی لاعلاج بیماریاں اور مسائل تو ایسے ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں اور انسان برائی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے اور جب احساس ہوتا ہے تو وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے اور وقت کبھی کسی کے لئے نہیں رکتا، نفسا نفسی کے اس دور میں اپنے ضمیر کو ہمیشہ زندہ رکھنا چاہیے احساس کو اپنے اندر سمو کر کیونکہ اگر آپ کے اندر احساس نہیں ہے تو اپنوں کو بھی غیر بننے دیر نہیں لگے گی اور اگر احساس ہے تو غیروں کو بھی آپ سے محبت ہو جائے گی انسان جب اپنی نظر سے گر جائے تو اچھے برے کی تمیز کھودیتا ہے اور جانوروں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

”کون ہے؟“ پل بھر میں روشنی کی سرگرداں لہر اس پر مرکوز ہوئی، ذہ رک گیا، کچھ توقف کے بعد وہ بوجھل دل اور تھکے قدموں سے اس راستے پر چلتا گیا جس پر وہ پچھلے ایک سال سے گامزن تھا۔

گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی اس کا دل نامانوس سی لے پدھر کا، گیٹ کے سامنے بنی لمبی سی کالے اور سفید ماربل کے پتروں کی روش میں چلتا دھیرے دھیرے آگے بڑھتا یونہی وہ اندرونی دروازے کی جانب بڑھا تو اسے سامنے دیکھ کر چونکا۔

وہ لمحہ بھر کو اس کو دیکھتی رہی تاریکی میں ہونے کے باوجود اس کے لبوں پر ریشمی مسکراہٹ دیکھی جاسکتی تھی، اس کے وجود سے پھوٹی پرفیوم کی خوشبو محسوس کیا جاسکتا تھا۔

وہ پچاس کے لگ بھگ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی جس کا وجود قدرے بھاری پن کی

”اماں کپڑے دھونے والے صرف کی بوتل کہاں رکھی ہے؟“

”کیوں؟“ اس نے کیا کرنا ہے تجھے؟“
ماں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھ کر استفسار کیا۔

”خودکشی کرنی ہے مجھے۔“ اس نے برہمی سے کہا اس کی بات سن کر ماں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”چل دفعہ ہو یہاں سے۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔

اگلے دن ساحل تانیہ کے پاس جا بیٹھا۔
”تانیہ دیکھو میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں، تمہارے فیورٹ وہی بڑے۔“ وہ ہاتھ میں پکڑے شاپر کو آگے کرتے ہوئے بولا، تانیہ نے بے دلی سے اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر کو دیکھا اور چپ کر کے اپنا ہاتھ آگے بڑھاے اس سے لے لیا۔

”میری گڑیا اتنا کیوں سوچتی ہو، فکر کرنے کے لئے میں ہوں نا، بس کچھ دن کی بات ہے، پھر سارے مسئلے ایسے حل ہو جائیں گے۔“ وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

”بھیا، آپ مجھے کب تک بہلائیں گئے؟ میں دودھ پیتی پنچنی نہیں ہوں، ویسے کیا کر لیں گے آپ؟“

”دیکھو بہنا، وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
”کب؟“

”ہمارے مرنے کے بعد۔“ اس کے ہونٹوں پر آ جانے والی پرتمسخر مسکراہٹ دیکھے بغیر وہ باہر نکل گیا۔

پھر سارا دن وہ سڑکوں کی خاک چھانتا رہا وہ سڑک کے کنارے ایک خالی پیگ پیروں سے

اپنے قریب کر لی، اس نے ایک نوالہ کھا کر دوسرا بیوی کی طرف پڑھا دیا، اس کی ماں نے بے اختیار منہ کھولا اور گھبرا کر ساحل کی جانب دیکھا جو ساتھ پڑی چار پائی پر لیٹا تھا، ساحل کو پتا تھا یہی ہو گا چنانچہ اس کے صرف کان کھلے تھے اور آنکھیں بند تھیں، کچھ توقف کے بعد اس کی ماں کی آواز اس کے کانوں سے نکل گئی۔

”تانیہ پڑھنا چاہتی ہے کب سے گھر بیٹھی ہے۔“ اس کی بات سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گیا۔
”تم عورتوں کے بھیجے میں آنے والی بات ہوتی تو رونا کس بات کا تھا، اری او ساحل کی ما، مرد اگر ایم اے پاس ہو تو ضروری نہیں لڑکی اس کی پیروی کرے پڑھ لکھ کر بھی تو اس نے ہانڈی روٹی ہی کرنی ہے، اب اپنے پتر کو ہی بے لے بی اے کرنے کے بعد بھی سارے شہر کی خاک چھانتا رہا پھر بھی ناکام لوٹ آتا۔“ اس کے باپ نے کھر درے لمبے میں سمجھاتے ہوئے کہا، اس کا باپ ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا، وہ ٹیکسی بھی قسطوں پر لی گئی تھی جس کی ہر ماہ باقاعدہ اقساط جمع کرائی جاتی تھی۔

اس کی ماں کی پر تشویش خاموشی، آنکھوں کی اداسی اور چہرے کی افسردگی بڑھتی جا رہی تھی، چند دن پہلے ہی تانیہ کے سسرال والے آئے تھے بدلے بدلے تیور اور بدلہ ہوا لہجہ اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ جہیز کی بنیاد پر یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے تھے، تب سے ہی تانیہ بجاری نے خود کو کمرے میں قید کر رکھا تھا، اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں نے ڈیرے جما لئے تھے میلے چیلے کپڑے، بکھرے بال لگتا تھا جیسے میلوں سے نہ نہائی ہوں سوکھے لب جیسے پیاس کے احساس سے مادرا ہو گئے ہوں ایک دن وہ ماں کے قریب آ کر عجیب سے لہجے میں بولی۔

اچھالتا جا رہا تھا کہ اچانک سارہ اس کے سامنے آ گئی، سامنا ہوتے ہی وہ دونوں اپنی اپنی جگہ رک گئے۔

”سارہ!“ ساحل نے چند لمحے ساکت و جاہد رہنے کے بعد کہا۔
”کیسی ہو؟“

”دینی کی ویسی جیسی چھوڑ کر گئے تھے، اللہ کا شکر ہے کہ جناب نے پہچان تو لیا ورنہ میں تو سمجھی تھی سرسری نظر ڈال کر راستہ بدل لے گا۔“ وہ طعنے سے بولی۔

”میں بھلا تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں؟“ وہ ہکلا یا۔

”او! اچھا نیلی، بالی داوے کتنا یاد کیا مجھنا چیز کو؟“ وہ جی سے بولی۔

”سارہ میرے ساتھ آؤ میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”بات کرنے کو بچا ہی کیا ہے؟“ وہ مذاحتی لہجے میں ہاتھ چمڑا کر بولی۔

”مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ ایک دم اس کے سامنے آیا۔

”آگے سے ہٹو۔“ وہ اس کو ہاتھ سے ایک طرف دھکیل کر آگے بڑھ گئی، تو اس نے زمین کو پاؤں سے زور سے ٹھوک ماری۔

شام کو وہ اپنے دوست علی کے ساتھ کیفے میں چائے پی رہا تھا کہ اندر آتے دولٹروں میں سے ایک کو دیکھ کر چونکا۔

”علی! یہ..... یہ لڑکا بلیک پینٹ اور نیلی شرٹ والا میدے (محمود) چیز اسی کا بیٹا ہے نا۔“ اس سامنے بیٹھتے ہوئے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تصدیق چاہی، تو علی معنی خیز سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ اتنے ٹھٹھاٹ باٹ سے کیسے ہے۔“ اس نے اس کے حلیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرانی سے استفسار کیا۔

”سنا ہے کوئی میڈم پنسار کھی ہے موصوف نے۔“ علی نے خباثت سے آنکھ مار کر کہا۔
”کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”یوں سمجھ کہ اپنا آپ بیچ رہا ہے تو کہے تو پتا بتا دوں تو، تو اس سے بھی زیادہ پیئڈم ہے، مالا مال کر دے گی تجھے تو اس کو خوش کر دینا وہ تجھے کر دے گی۔“ پہلے تو اس نے گھور کر علی کو دیکھا پھرنا چاہتے ہوئے بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

وہ ایک کروڑ پتی عورت تھی جو اسے کھلونے کی طرح استعمال کر رہی تھی اور اسے یہ کھلونا پسند آ گیا تھا اور یہ کھلونا نہ تو اس کے لئے پہلا تھا اور نہ ہی آخری، لیکن وہ دوطرفہ مجبوری اور اسیری کے آگے پتھر ڈالے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔

بلاشبہ وہ ایک طرح دار عورت تھی جس کا شوہر ایک کمرے میں اپنا بیچ پڑا تھا نہ اس نے کبھی جاننے کی کوشش کی اور نہ ہی اس نے کبھی بتایا۔

احساس مجبوری یا گناہ کب کا ختم ہو چکا تھا، وہ رات کو نصف شب کے قریب جا کے صبح صادق کے وقت لوٹ کے آتا۔

تانیہ کے سسرال والوں کی ساری ڈیمانڈیں پوری کر کے اس نے اس کو بیاہ دیا وہ نفسیاتی مریض ہونے سے بچ گئی تھی، باپ کو اس نے ایک کریانے کی دوکان بھی کھول دی۔

آج کئی مہینوں بعد وہ سارہ کو ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا، جونا چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چلی آئی، کرسی پر بیٹھتے ہی اس کی نظر اس کے موبائل فون پر پڑی جو خاصا مہنگے والا تھا۔
”میرا نمبر تو اس قیمتی فون میں نہیں ملتا ہوگا،

اسے کچھ نہیں دے سکتا یہ توقعات رکھنے والی محبت تھی رفاقت مانگنے والی تحفظ اور دائمی خوشیاں مانگنے والی۔

اب وہ کیسے بتائے کہ جدائی کا زہر اس نے کیسے پیادقت ایک لمحہ پیچھے چلا گیا۔
”اگر کہنے کو کچھ نہیں تھا تو یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ سارہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

”یہ اتنا آسان نہیں تھا میرے لئے تم کو بھول جانا لیکن چاہ کر بھی میں ایسا نہ کر سکا، تم تو میری نس نس میں سمائی ہوئی تھی، بھلا کیسے بھول جاتا۔“

”چلو ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں اور آنے والے کل کی بات کرتے ہیں۔“
”کل، لمحے کا پتا نہیں اور تم کل کی بات کرتے ہو، چلو بقول تمہارے کل کون سے سرخاب کے پر لگا کر آئے گا، بتاؤ بھلا کل کیا ہوگا۔“ وہ طنز سے گویا ہوئی۔

”جو نا چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں عود کر آیا۔“
”تم صرف یہ بتاؤ آخر کرتے کیا ہو؟“
ساحل نے محسوس کیا کہ اس کے سوال کے جواب سے بچا نہیں جاسکتا سردست اس کے پاس ویسی سنواری تھی جو اس نے گھر والوں کو سنائی تھی اس نے بڑے دھڑلے سے سکون اور اعتماد سے دوبارہ دہرا دی۔

”تم نے جھوٹ کیوں بولا ساحل؟“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا، وہ چونکا۔

”جھوٹ..... کیا..... کیا جھوٹ بولا میں نے؟“ اس کی زبان ذرا سا لڑکھڑائی۔

”مجھے یقین نہیں آتا تم مجھے اس طرح اُلو بناؤ گے، میں تمہاری باتوں میں آ جاؤں گی میں

غریبوں کا جو ہے۔“ وہ جل کر بولی تو اس کے انداز پر ساحل کو زو سے ہنسی آئی۔

”طعنے تو مت دو۔“ اس کے ہاتھ سے موبائل فون لیتے ہوئے ساحل نے کہا۔
پھر اسے تھول کر سم نکالی اور اس موبائل میں لگا دی جو اس کے اپنے ہاتھ میں تھا اور سارہ کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ میں تمہارے لئے لایا تھا۔“ وہ اس کے پاس میز پر رکھ کر بولا۔
”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پرے دھکیل کر بولی۔

”وقت بدل گیا ہے سارہ جو میرے تمہارے بیچ میں تھا۔“
”کیسے بدل گیا ہے؟“
”کوئی اعلیٰ دین کا چراغ ہاتھ لگا ہے کیا۔“ وہ تنک کر بولی۔

”یہی سمجھ لو۔“

”ہم نے تانیہ کی رخصتی بھی کر دی ہے میری تمہاری راہ میں اب ذمہ داری کی کوئی دیوار حائل نہیں رہی، بتاؤ کب اماں ابا کو تمہارے گھر لے کر آؤں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔
”مجھے یقین نہیں آتا۔“ وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔

”اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے بھلا؟“

”ساحل تم نے تو نا کام ہو کر اور مسائل سے گھبرا کر مجھے چھوڑ دیا تھا وہ۔“

”دیکھو سارہ، اس وقت حالات میرے حق میں نہیں تھے میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش محسوس کی اور اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر کیسے وہ اچانک فیصلہ کر بیٹھا کہ اسے سارہ کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ وہ

تمہاری رگ رگ سے وقت ہوں مجھے صرف اور صرف بچ سنا ہے۔“ ایک ایک لفظ وہ مضبوط لہجے میں گویا ہوئی، تو اس کا رنگ یکدم فق ہو گیا، وہ ایک ایسی گلی میں پھنس گیا جو چاروں اطراف بندھی اس کے ماں باپ تو سادہ لوح لوگ تھے کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں تھی، ساحل گہری سانس خارج کر کے سارہ کو سب کچھ بتا دیا، پرسکون چہرے کی طمانیت نے کچھ نہیں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ تو نظر اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا بھلا کیا کہتا۔

”میں تم سے کال پر بات کروں گی۔“ اس کا سر جھکا دیکھ کر وہ گویا ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔ رات کو وہ خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں گم کرے کی چھت کو گھورتا رہا اور سارہ کے بارے میں سوچتا رہا، ان دونوں کے درمیان پہلے سے شادی کے عہد و پیمان بھی ہوئے تھے۔ ساحل نے بھی صاف کہا تھا بوڑھے ماں باپ ہیں اور اس کی ایک بہن بھی ہے جس کی شادی اس وجہ سے رکی ہوئی ہے کہ اس کے سسرال والوں نے جبین کی ایک لمبی فہرست تھمائی تھی چنانچہ وہ سارہ سے شادی کرے گا تو بہن کی رخصتی کے بعد سارہ کو بھی جلدی نہیں لیکن جب ساحل کو کوئی جاب نہ مل سکی تو اس نے بددی مایوسی اور ڈپریشن کی حالت میں ایک طرفہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ وہ سارہ کو چھوڑ دے گا، آخر وہ کب تک آس لگائے بیٹھی رہے گی اس کے حالات تو بدلنے والے نہیں ہیں۔

”اب تو حالات اس نے اپنا آپ داں کر کے ٹھیک کر لئے تھے لیکن اب اتنی دیر ہو گئی تھی کہ لوٹ کے سارہ کے خوابوں کی تعبیر دینے کے لئے جانا اسے بے سود لگا، اپنی بے حسی خود غرضی

اور بے رحمی پر اب سارہ کے سامنے جا کے شرمندہ ہوتا اور اس سے معافی مانگنا ممکن نہ رہا تھا۔“ اپنے موبائل کی رنگ ٹون سے چونک کر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آیا، اس نے لیس کا بٹن پیش کر کے یونہی موبائل فون کو کان سے لگایا تو سارہ کی بات سن کر ساکت رہ گیا۔

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تو دوبارہ پوچھ بیٹھا۔

”میں نے کہا کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“ اس کے لہجے کی مضبوطی نے اسے باور کروا دیا کہ اب شاید وہ اسے کھو چکا ہے، اسے سارہ کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

”کمانے کے اور بھی ذریعے ہوتے ہیں ساحل تم تو دو نکلے کے عام آدمی ہی نکلے تم اپنے مفاد کے لئے اتنا گر جاؤ گے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی، جو انسان خود سے ہارا ہوا ہو وہ دوسروں سے مقابلہ نہیں کرتا مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کی اصلیت نہیں جانتا، تم کیا سمجھتے ہو تم مجھے دھکا دو گے اور مجھے خبر تک نہ ہو گی؟ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، شاید تم نے سنا ہو، سورۃ نور میں کہ ”خبیث مرد کے لئے خبیث عورت اور اچھے مرد کے لئے اچھی عورت کا انتخاب کیا گیا ہے“ میں یہ تو نہیں کہتی کہ میں بہت اچھی عورت ہوں مجھ میں بھی کئی خامیاں ہوں گی مگر تم سے پھر بھی اچھی ہوں، جو اپنے مفاد کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے، آج سے میرے اور تمہارے راستے جدا ہیں، بھول جاؤ کہ تمہاری زندگی میں سارہ نام کی کوئی عورت آئی تھی، میں بھی بھول جاؤں گی اوکے اللہ حافظ۔“ کہتے ہی اس نے موبائل آف کر دیا، کتنی ہی دیر وہ شاکلہ منجد بے یقین سا جہاں کا تھاں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

سرسبز ہوا
ام اقصیٰ



نماز کی ادائیگی کے بعد زینب نے کورے ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا دیئے، لبوں کی جنبش پہ خلوص نیت کی مہر ثبت کرنے لگی آنسو آٹھڑے بہتی ندی سی رواں زندگی میں ایک دم سے تلاطم اس کے میاں کی وفات کا آیا اور ٹھہرا رہا، صبح اچھا بھلا کام کے لئے نکلا، شام خاتے کی خبر لائی، دوکان بند کر کے روڈ کراس کرتے ٹرک تلے آکر کچلا گیا، دوڑھی بیٹیوں زینبیہ اور آمنہ کا ساتھ اور بھری جوانی میں پیوگی کی چادر تن گئی، تیسرے بچے کی آمد قریب تھی، صبر کا فولادی چولا اوڑھے اس کے لبوں کی خواہش ضرورت بن کر ہمہ وقت اس کے لبوں پہ ٹھہری رہتی، اولاد زینہ کی خواہش بہنوں کے سر کی چادر اس کے بڑھاپے کی ضرورت، ویسے تو اولین دنوں سے ہی وہ بیٹے کی دعا کر رہی تھی، مگر سر کا سناں گزر جانے کے بعد لب سانس کے لئے بعد میں کھلتے دعا کے لئے پہلے واہوتے۔

”مما بھوک لگی ہے۔“ زینبیہ نے ان کے تسلسل سے بہتے آنسوؤں کو باندھا تھا، زینب نے ہاتھ بڑھا کر اسے گود میں بٹھایا اپنی پھیلی ہتھیلیوں کے اوپر اس کی ننھی ہتھیلیاں پھیلائیں۔

”اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں آپ کے لئے منا سا بھائی بھیجیں۔“ ہیکے لبوں سے دعا کی صورت آہ نکلی۔

”اللہ تعالیٰ ہمیں ایک چھوٹا سا بھائی دے دیں پلیز۔“ ماں کی ضرورت بیٹی کے لبوں سے خواہش کی صورت نکلی۔

”بھائی کب آئے گا ماما؟“ ذرا سا سراٹھا کر وہ یقین دہانی چاہ رہی تھی۔
 ”جلد انشاء اللہ۔“ زینبیہ کے سر پر بوسہ دیتے خود کو دلاسا دیتا تھا۔
 آزر دگی کی گھڑی آنسوؤں کی آمد اور

آہوں سے ہوئی، بچے کے رونے کی بھاری آواز نے زینب کو سہا دیا تھا، تکلیف پہ آنکھی کا درد بھاری پڑا، دعاؤں کی قبولیت نے رخ کسی اور جانب موڑ لیا تھا۔

ذرا سا سراٹھا کر زینب نے اپنے اندازے کی تصدیق چاہی، بیٹی ہوئی ہے، اس کے تکلیف زدہ چہرے کو دیکھ کر نرس نے مختصر آبتایا۔
 ”میرے مولا تیری رمزیں تو ہی جانے۔“

زینب نے سر بیڈ پر گرایا۔

☆☆☆

رواں زندگی دکھ کے کنکروں سے کب رکی ہے بھلا؟

رازق کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کا ہے۔

اور یہ وعدہ بھی اسی رحیم کا ہے۔

سبب بنتے رہے، پیٹ بھرتے رہے اور دن گزرتے رہے، مگر ایک دعا جو زینب کے لبوں پر ٹھہری ہی رہی۔

ایک وارث کی التجاء، بہنوں کی کمر ڈھکی رکھنے والے کی دعا، برسوں گزر گئے، دو دہائیاں ہو چلی تھیں، مگر اب بھی جب بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھتے، اسی ایک دعا کے علاوہ سب لفظ بھول جاتے۔

کب؟ کیوں؟ کیسے؟ جیسے خوف اسے ڈراتے ہی نہ تھے، بغیر کسی سوالیہ نشان کے یہ دعا کن کی منتظر رواں تھی، کبھی کبھار ایک بے بس سی ہنسی زینب کے لبوں پر لچھوٹ ٹھہری رہتی جب اس دعا کی گہرائی کو وہ سوچتی۔

زینبیہ ایم ایس سی کے لاسٹ سیمیٹر میں تھی، آمنہ بی ایس آنر کے پانچویں سیمیٹر میں جبکہ ہادیہ ایف ایس سی کر رہی تھی، ابتدائی کچھ عرصہ ذریعہ آمدن زینب کی سلائی اور اوپری پورشن کا کرایہ رہا، ایف ایس سی کے بعد زینبیہ نے ٹیوشن

بڑھانا شروع کر دیا پھر آئیہ بھی اس کا ساتھ دینے لگی، کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ فکریں پریشانیوں کہ زینب اب سلائی نہ کر پاتی تھی۔

آج کل تو ایک ہی فکر سوار تھی، زینبہ کو اس کے گھر کا کرنے کی فکر، خود وہ اکلوتی تھیں، ان کے میاں کے دو بھائی تھے، ایک باہر جا بسا تھا اور ایک بے اولاد تھا، دور پار کے رشتے دار شروع دنوں کی مشکلات سے کتراتے اب تک نہ پلٹے تھے، اپنی جان پہچان کے لوگوں میں سے زینب نے ایک دو کہہ رکھا تھا۔

زینبہ تو فی الوقت اس سب کے حق میں نہ تھی، مگر اسے آنے والے بے مہر وقت کے اندیشے لرزاتے تھے۔

بازاروں، تقاریبوں میں وہ، وہ مہربان چہرہ تلاش کرتیں جو اس کی لاڈلی کے سر کا تاج ٹھہرتا، سوتے اٹھتے وہ بیٹیوں کے اچھے نصیبوں کی دعا کرتیں پائی جاتیں۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے وہ نامعلوم خوف کے حصار میں تھیں، چھٹی حس مبہم سا اشارہ دے رہی تھی، خاموش طبع سی زینبہ ہلکھلانے لگی تھی، بسا اوقات اس کی آنکھوں میں اس قدر چمک ہوتی گویا سینکڑوں ہیرے کوٹ کے ڈالے ہوں، پل کی پل بھی نظریں ملانے پہ اگلے کی آنکھیں خیرہ کر دیتیں، ایک خوبصورت سی مسکان خراماں خراماں اس کے چہرے پہ پہروں ٹپکتی، رات سوتے میں زینب اٹھ اٹھ کر اس کا چہرہ ٹولیتیں گویا اندر کا راز جاننا چاہ رہی ہوں، اس کے چہرے کی تحریر کو دیکھیں بڑھتی پرکھتیں۔

ملنے اندھیرے میں بھی زینبہ کے چہرے پہ روشنیوں کا گماں ہوتا، جڑی پلکوں میں سے خوش رنگ سپنوں کا عکس پورے چہرے پہ چھایا ملتا،

زینب آنکھیں چرائیتی کہ اس دھنک رنگ چہرے کو پچھلی کی دعا خود اسے کہیں بد دعا کی صورت نہ آن لگے۔

ابھی وہ حرف بنی تھیں اور لفظ ڈھونڈتیں تھیں کہ زینبہ سے اس افشاں بھرے سننے کا پوچھنے کی بابت کہ ایک شام اس کے گلے میں بانہیں ڈالے کاندھوں پہ تھوڑی ٹکائے زینبہ نے وہ راز اگل دیا۔

”مما آپ سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔“
”کون؟“ کئی ایک اندیشے مناپ کی صورت زینب کے من میں پھنکارے تھے۔

”دو بچوں کی ہوم ٹیوشنز کی تھیں پچھلے دنوں ان کی انیکسی میں رہتا ہے۔“ زینب کے کندھے ڈھلک سے گئے۔

”کیا نام ہے؟ کیا کرتا ہے؟“
”زیر نام ہے اور کام کی تفصیل آپ خود پوچھ لیجئے گا۔“

”مما!“ زینبہ اسے پکار کے چند ٹاپے کی۔

”مما اگر آپ ناں کرنا چاہیں باوجود اس کے کہ آپ کو اس میں ہزاروں خوبیاں نظر آئیں تو بھی میں آپ کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ایک لفظ نہ کہوں گی اور اگر آپ ہاں کرنا چاہیں باوجود اس کے کہ اس میں ایک بھی خوبی آپ کو نظر نہ آئے تو اس بات سے اولین ہے۔“ ڈھلکے کندھے ذرا سے سیدھے ہوئے، زینبہ کی تربیت میں احترام کا مادہ بہر حال تھا۔

زینب کل ہونے والی ملاقات کی بابت سوچنے لگی۔

کیسی بھاری سی ذمہ داری اس کے اوپر آن پڑی تھی، پوچھ پڑتاں سو چیزیں ہوتی ہیں دیکھنے والی۔

زینب کی دعا مستجاب ٹھہری تھی، کن کوٹیکوں میں بدلے پندرہ برس کا عرصہ ہو گیا تھا، مزارب سمجھ میں آئی تھی، حکمت کا اب پتہ چلا تھا، پندرہ برس ہوئے تھے زینب کی شادی کو، دو پھول اس کے آنگن میں کھل چکے تھے، برا بھلا سب وقت آیا مگر زبیر کا رویہ ایک رتی نہ بدلا تھا، بلکہ گزرتے وقت میں اچھے سے اچھا ہوتا گیا تھا آپ کی شادی ہوئی، ہادیہ کی بھی، زینب نے تین پورشن ہوا کر تینوں کے نام لگا دیئے، زبیر حقیقتاً اچھا بیٹا ثابت ہوا تھا، زینب کو اب اپنے رب کی حکمت سمجھ میں آئی تھی، اپنا بیٹا ہوتا تو بہو اس کی مالک ٹھہرتی۔

مرضی ہوتی ملنے دیتی ورنہ نہیں یا اسے لئے کہیں اور شفقت ہو جانی یا یہ ماں بیٹیاں اس کی آنکھ میں کھٹکتیں، ہونے کو کچھ بھی ہو جاتا مگر اللہ نے زمینی فرشتہ عطا کیا تھا کیسی خوش نصیب ٹھہری تھی وہ اس سال حج پہ جا رہی تھی۔

اللہ کے گھر کو دیکھتے وہ شکرانہ ادا کرنے والی تھی، دہائیوں سے اس کے ہونٹوں پہ رواں لفظوں کی مستجابی کا شکرانہ۔

☆☆☆



”اے خدا تو مجھے ایک بوجھ ہانٹنے والا دے دے، بڑھاپے کا سہارا دے دے۔“ بے خیالی میں لب ہلتے چلے گئے، ذہن نے مفہوم تک رسائی دی تو ایک سرد آہ زینب کے لبوں سے نکلی۔

☆☆☆

اگلی سہ پہر ڈھلے جب زینب اکیڈمی گئی ہوئی تھی وہ نوجوان آیا، مضبوط قد و قامت کا خوش شکل جوان تھا عربی کوئی اٹھائیس انتیس سال ہو گی، بظاہر تو سلجھا ہوا دکھتا تھا، تین بھائی تھے والدین حیات نہ تھے، ایک بھائی آسٹریلیا ہوتا تھا دوسرا دوہی، زبیر اکیلا ہی رہتا تھا سو فٹ ویزر انجینئر تھا اور مقام کالج میں پڑھاتا تھا۔

زینب کو اس میں قابل گرفت تو کوئی بات نظر نہ آئی، مگر بیٹیاں بے شک شہزادوں سے بیاہی جائیں، ماؤں کے دل تو پھر بھی ڈرتے ہیں اچھے نصیبوں کی دعائیں تو وہ پھر بھی مانگتی رہتی ہیں۔

اگلے مہینے دونوں کا سادگی سے نکاح کر کے رخصتی بھی کر دی گئی، زبیر نے سارے انتظامات خودی سنبھالے، زینب کسی بھی معاملے میں اس سے رائے مانگتیں اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”جیسے آپ کو مناسب لگے، جیسے آپ بہتر سمجھیں۔“ زینب تو نہال ہی ہو جائیں، دو ایک ماہ وہ انیکسی میں رہے، پھر زینب کے گھر کے سامنے والے گھر میں کرائے پہ شفٹ ہو گئے، زینب نے تو بہت زور لگایا کہ اوپری پورشن کرائے داروں کو اٹھا کر یہ لوگ سیٹ ہو جائیں مگر زبیر نہ مانا، آنے والے دنوں میں زبیر نے گھر کے سب معاملے بلکہ کہنا چاہیے سب مسئلے اپنے ہاتھوں میں لے لئے ساری ذمہ داریاں وہ خوش اسلوبی سے نبھانے لگا۔

☆☆☆

جمانے اور انہیں جھڑکیاں دینے کا کوئی حق نہیں،
ہر فعلی استحقاق صرف غرور نفس کا دھوکا ہے۔

اور غرور کسی انسان میں اس وقت تک نہیں آ
سکتا جب تک وہ بد قسمت نہ ہو، نصیب والے،
قسمت والے ہمیشہ عاجز و مسکین ہی رہتے ہیں۔
ساجدہ احمد، ملتان

فرمان رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:-
”قابل رشک دو ہی آدمی ہو سکتے ہیں،
ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی
دولت عطا فرمائی اور وہ شب و روز اس پر عمل کرتا
ہے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و
دولت سے نوازا اور وہ شب و روز اس کے حکم کے
مطابق اس مال کو خرچ کرتا رہتا ہے۔“

صفہ خورشید، لاہور

زندگی گزارنے کے بہترین طریقے

۱۔ اس طرح زندگی گزاروں کہ جب تک تم
زندہ رہو لوگ تم سے ملنے کے لئے بے قرار
رہیں اور جب تم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ
تو تمہاری یادیں آنسو بہائیں۔

۲۔ ان پھولوں کی طرح زندگی گزاروں جو ان
لوگوں کے ہاتھوں میں بھی خوشبو دیتے ہیں
جو انہیں مسل کر پھینک دیتے ہیں۔

۳۔ پھولوں کی طرح اپنی زندگی دوسروں کے
لئے وقف کر دو، تم نے دیکھا نہیں کہ وہ
مزاروں پر بھی سجتے ہیں اور سہرے کی لڑیوں

الحديث

”زکوٰۃ سے مال کی حفاظت“

ارشاد نبویؐ ہے کہ ”اپنے مالوں کو زکوٰۃ کے
ذریعے محفوظ بناؤ اور اپنے بیماروں کا صدقہ سے
علاج کرو اور بلا اور مصیبت کی موجوں کا دعا اور
اللہ کے حضور میں عاجزی اور گریہ زاری سے
استقبال کرو۔“

”جنگل ہو یا سمندر کسی جگہ بھی جو مال ضائع
ہوتا ہے وہ زکوٰۃ نہ دینے سے ضائع ہوتا ہے۔“

”ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے دو عورتوں کے ہاتھ میں سونے کے ٹکڑے دیکھے
تو ان سے پوچھا کہ ان کی زکوٰۃ دیتی ہو یا نہیں؟
انہوں نے عرض کیا نہیں، تب آپؐ نے فرمایا کیا
تم کو یہ پسند ہے کہ اس کے بدلے میں آگ کے
لنگن پہنائے جائیں۔“

انہوں نے عرض کیا نہیں۔

”پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،
تو پھر اس کی زکوٰۃ دیا کرو۔“ (بخاری ترمذی
شریف)

سارا حیدر، ساہیوال

نصیب والے

جھڑکیاں دینے والے، رعب جمانے
والے، دھمکیاں دینے والے، یہ بھول چکے ہوتے
ہیں کہ وہ بھی انسان ہیں، انسانوں پر رعب

میں بھی مسکراتے ہیں۔

عابدہ حیدر، بہاول نگر

(حدیث مبارکہ)

۱۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:۔
جب تم کسی کو دوست بناتے ہو تو اپنے دل میں قبرستان بنا لو، تاکہ تم اس کی برائیوں کو ذہن کر سکو۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:۔ دنیا میں سب سے غریب وہ ہے، جس کا کوئی دوست نہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق وہی پورے کر سکتا ہے جو بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔

۴۔ مسائل کا مقابلہ صبر سے اور نعمتوں کی حفاظت شکر سے کرو۔

آصفہ نعیم، نور علی عباس

حدیث مبارکہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

”سیدنا جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبروں کو پختہ کریں اور اس بات سے کہ ان پر بیٹھیں اور اس سے کہ ان پر گنبد (یا عمارت) بنائیں۔

فریدہ اسلم، میاں چنوں

ذرا سوچیں

☆ ایک ایسی غلطی جو آدمی میں عاجزی پیدا کر دے وہ اس کا رنامے سے بہتر ہے جو غرور پیدا کر دے۔

☆ اکثر لوگ اپنے بہترین دوستوں کی کمتری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

☆ غلطی کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے اور معاف کر دینا ملکوتی عمل ہے۔

☆ حقیقی دوست وہ ہے جو آپ کی طرف اس وقت آتا ہے جب ساری دنیا آپ کو چھوڑ چکی ہوئی ہے۔

☆ میرے خیال میں موت تکلیف دہ ہے لیکن اتنی نہیں جتنی زندگی۔

☆ ہر چیز کو اس طرح دیکھو جیسے پہلی دفعہ یا آخری بار دیکھ رہے ہو پھر اس دنیا میں تمہارا وقت بہت شادمانی سے گزرے گا۔

☆ دل پر مصیبتیں مت ڈالو کیوں، دل پر مصیبتیں آنکھوں کی وجہ سے آتی ہیں۔

مہین آفریدی، ایبٹ آباد

حدیث مبارکہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

”کوئی شخص زبان سے بات کرتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ اس سے کچھ نقصان بھی ہوگا، حالانکہ وہ اس کے سبب ستر سال تک نیچے آگ میں گرتا رہتا ہے۔“

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

”خاموشی میں کئی حکمتیں ہیں لیکن خاموشی اختیار کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

”خاموشی سب سے اونچی عبادت ہے۔“

راحیلہ فیصل، سرگودھا

سدرہ خانم ---- ملتان
س: ستاروں کی حدوں سے لے کر خوشبو کے
جزیروں تک؟

ج: میری کمی ہے۔
س: نبض تھم رہی ہے اور وہ؟
ج: اخبار پڑھ رہے ہیں۔

س: ہمیں کوئی خوشی راس کیوں نہیں آئی؟
ج: تم نے سنا نہیں دووں کی چاندنی پھر اندھیری
رات ہے۔

س: توقعات کا محل جب ٹوٹ جائے تو؟
ج: دل کے ٹکڑے ہزار ہوتے ہیں۔

س: میری ہر سانس میں شامل ہے وہ مگر؟
ج: آج کل آلوگی بہت ہے۔
آصف نعیم ---- فورٹ عباس

س: عین غین اگر دل گوشت کی بجائے سونے
کے ہوتے تو محبت میں تحفہ دیتے جاتے یا
فروخت کیے جاتے؟

ج: دل تو اب بھی سونے کے ہوتے ہیں صرف
آپ ہی نہیں پرکھ سکتے۔

س: ہم کو ان سے بے وفا کی امید جو نہیں جانتے
وفا کیا ہے، آخر کیوں؟
ج: تمہیں آدمی کی وفا جو ہے۔

س: مجھے آپ سے ایک نہایت پرسنل راز شیئر کرنا
ہے، آپ میرے خواب میں آجائیں گے یا
میں لاہور آؤں؟

ج: میں کہاں آؤں گا تم ہی آ جانا۔
س: عین غین جی اگر راہ میں چلتے چلتے ”وہ“

اجانک مجھے مل جائے تو؟
ج: تو گہنا یونہی کوئی مل گیا تھا سر راہ چلتے چلتے۔
فریہ اسلم ---- میاں چنوں

س: محبت میں جیت تو ہوتی ہے لیکن ہار کیوں
ہوتی ہے؟
ج: محبت میں ہار کب ہوتی ہے۔

س: آپ ہمارے کیا لگتے ہیں؟
ج: یہ تو آپ ہی بتا سکتی ہیں۔

س: جناب کا موڈ کیوں خراب ہے؟
ج: اگر تمہیں یہ ہی معلوم نہیں تو کیا فائدہ۔

س: آئے ہو میری زندگی میں تم بہار بن کے؟
ج: اور تم ہو کہ بہار کو نہیں پہچان رہی۔
س: کچھ زیادہ تو نہیں ہو گیا؟

ج: بہت زیادہ ہو گیا۔
س: ہم آپ سے کیسے مل سکتے ہیں؟
ج: لاہور آکر۔

مہین افریدی ---- ایبٹ آباد
س: عین غین جی پہلی مرتبہ آپ کی محفل میں
تشریف کا ٹوکرا لے کر حاضر ہوئی ہوں؟

ج: یہ خیال رہے کہ ٹوکرا زیادہ بھاری نہ ہو۔
س: اگر کوئی آپ سے کہے اگر اس کی ممکن ہو رہی
ہے تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟

ج: ہو رہی ہے تو مجھے کیا، شاید تمہیں.....
س: اس عمر میں اتنی شوخ گفتگو کچھ خیال کر س؟
ج: تمہیں میری عمر پر کوئی اعتراض ہے یا گفتگو

راحیلہ فیصل ---- سرگودھا
س: سرگودھا

س: تو اپنی بنی بنیڑ تینوں ساڈے نال کی؟

ج: جواب دے کر اپنی ہی بنیڑ رہا ہوں۔

س: میریاں مساداں وچ کوئی پیادسا اے؟

ج: یعنی اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ ہوا۔

س: اگر میں تمہارے آنگن میں اتر آؤں؟

ج: تم چاند تو نہیں ہو۔

س: تمہیں کس موسم میں شدت سے یاد آتی

ہوں؟

ج: جب تمہارے بے تکے سوال پڑھتا ہوں۔

آمنہ خان ---- راولپنڈی

س: ہر شوہر کو اپنی بیوی سے اور ہر بیوی کو اپنے

شوہر سے شکایت کیوں ہوتی ہے؟

ج: وقت گزارنے کے لئے کچھ نہ کچھ ہونا

چاہیے۔

س: عورت شوہر کو مار سکتی ہے تو شوہر عورت کو

کیوں نہیں مار سکتا؟

ج: کیونکہ وہ عورت اس کی بیوی نہیں ہوتی اور

شوہر نے کوئی غلط حرکت کی ہوگی۔

س: شوہر کب اپنی بیوی کے لئے پریشان ہوتا

ہے؟

ج: جب وہ بازار میں خریداری کر رہی ہو۔

س: آج کل کے شوہر اتنے معصوم نہیں ہوتے

جتنا کہ وہ بنتے ہیں؟

ج: تم بیچارے شوہروں کے پیچھے کیوں پڑی

ہوئی ہو۔

صابرہ سلطانہ ---- کراچی

س: اگر کوئی اچھا بھلا انسان پاگلوں کی سی حرکتیں

کرے تو؟

ج: اس میں بچوں کو بہلانا اور شیشہ دیکھنا شامل

نہ کریں۔

س: کیا انسان عمر کے ساتھ سلھتا ہے یا الجھتا ہے؟

ج: الجھتا زیادہ ہے۔

س: انسان اوپر کو دیکھتا ہے نیچے کیوں نہیں؟

ج: نیچے دیکھے گا تو گریبان میں جھانکنا پڑے گا۔

س: کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے؟

ج: یہ بھی ایک انداز ہے زندگی کا۔

س: آپ روٹھے کو منانا جانتے ہیں؟

ج: ابھی تک تو موقعہ ہاتھ نہیں آیا۔

س: اگر کوئی شخص آپ سے تو پورا تر آئے؟

ج: بڑا ہی بدتمیز ہوگا۔

سدرہ خانم ---- ملتان

س: سنا ہے کھا کھا کر بہت موٹے ہو گئے ہو؟

ج: کچھ اپنے بارے میں بھی سوچو۔

ج: آخر تم میرے بارے میں اتنی فکر مند کیوں

ہو۔

س: گھر کی مرغی دال برابر ہو تو پڑوسی کی مرغی کو

کیا کہیں گے؟

ج: ہم تو گھر کی بھی نہیں کھاتے، یہ تو چوری

کرنے والا جانے۔

س: سنا ہے دنیا بڑی ترقی کر رہی ہے، کیا خیال

ہے؟

ج: انٹرنیٹ گلوب ترقی کی وجہ سے آباد ہیں۔

س: ذرا یہ بتائیں کہ شادی شدہ شریف ہوتا ہے یا

کنوارہ؟

ج: کھل کر بات کرو دل میں کچھ کالا معلوم ہوتا

ہے۔

س: اگر کوئی کسی سے بے پناہ محبت کرتا ہو اور وہ

اس سے بے وفائی کرے تو؟

ج: تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔

س: محبت کی آخری حد کہاں ختم ہوتی ہے؟

ج: یہ راستے بڑے خاردار ہوتے ہیں۔

☆☆☆



سارا حیدر -----
میں سوچتی ہوں محبت عجب دھوکا ہے
جو مل نہ سکے کبھی اس کی آس رہتی ہے
جسے پا نہ سکیں اس کا دھیان رہتا ہے
جو مجھ سکے نہ کبھی ایسی پیاس رہتی ہے

لوگوں نے ہنر اپنا دکھایا بھی بہت ہے
جا جا کے اس میں لے منایا بھی بہت ہے
سچ پوچھو تو پیارا بھی بہت لگتا ہے دل کو
وہ شخص کہ دل جس نے دکھایا بھی بہت ہے

میرے ہونٹوں پہ مہکتے نغموں پہ نہ جا
میرے سینے میں کتنی طرح کے غم چلتے ہیں
میرے چہرے پہ دکھاوے کا تبسم ہے مگر
میری آنکھوں میں اداسی کے دیے جلتے ہیں
ساجدہ احمد -----
ملتان

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دکھ کی دھوپ کے آگے تسکھ کا سایہ ہے
جھوٹ تو قاتل ٹھہرا اس کا کیا رونا
سچ نے بھی انسانوں کا خون بہایا ہے

خود اپنے ہی اندر سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تخی کے پروں پر
ہم جو ہنس ہنس کر سب سے ملتے ہیں
خود سے مل کر بہت اداس ہوتے ہیں

اگر ہو سکے تو کرو خود میں کشش پیدا

ہر کسی کو حسرت سے دیکھا نہیں کرتے
ہر شخص نہیں ہوتا ہر شخص کے قابل
ہر شخص کو اپنے لئے پرکھا نہیں کرتے

شبنم کے آنسو پھول پر یہ تو وہی قصہ ہوا
آنکھیں میری بھیگی ہوئی چہرہ تیرا اترتا ہوا
برسات میں درو دیوار کی ساری تحریریں مٹی
دھویا بہت مٹتا نہیں تقدیر کا لکھا ہوا
صفہ خورشید -----
لاہور

کیا وقت آ پڑا ہے یہ ہم سے نہ پوچھیے
ہم لوگ کب رسول و خدا کے غلام ہیں
کچھ اس طرح بڑھی ہیں یہاں خود پرستیاں
ہم لوگ صرف اپنی انا کے غلام ہیں
عامرہ انبیا عائشہ -----
حویلی بہادر شاہ
اور بات کہ لب چشم پوش ہو جائے
کچھ تو غم اسے بھی ہمارے حال کا تھا

محبتوں میں بھی قاتل تھی لب نہ کھولنے کی
جواب درنہ میرے پاس ہر سوال کا تھا
عابدہ حیدر -----
بہاول نگر

حدوں کی ضد سے تو کر آزاد مجھے
دل میں بسایا ہے تو آنکھوں میں اتار مجھے
میرے جذبوں میں ہے پاکیزگی
تو جس رشتے سے چاہے پکار مجھے
آصفہ نعیم -----
فورٹ عباس

ظفر اس بھیڑ میں گم ہی نہ ہو جاؤں کہیں میں
جدھر سارے کے سارے ہیں لڑھونے سے ڈر لگتا ہے

میں خود کو میسر نہیں آیا ہوں ابھی تک
تم سے بھی نہ مل پاؤں تو حیرت نہیں کرنا

چلیے وہ شخص ہمارا تو کبھی تھا ہی نہیں
دکھ تو یہ ہے کہ تمہارا بھی نہیں ہو سکتا
دنیا اچھی بھی نہیں لگتی ہم جیسا کو سلیم
اور دنیا سے کنارہ بھی نہیں ہو سکتا
صابرہ سلطانہ ----- کراچی

گھاؤ گنتے نہ کبھی زخم شاری کرتے
عشق میں ہم بھی اگر وقت گزاری کرتے
وقت آیا ہے جدائی کا تو پھر سوچتے ہیں
تجھ کو اعصاب پہ اتنا بھی نہ سوار کرتے

یہ میری نظریں بلندیاں تھے کس مقام تک لے گئیں
وہ تمہارے قدموں کی دھول تھی مجھے کہکشاں کا گماں ہو
دنیا میں اس کا کوئی خریدار نہیں
میں بیچتا ضرور جو بکتا میرا نصیب

لذت گناہ میں جس نے جنت بھی ہار دی
میرے وجود میں اسی آدم کا خون ہے
حنا شاہین ----- حیدر آباد

ایک نیا راستہ نکالا ہے
ہم نے منزل سے خود کو نکالا ہے
ہم ہواؤں سے خواب پکڑیں گے
ہم نے نظروں سے جال ڈالا ہے

آنکھوں کا رنگ بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں بدل گیا
شاید وفا کے کھیل سے اکتا گیا تھا وہ
منزل کے پاس آ کے جو رستہ بدل گیا

☆☆☆

گھر سے نکلی تو خبر بن جائے گی آپس کی بات
جو بھی قصہ ہے ابھی تک صحن کے اندر تو ہے
آسان سبزگوں پہ اک تارا ، اک چاند
دسترس میں کچھ نہ ہو ، یہ خوشنما منظر تو ہے

راز ہستی کچھ نہیں اکثر پہ دیکھا گیا ہے
بے خبر ہستے رہے ، یا خبر روتے رہے
فریہ اسلم ----- میاں چنوں
ٹوٹ جائیں نہ کہیں ضبط کی خواہش میری
نہ کر میرے ہمسفر اس قدر آزمائش میری
گہنا گیا میرے روپ کا جادو بتا مجھے
یا پھر دل سے کم ہونے لگی چاہتیں میری
مہین آفریدی ----- ایبٹ آباد

کبھی فرحتیں جو نصیب ہوں
چلے آنا مرے پاس تم
ہیں ادھورے بکتے معاملے

میری ذات سے تیری ذات تک
راجیلہ فیصل ----- سرگودھا
آئینہ گر تجھے معلوم نہیں ہے شاید
لوگ محروم خدوخال ہوئے جاتے ہیں

توڑ دیتا ہے بدن لذت اشیاء کا خمار
لوگ مر جاتے ہیں بازار سے گھر آتے ہوئے

پہلے شکوہ تھا ، یہاں رونق بازار نہیں
اب جو بازار کھلے ہیں تو خریدار نہیں
سب کے ہاتھوں میں یہاں زہر پیالہ ہے مگر
کوئی سچ بولنے کے واسطے تیار نہیں
آمنہ خان ----- راولپنڈی

ہم لوگ تو خوشبو کی طرح ہیں ترے اطراف
ہم سادہ دلوں سے تو سیاست نہیں کرنا

خودکشی اور محرومی

ایک صاحب رنگین ٹی وی اور ڈی وی ڈی اٹھائے تیز تیز قدم اٹھاتے نہر کی طرف جا رہے تھے راستے میں ایک دوست نے دیکھا اور پوچھا۔

”کیا بات ہے، کدھر جا رہے ہو؟“

”خودکشی کرنے جا رہا ہوں۔“ ان صاحب

نے جواب دیا۔

”مگر ان چیزوں کا کیا مطلب ہے؟“

دوست نے حیرانی سے پوچھا۔

وہ صاحب غصے سے چلائے۔

”ان ہی چیزوں کے ساتھ ڈبوں گا، میری

بیوی مجھ پر نہ سہی ان چیزوں پر تو محرومی کا ماتم

کرے گی ناں۔“

یقین

وکیل، چور سے۔

”اب جبکہ میں نے تمہیں بری کروا دیا ہے

تو یہ تو بتاتے جاؤ، کہ تم نے چوری کی بھی تھی یا

نہیں؟“

چور۔

”عدالت میں آپ کی بحث سن کر مجھے

یقین سا ہو رہا ہے کہ میں نے چوری نہیں کی۔“

سدرہ خانم، ملتان

مرغی کی دعا

ایک مرغی نے تین انڈے دیئے اور دعا مانگی کے بچے نیک نکلے چند دنوں بعد ایک بچہ نکلا جو نماز پڑھ رہا ہے پھر دوسرے دن دوسرا بچہ نکلا جو بیچ پڑھ رہا تھا، تیسرے دن بچہ ہی نہ نکلا، دو دن اور گزر گئے آخر کار مرغی پریشان ہو گئی اور اللہ سے دعا مانگنے لگی، تب ہی انڈے سے آواز آئی امی جان! پریشان مت ہوں میں عتکاف پر بیٹھا ہوا ہوں۔

آسیہ فرید، خانیوال

ٹی وی

ایک آدمی گھر پہنچا تو دیکھا کہ ٹی وی ٹوٹا پڑا

ہے اور اس کا بیٹا اس میں جھانک رہا ہے۔

باپ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اگرے تم نے یہ کیا کیا؟“

بیٹے نے جواب دیا۔

”اس میں ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ مجھے باہر

نکالو، اب میں نے ٹی وی توڑا ہے تو نجانے وہ

کہاں چلا گیا ہے۔“

فون

ایک آدمی فون پر دوسرے آدمی سے۔

”آپ کون بول رہے ہیں؟“

دوسرا آدمی۔

”میں بول رہا ہوں۔“

”آپ کون بول رہے ہیں؟“

پہلا آدمی ادھر سے۔

وقت ملازم وقتے میں کھانا کھانے باہر گئے ہوئے تھے۔

جب وقفہ ختم ہوا تو سیلز مین دروازے میں کھڑا ہو گیا اور اندر داخل ہونے والے افراد کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، اس نے جن ملازموں کو شادی شدہ بتایا، وہ واقعی کنوارے نہیں تھے۔

منیجر نے حیران ہو کر پوچھا۔
”آپ نے یہ اندازہ کیسے کر لیا؟“
سیلز مین نے جواب دیا۔

”شادی شدہ ملازمین جب کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے پائیدان پر پاؤں صاف کیے لیکن کسی بھی کنوارے نے اس سلیقے کا اہتمام نہیں کیا۔“

فارہ سلیم، شریفور

صحیح جواب

منیجر نے کلاس کے لڑکوں کو کلاس روم میں ہی بیٹھ کر مضمون لکھنے کے لئے موضوع دیا۔

”اگر مجھے دس کروڑ روپے مل جائیں تو میں کیا کروں گا؟“

سب لڑکے تیزی سے مضمون لکھنے میں مصروف ہو گئے لیکن سلیم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا، وقت ختم ہونے پر منیجر نے سب سے پیپر جمع کیے تو سلیم نے سادہ کاغذ تھما دیئے۔

”یہ کیا.....؟“ منیجر نے غصے سے کہا۔

”سب لڑکوں نے دو، دو تین تین صفحات کے مضمون لکھے ہیں مگر تم نے کچھ بھی نہیں لکھا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔“

”سر! دس کروڑ روپے ملنے کے بعد میں یہی کروں گا۔“ سلیم نے اطمینان سے کہا۔

سارا حیدر، ساہیوال

☆☆☆

”میں بھی میں بول رہا ہوں۔“
مریم انصاری، سکھر

پرائی کاریں

”دادو ماں، دادو ماں!“ چار سالہ اصغر نے بڑے تجسس سے اپنی دادی سے پوچھا۔

”جب کاریں پرائی ہو جاتی ہیں، گلے سڑنے لگتی ہیں تو ان کو کیا کرتے ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ دادی اماں نے سکون سے کہا۔

”وہ تمہارے دادا خرید لیتے ہیں۔“
عزہ فیصل، قصور

نظم

”تا کید“

سنو! زمیں زادے

ملک بوس کہساروں کے سفر پہ جاؤ

تو سفر طلب میں امان دل کھوندینا

وہ خواب جو ابھی تیری پلکوں میں زندہ ہیں

انہیں ابھی تعبیر کا آئینہ مت دینا

وہ آرزوئیں جو ابھی تیرے من میں پوشیدہ ہیں

انہیں فقط احساسات کا پیرہن عطا کر دو

کہ یہ پیرہن امانت دل

اور خوبصورت جذبوں کا

سب سے بڑا مین ہے

نور انور، فیصل آباد

وجہ

ایک ٹریولنگ سیلز مین نے ایک بڑے

کاروباری ادارے کے منیجر سے کہا۔

”میں آپ کو تمام ملازمین کے متعلق بتا سکتا

ہوں کہ کون شادی شدہ ہے اور کون کنوارا۔“ اس

راحیلہ فیصل: کی ڈائری سے ایک نظم

سفر میں شام سے پہلے
اگر

بے آس ہو جاؤ
کوئی جگنو، کوئی تلی، کوئی بھی رنگ
اپنے پاس نہ پاؤ
تو

اک پل کو
مجھے تم یاد کر لینا

اور

اپنا سفر آغاز کر لینا

تمہیں ہر موڑ پر رستہ صاف اور روشن دکھائی دے

دھنک کے ساتوں رنگ تمہارے گرد اک ہالہ
بنائیں گے

تنتلیاں اپنے پروں کا مخملی پن تمہارے ساتھ کر
دیں گی

سفر کی تختیوں سے وہ تمہیں محفوظ کر دیں گی
بس

اک پل کو
مجھے تم یاد کر لینا

آمنہ خان: کی ڈائری سے ایک نظم
”مجبوری“

بارشوں کے موسم میں
تم کو یاد کرنے کی

عادتیں پرانی ہیں

فرینہ اسلم: کی ڈائری سے ایک غزل

جو خیال تھے نہ قیاس تھے، وہی لوگ مجھ سے پھڑ گئے

جو محبتوں کی اساس تھے، وہی لوگ مجھ سے پھڑ گئے

جنہیں مانتا ہی نہیں یہ دل، وہی لوگ میرے ہیں، ہمسفر

مجھے ہر طرح سے جو داس تھے، وہی لوگ مجھ سے پھڑ گئے

مجھے لمحہ بھر کی رفاقتوں کے سراب اور ستائیں گے

مری عمر بھر کی جو پیاس تھے، وہی لوگ مجھ سے پھڑ گئے

یہ خیال سارے ہیں عارضی، یہ گلاب سارے ہیں کاغذی

غل آرزو کی جو پاس تھے، وہی لوگ مجھ سے پھڑ گئے

جنہیں کر سکا نہ قبول میں، وہ شریک راہ سفر ہوئے

جو میری طلب، میری آس تھے وہی لوگ مجھ سے پھڑ گئے

مری ہر ٹکڑی کے قریب تھے مری پہلا تھے میرا خواب تھے

وہ جو نصف شب میرے پاس تھے وہی لوگ مجھ سے پھڑ گئے

مہین آفریدی: کی ڈائری سے ایک نظم

وفا جب مصلحت کی شال اوڑھے

سرور کا روپ دھارے

دل کے آگن میں اترتی ہے

تو پلکوں پر ستاروں کی دھنک مسکانے لگتی ہے

کبھی خوابوں کے ان چھوئے ہیولوں سے بھی

ان دیکھی سی، ان جانی سی خوشبو آنے لگتی ہے

کسی کے سنگ بیٹے، ان گنت لمحوں کی زنجیریں

اچانک ذہن میں جب گنگنائی ہیں

نفس ک تار میں سنانا نیکدم چیخ اٹھتا ہے

تو یوں محسوس ہوتا ہے

ہوا میں سرگوشی سی کرتی ہیں

محبت کا تمہیں ادراک اب تو ہو گیا ہوگا؟

اب کہ ہم نے سوچا ہے
عادتیں بدل ڈالیں
پھر خیال آیا کہ
عادتیں بدلنے سے
بارشیں نہیں رکتیں

صابرہ سلطانہ: کی ڈائری سے ایک نظم
”شیشے کا“

اعتبار شیشے کا، امتحان شیشے کا
دیکھو کھیل مت کھیلنا شیشے کا

ان دنوں جہاں ہم ہیں ہم کو ایسا لگتا ہے
ہے زمین شیشے کی، آسمان شیشے کا
ٹوٹنا تو ہے آخر، ٹوٹنے سے کیا ڈرنا
پتھروں کی بستی میں کیا دھیان شیشے کا
ہم بھی کتنے سادہ ہیں، دھوپ سے بچاؤ کو

سر پہ تان رکھا ہے سائبان شیشے کا
شہر ہے محبت کا اور حیران ہوں میں
ہر مکین شیشے کا، ہر مکان شیشے کا
جز مرے بتاؤ تو اور کون دے سکتا
فصل بوئی پتھر کی اور لگان شیشے کا

حناشاہین: کی ڈائری سے ایک نظم
کوئی سورج جاگے میری دھرتی پہ
کچھ ایسا ہو یہ رات ڈھلے

کوئی ہاتھ میں تھا سے ہاتھ میرا
کوئی لے کر مجھ کو ساتھ چلے
کوئی بیٹھے میرے پہلو میں
میرے شانے پر ہاتھ رکھے
آنسو پونچھ کر آنکھوں سے
رکے رکے لہجے میں کہے
یوں تنہا سفر بھی کتنا نہیں
چلو ہم تم دونوں ساتھ چلیں

حناشاہین: کی ڈائری سے ایک غزل

میں نے پایا ہے وہی جو تھیں آشنائیں تیری
میرے آچل سے لپٹی رہیں دعائیں تیری
گہرے پانیوں پہ جھلی آنکھیں میری سرشام
اور میری آنکھوں میں چھلکیں نگاہیں تیری
ایک ہم کو بھی راس نہ آئے تیرے موسم دنیا
ایک بے مہر بہت تھیں ہوا میں تیری !
صدیوں کی مسافت بھی راہیگاں ٹھہری
بڑھنے ہی نہ دیتی تھیں آگ صدائیں تیری
جانے والے نے وقت رخصت یہ بھی نہ پوچھا
قدم اٹھتے ہی کیوں آنکھیں بھر آئیں تیری
میں دشت کے سفر پہ کب تنہا تھی غزل
مجھ کو ہر گھڑی تھا سے رہیں بانہیں تیری

سدرہ خانم: کی ڈائری سے ایک غزل

وہ جو اس کے چہرے پہ رنگ حیا ٹھہر جائے
تو سمندر، وقت، ہوا ٹھہر جائے
وہ مسکرائے تو ہنس پڑے کئی موسم
وہ گنگنائے تو باد صبا ٹھہر جائے
وہ ہونٹ ہونٹوں پہ رکھ دے دم آخر
مجھے گملاں ہے آئی قضاء ٹھہر جائے
میں اس کی آنکھوں میں بھانکوں تو جیسے جم جاؤں
وہ آنکھ جھپکے تو چاہوں ذرا ٹھہر جائے

آسیہ فرید: کی ڈائری سے ایک غزل

تجھے اظہار محبت سے اگر نفرت ہے
تو نے ہونٹوں کو لرزے سے تو روکا ہوتا
بے نیازی سے مگر کانپتی آواز کے ساتھ
تو نے گھبرا کے مرا نام نہ پوچھا ہوتا
تیرے بس میں تھی اگر مشعل جذبات کی لو
تیرے رخسار میں گلزار نہ بھڑکا ہوتا

☆☆☆

دہی اور رائتہ

آلوؤں کو نمک ڈال کر ابالیں، جب اچھی طرح گل جائیں تو اتار لیں اور چھیل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، دہی میں بالائی ملا کر خوب پھینٹ لیں، پیازوں کو نمک لگا کر اچھی طرح دھو لیں اور دہی میں ملا دیں، اب اس میں آلو، نمک، سرخ مرچ، گرم مسالا اور ہری مرچ ڈال کر ملائیں، اس تیار شدہ رائتے پر ہر ادھنیا چھڑک دیں۔

ہر امسالا رائتہ

اشیاء
دہی
نیم مرچ (پسی ہوئی)
دودھ
نمک
ہر ادھنیا (پسا ہوا)
ترکیب

ایک پاؤ
کھانے کا ایک چمچہ
آدھا کپ
حسب ذائقہ
کھانے کے دو تچھے

دودھ کو ابال لیں اور نیم ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھ دیں، دہی کی (ضامن) کو تھوڑے سے دودھ میں اچھی طرح پھینٹ لیں، پھر اس کو باقی دودھ میں ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور ڈھک دیں یا فوراً کسی گرم جگہ پر رکھ دیں، جب دہی جم جائے تو اس کو فریج میں یا ٹھنڈی جگہ پر رکھ دیں یا فوراً استعمال کر لیں، دہی خوب گاڑھا ہو جائے تو اس میں دو عدد دبزر مرچیں ڈال دیں۔

آلو کا رائتہ

دہی میں دودھ ڈال کر اسے اچھی طرح پھینٹ لیں، اب اس میں ہری مرچ (پسی ہوئی) نمک اور ہر ادھنیا (پسا ہوا) ملا دیں، ہر امسالا رائتہ تیار ہے جو دیکھنے میں خوش رنگ اور ذائقہ میں لا جواب ہے۔

بھگاروالا رائتہ

اشیاء
دہی
آلو (ابلے ہوئے)
دو عدد
کالی مرچ (پسی ہوئی)
چائے کا آدھا چمچہ

اشیاء
آلو (چھوٹے سائز کے) ایک پاؤ
پیاز (باریک کٹا ہوا) ایک عدد
بالائی
کھانے کے تچھے
سرخ مرچ
حسب ذائقہ
ہری مرچ (باریک کتری ہوئی) حسب پسند
دہی (خوب پھینٹا ہوا) ڈیڑھ پاؤ
گرم مسالا (پسا ہوا) چائے کا آدھا چمچہ
نمک
حسب ذائقہ
ہر ادھنیا (باریک کتر اہوا) کھانے کے دو تچھے
ترکیب

پیں لیں، دہی میں دودھ ملا کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں، اب ایک کھانے کا چمچھی، تیل گرم کریں اور اس میں پیا ہوا مسالا بھونیں، جب مسالا بھن جائے تو پھینٹے ہوئے دہی میں بیٹنگن کے قتلے اور بھنا ہوا مسالا ڈال دیں اور ہر ادھنیا اور ہری مرچ چھرک دیں، لذیذ راستہ تیار ہے۔

ٹماٹر اور تلی ہوئی ہری مرچ

ثابت سرخ مرچ
دودھ
نمک
زیرہ
گھی، تیل
ترکیب

تین سے چار عدد
آدھا کپ
حسب ذائقہ
چائے کے دو چمچے
کھانے کا ایک چمچ

دودھ کو دہی میں ملائیں اور اچھی طرح پھینٹ لیں، آلو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس میں ملا دیں، نمک اور کالی مرچ (پسی ہوئی) بھی اس میں ملا دیں، ایک فرانگ پن میں گھی، تیل گرم کریں اور اس میں زیرہ اور ثابت سرخ مرچ ڈال کر ذرا دیر بھونیں، تیار شدہ راستہ پر زیرہ اور سرخ مرچ، گھی تیل سمیت ڈال دیں، مزے دار راستہ تیار ہے۔

بیٹنگن کا راستہ

اشیاء
ٹماٹر
پیاز
ادرک
لہسن پیسٹ
نمک
ہری مرچ
گھی
ہلدی
ترکیب

آدھا کلو
ایک پاؤ
ایک کھانے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
آدھا پاؤ
آدھی پیالی
ایک چائے کا چمچ

پہلے ٹماٹر دھو کر ان کا چھلکا اتار لیں اور ٹکڑے کاٹ لیں، پھر ایک فرانی پن میں آدھا گھی گرم کرنے کے بعد ہری مرچیں تل کر نکال لیں، دوسری دہنچی میں بجا ہوا گھی ڈال کر پیاز باریک کاٹ کر تل لیں، تلی ہوئی پیاز میں بے ہوئے مسالے اور ٹماٹر کے ٹکڑے ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔

اب اس میں آدھی پیالی پانی ڈال کر دہنچی کو ڈھانپ دیں، جب ٹماٹروں کا پانی خشک ہونے لگے تو تلی ہوئی مرچیں ڈال دیں اور دم پر لگا دیں۔

ترتی اور کالے پنے

اشیاء
کالے پنے
ایک پیالی

اشیاء
بیٹنگن (قتلے)
دودھ
نمک
ثابت دھنیا
گھی یا تیل
ہری مرچ (باریک کتری ہوئی)
دہی
پیاز باریک کٹا ہوا
سرخ مرچ کٹی ہوئی
ہر ادھنیا باریک کتر ہوا
ترکیب

ایک عدد
آدھا کپ
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
تیلنے کے لئے
حسب ضرورت
ڈیڑھ پاؤ
ایک عدد
چائے کا ایک چمچ
حسب پسند

گھی یا تیل گرم کریں اور اس میں پیاز بادامی کر کے نکال لیں، اس گھی میں بیٹنگن کے قتلے تل کر نکال کر الگ رکھ لیں، اب بادامی کیے ہوئے پیاز، دھنیا، نمک اور سرخ مرچ کو خوب باریک

(رات کو بھگودیں)

کلونجی
نمک
تھوڑی سی
حسب ذائقہ
حسب پسند
(باریک ٹکڑے کر لیں یا کش کر لیں)
ترکیب

پیار
ادرک پیسٹ
نمک
ہلدی پاؤڈر
تیل
ترکی
ٹماٹر چھوٹا
لہسن پیسٹ
لال مرچ پاؤڈر
ہری مرچیں
میٹھی
ترکیب

ریلے چھیل کر ان میں نمک لگا کر رکھ دیں
جب ان کا پانی نکل جائے تو پانی سے خوب دھو
لیں، دال الگ سے اباں لیں، اب سارا مسالا
دال میں شامل کر لیجئے، مسالا ملی چنے کی دال
کرلیوں میں بھر کر دھاگے سے کریلے باندھ لیں
اور یکے گرم بھی میں تل لیں، مزے دار دال
بھرے کریلے تیار ہیں۔

ٹماٹر کا کچور

پیاز اور ٹماٹر پیس لیں تیل گرم کریں اس
میں میٹھی پیاز اور ٹماٹر کا آمیزہ ڈال دیں، ادرک،
لہسن، نمک، مرچ، ہلدی ڈال کر مسالا بھون
لیں، اس کے بعد ترکی چھیل کر کاٹ لیں، کالے
چنوں کو رات بھر بھگو کر ان کو اباں لیں، چنے اور
ترکی مسالے میں ڈال دیں۔

اشیاء
ٹماٹر
ہرا دھنیا
نمک
سرخ مرچ
لیموں
پیاز
ہری مرچ
سرکہ
ترکیب

پھر اس کو ایک چوتھائی پیالی پانی ڈال کر
ڈھانک کر دھیمی آگ پر پکا میں، گل جانے پر
بھون لیں اوپر ہری مرچ ڈال کر چادلوں کے
ساتھ سرو کریں۔

چنے کی دال بھرے کریلے

پیاز باریک کاٹ لیں جیسے آلیٹ کے لئے
اس کو نمک لگ کر دھو لیں، اب اس میں ٹماٹر
چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پیاز کی طرح باریک
کاٹ کر ملا لیں نمک سرخ مرچ ملانے کے بعد
سرکہ ملا دیں زیادہ کھٹائی پسند کرنے والے لیموں
اد پر نچوڑ لیں ورنہ کچور ویسے ہی مزادیتا ہے۔

اشیاء
کریلے
سونف
لہسن
مرچیں
تیل تلنے کے لئے
دال چنا

☆☆☆

ورد کرتے ہوئے اسی میں ہماری فلاح ہے۔

یہ پہلا خط ہمیں رابعہ سعید جو لیہ سے تشریف لائی ہیں وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

ستمبر کا شمارہ سات تاریخ کو ملائیشیہ پر ترکی کی اداکارہ کو براجمان دیکھ کر حیرت ہوئی سب سے پہلے طاہر بھائی کی باتیں سنی اور ان سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اسلامیات والے حصے میں پہنچے، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہوئے اور انشاء جی کے کالم میں پہنچے، وقت کے لحاظ سے ان کی نظم بے مثال تھی، ام مریم آپ کا ناول ”امید صبح و بھال“ کچھ لکھتے وقت آپ یا تو کسی پریشانی میں ہیں یا آپ لکھنا کچھ اور چاہتی ہیں اور لکھ کچھ اور رہی ہیں نہ جانے کیوں اب آپ کی تحریر میں وہ مزہ نہیں آ رہا جو آپ کا خاصا تھا، پلیز ہمیں وہی ام مریم چاہیے جو جب قلم اٹھاتی تھی تو کرداروں کو لازوال کر دیتی تھی، معاذ کا کردار آج بھی ہمارے ذہنوں میں زندہ ہے پلیز تحریر میں کچھ نوک جھونک لائیں۔

دوسرا سلسلے وار ناول (میری عادت ہے میں پہلے سلسلے وار ناول پڑھتی ہوں) ”اسیرِ عشق“ بھی بہترین جا رہا ہے، سدرہ اسے اپنے مخصوص صوفیانہ انداز میں لکھ رہی ہیں، اللہ کرے پر بھات کو سارنگ مل جائے ناولٹ میں اس ماہ ایک نیا نام ندا حسین کا نظر آیا ویلڈن ندا آپ نے ناولٹ کا آغاز ہی بڑا شاندار کیا ہے پہلی قسط نے ہی اپنے سحر میں مبتلا کر لیا ہے اس پر ناول کا

السلام علیکم!

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔

آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ طلوع ہونے والا ہر نیا دن ہمارے لئے نئے نئے سبق اور تجربات لے کر آتا ہے اور ہر روز غروب ہونے والا سورج ہمارے دامن میں بے شمار یادیں چھوڑ جاتا ہے، یہ یادیں بھی ہونٹوں پر مسکان بن کے چمکتی ہیں تو کبھی آنسو بن کر آنکھوں میں ٹھہر جاتی ہیں، دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کے پاس اچھی یادوں کا خزانہ نہ ہو مگر ضروری نہیں کہ ہر شخص کسی یاد کا حصہ بھی ہو۔

اس ہزار سالہ قدیم دنیا میں ان گنت لوگ گمناہی کی زندگی گزار کے گمناہی کی موت مر گئے مگر جو لوگ اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر خود کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وقف کر دیتے ہیں انسانوں کی فلاح کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں وقت کے اندھیروں میں ایسے لوگ جگنو بن کر چمکتے ہیں، جدوجہد، خلوص اور سچائی کی راہ پر چلنے والے یہ لوگ روشنی کا وہ مینار ہوتے ہیں جن سے ہماری آنے والی تسلیں منزلیں پانی ہیں تاریخ کے اوراق ایسے ہی لوگوں سے روشن ہیں۔ اپنا بہت سا خیال رکھئے گا اور ان کا بھی جو آپ کا خیال رکھتے ہیں آپ سے محبت کرتے ہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

آئیے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں حسب عادت درود پاک، استغفار اور کلمہ طیبہ کا

حنا کے چمن کو مہکانے آجائیں گی اپنی تحریر سے اپنی رائے سے آگاہ کرنی رہیے گا انتظار رہے گا شکریہ۔
عشاء بھٹی: ذی جی خان سے لکھتی ہیں۔

شمارہ اس بار حسب خلاف لیٹ ملا، سر انتہائی دیدہ زیب و دلکش تھا، ماڈل کافی کیلگ رہی تھی، سب سے پہلے حمد و نعت پڑھے، نئی کی پیاری باتوں سے دل منور کیا، ”کچھ باتیں ہماریاں“ میں انٹری ماری چہ ہمیشہ کی طرح طاہر بھائی کی باتوں نے دل کو لیا، مکمل ناول میں ”آرزوئے محبت“ اعتر ابدال ”جب وہ مہربان“ حمیرا نوشین دونوں اچھی کاوش تھی ویری ویلڈن، ناولٹ میں سب گل کی ”مجھے عشق ہے“ میں نے بھی دل چھو ندا حسین، قرۃ العین سکندر سبھی نے اچھا لکھا قرۃ العین رائے خوش آمدید، آپ کو دیکھ کر دل خوش گیا، آپ تو میری فیورٹ رائٹر میں سے ایک ہیں، سلسلے دار ناولوں میں ”امید صبح و جمال“ مریم کی اچھی کاوش ہے، ویلڈن مریم جی، سد انتہائی کی ”اسیر عشق“ کی تعریف واقعی میں سور کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، سدرہ آپ کو میں سیلوٹ پیش کرتی ہوں اور افسانہ اپنی مثال آپ تھے، مستقل سلسلے سبھی اچھے تھے فوزیہ غزل جی کہاں ہیں، آپ جلدی سے جائیں میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں، آپ حنا میں چار چاند لگا دیا کرتی تھیں، پلیز اب او انتظار مت کروائیں۔
عشاء بھٹی تبصر کے شورے کو پسند کرنے شکریہ، آپ کی رائے مصنفین کو پہنچانی جارہی ہیں، اپنی رائے سے آگاہ کرنی رہا کریں شکریہ۔
فیروزہ امین: خانہ اوال سے لکھتی ہیں۔
اپنی تبصر کا شمارہ ٹھیک نام پڑ گیا تھا، ماسٹل

نام ”قربت ہجر میں محبتیں“ کیا بات ہے، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے، سب اس گل کے ناولٹ کو دوسری قسط میں ختم ہو جانا چاہیے تھا نہ جانے مصنف نے اس کو بلا وجہ کیوں اتنا لمبا کیا، قرۃ العین سکندر کا ”کہواک دن“ بھی پسند پر پورا اتر، مکمل ناولوں میں اعتر بن ابدال کا ”آرزوئے محبت“ بے حد پسند آیا بہت اچھی تحریر اعتر بن ابدال نے بہت اچھا لکھا شروع سے آخر تک کہانی میں دلچسپی کا عنصر رہا ہے، حمیرا نوشین ایک عرصے بعد آئیں حنا کی محفل میں ہلکی پھلکی تحریر کے بس ٹھیک ہی لگی، ان کی تحریر بھی افسانوں میں بھی ام قصی کا افسانہ ”کچھ تم بولو کچھ ہم بولیں“ بے حد پسند آیا بڑی مزے کی سنو دی تھی ام قصی پلیز اب آپ طویل تحریروں کی طرف بھی آئیں، آپ لکھ سکتی ہیں، زارا ہجر کا افسانہ ”محبت بڑھتی جائے گی“ بھی اچھی لگی، قرۃ العین رائے اور شمسہ الطاف بھی بہتر لگی، مستقل سلسلے سبھی بہترین تھے خصوصاً دستر خوان اور آپ کی محفل، کس قیامت کہ یہ نام ہے، کی کیا ہی بات ہے، فوزیہ آبی پلیز مدد مجھے تبسم، سندس جبین، فوزیہ غزل وغیرہ کو ڈھونڈ کر لائیں پلیز ہم ان کو پڑھنا چاہتے ہیں۔

رابعہ سعید اس محفل میں خوش آمدید، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ ام مریم کی تحریر جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے اس میں اتار چڑھاؤ آرہے ہیں بس آپ ذرا کہانی کو آگے بڑھنے دیں انشاء اللہ آپ کی توقع پر پوری اترے گی، سب اس گل تحریر لکھتے وقت ایک ایک چیز نیاں کا خیال رکھتی ہیں، وہ کہانی کے کسی پہلو کو سچ نہیں رہنے دیتی یہی وجہ ہے کہ آپ کو ان کی تحریر طویل لگی، بہر حال آپ کی رائے ان تک پہنچانی جارہی ہے آپ کی آواز پر سندس جبین اس ماہ تشریف لے آئی ہیں، انشاء اللہ بانی سب بھی فرصت ملتے ہی

پسند آیا، اسلامیات اور انشاء نامہ کے بعد اپنی پسندیدہ مصنفہ سدرہ کے ہاں پہنچے اور پڑھنے لگے ”اسیر عشق“، واہ کیا بات ہے اس قسط کی بہت شاندار آپی لگتا ہے کہانی اب مکملی جا رہی ہے، ام مریم کا ناول ”امید صبح و جمال“ میں بھی کہانی اب کھل رہی ہے، سب کردار بہترین ہیں آپی اس ماہ جو تحریر سب سے بہترین لگی اور اپنی طرف متوجہ کیا وہ بھی ندا حسین کا ناول ”قربت ہجر میں تعبتیں“ بہت خوب بہت خوب کیا شاندار تحریر لے کر آئیں ندا حسین، ندا حسین آپ مبارک باد کی مستحق ہیں، یقیناً آگے جل کر بھی یہ تحریر مزید دلچسپ ہونی جائے گی۔

بقیہ تحریروں میں سب اس گل نے بھی متاثر کیا، اغیرین ابدال کی تحریر بھی بہترین رہی بلکہ حمیرا نوشین کچھ خاص متاثر نہ کر سکیں، بقیہ سلسلے بھی بہترین تھے۔

فیروزہ امین خوش آمدید اس محفل میں، ستمبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔

سمارا انجم بھٹی: ڈیرہ غازی خان سے لکھتی ہیں۔

ستمبر کا حنا شکر ہے کہ وقت پر مل گیا جیسی تبصرہ

حاضر خدمت ہے، حسب معمول حنا کا ناول

بہترین تھا، اسری بیلیک المعروف حلیہ سلطان

سے سچا اس سال کا بیسٹ لگا، کیونکہ آپی میں بھی

ارطغرل فینز میں شامل ہوں، اس کے بعد فہرست

چیک کی ٹھنڈی سانس بھرتی ”کچھ باتیں ہماریاں“

میں پہنچی جہاں جنگ ستمبر کا تذکرہ تھا افواج

پاکستان کو ہمارا بھی سلام پہنچے، سیر دار طاہر محمود

صاحب کی والدہ کی بری مجھے یاد تھی دعا ہے کہ

اللہ انہیں اور سردار صاحب کو جنت الفردوس میں

اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین، حمد و نعت ہو یا

پیارے نبی کی پیاری باتیں اس کا کوئی ثانی نہیں

ہوتا شمارے میں کہانیوں میں آغاز ام مریم کی تحریر سے کیا یہ قسط مریم کے مخصوص اسٹائل میں تھی اور بہترین تھی معیز بیچارے کے حالات جو اللہ اللہ کر کے ٹھیک ہونے جا رہے تھے ایک بار پھر ڈانو ڈول ہونے کو ہیں، میری فیورٹ سدرہ جی کی ”اسیر عشق“ اپنے سحر میں گرفتار رکھے ہوئے ہے، کس قیامت کے یہ تارے میں سدرہ جی پر آپ کی رائے سو فیصد درست ہے، اب خطوں پر آ ہی گئی ہوں تو سب سے پہلے میری تحریر کچھ اس طرح کو پسند کرنے پر تمام قارئین کا شکریہ ادا کرنی ہوں، خاص طور پر اقراء الیاس کا اقراء آپ اتنی توجہ سے پڑھتی ہیں اور بھرپور تبصرہ کرتی ہے جب آپ کے افسانے شائع ہوتے تو میں بھی سب سے پہلے آپ ہی کے افسانے پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں، نوزیہ آپ کی طرح مجھے بھی تمہاری تحریروں کا انتظار ہے، بہر کیف مکمل ناول میں ”جب وہ

مہربان ہوا“ حمیرا نوشین کی تحریر پسند آئی، ناولٹ

”مجھے عشق ہے“ سب اس گل کا فی عرصہ بعد طویل

تحریر کے ساتھ نظر آ رہی ہیں، دونوں قرۃ العین

صاحبہ کی کہانیاں بہترین تھیں، افسانے تقریباً سب

ہی نے اچھے لکھے چاہے وہ ام افضل ہو یا زارا

ہنجر اسب کے پسند آئے، شمسہ الطاف کی اسٹوری

”عید کی شام“ بس گزارے لائق تھی، انشاء نامہ

غزل پر مشتمل تھا، باقی مستقل سلسلے اس مرتبہ از حد

پسند آئے چاہے وہ حنا کا دسترخوان ہو یا رنگ حنا،

یا پھر حاصل مطالعہ سب بہترین تھے اور نوزیہ آپ

آپ کے جوابات تو ہوتے ہی اپنا نیت بھرے اور

پر خلوص ہیں جیسی کس قیامت کے یہ تارے میں

خطوط لکھتی ہیں بہنیں۔

سمارا انجم بہت شکریہ آپ کی محبت کا حنا کو پسند

کرنے کا شکریہ آپ کی رائے ہمارے لئے بے

حد اہم ہے آگاہ کرنی رہا کریں شکریہ۔ ☆☆

شگفتہ شگفتہ رواں دواں

ابن انشاء



اچھی کتابیں

پڑھنے کی مادت ڈالیں

دنیا گول ہے

خمار گندم

اردو کی آخری کتاب

چلتے ہو تو چین کو چلیے

ابن بطوطہ کے تعاقب میں

آوارہ گرد کی ڈائری

بقلم خود

دغل در معقولات

نگری نگری پھر مسافر

ہر اچھے بک سٹال سے یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں

لاہور اکیڈمی

چوک اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 37310797